افسانہ نمبر

ادبِ لطیف

عصمت چغتائی

ایڈیٹرز:

نذیر احمد چوہدری

چوہدری برکت علی

کرشن چندر

مکتبہ اردو لاہور

1-4-0

دیوندر ستیارتھی

ابوالفضل صدیقی

بلونت سنگھ

علی عباس حسینی

افسانہ نمبر
۱۹۴۵ء

ادبِ لطیف لاہور

شمارہ ۱-۲

جلد ۲۲

ترتیب

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام چودھری برکت علی ایڈیٹر و پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر "ادب لطیف" سے شائع ہوا

ادارہ

اشارات

چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث افسانہ نمبر میں ایک لازمی تاخیر واقع ہوگئی۔ ہماری متواتر کوشش رہی کہ "ادب لطیف" کو جہاں ایک نمائندہ ادب پیش کرنے کا معیاری منصب حاصل رہا ہے وہاں اس کے ہیئتی وقار اور خارجی شوکت کو بھی حسب دستور برقرار رکھا جائے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ نمبر کے ٹائیٹل کو آرٹ پیپر سے مزین کیا جائے۔ چنانچہ اس اعزاز و آرائش کو قائم رکھنے کے لئے ہم نے "کاغذی مشاطہ" کی جبہ سائی کی۔ لیکن اس "فنکارہ" نے اپنا سر پُر غرور نفی میں ہلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہمارا افسانہ نمبر "نفی" کی سی صورت میں مسّی و غازہ کے بغیر ہی پیش ہو رہا ہے۔ اور ہم اب اپنے معزز قارئین کی خدمت میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست

افسانوں کی متنوع انفرادیت، مضامین کی عالمانہ جامعیت اور منظوم شہپاروں کی فنکارانہ افسانویت — یہی ہمارے نمبر کے وہ بنیادی اوصاف ہیں۔ جو اس گداگر کے کشکولِ سادہ میں زمرد و یاقوت کے مانند چمک رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں حیدرآباد دکن میں ترقی پسند مصنفین کا ایک ادبی اجتماع ہوا۔ جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ تاریخی اس لئے کہ اب ترقی پسند ادب کی تحریک ایک نئے دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ جنگ نے فاسسٹ طاقتوں کو ختم کر دیا ہے۔ اور انسانی زندگی نئے محسوسات نئی تمناؤں اور نئے ملبوسوں کے ساتھ اپنے گردوپیش کی ترمیم و ترتیب کر رہی ہے۔ سیاسیات اور معاشیات میں مسائل کی کیفیت بدل رہی ہے۔ لیکن ماحول کی اس بظاہر دلفریب تبدیلی کے باوجود دنیا کے مختلف آئینی طور طریقوں میں ایسے عناصر کی جانی پہچانی سٹرانڈیں ابھی موجود ہیں جنہیں ہم بدلے ہوئے پیراہن میں بھی آمری اقتدار کی نام لیواؤں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ — فاشی جسم کی موت مسرت خیز ہے لیکن اس کی روح اب بھی شاہیت اور سامراج کے سینے میں دھڑک رہی ہے اور کوئی بعید نہیں۔ کہ وقت کی کوئی اچانک کروٹ، اس دھڑکن کو توپ و تفنگ کے پُرشور ہنگاموں کی شکل دیدے۔ ایٹم بم کا تازہ ترین سائنسی معجزہ اس شعلے کی تشکیل میں "ہوا خواہ" کا کام دے سکتا ہے اور زندگی دکھ درد کی نئی زنجیروں میں گرفتار ہو سکتی ہے۔

اس نازک ترین موڑ پر۔ ادبی نمائندوں پر امن آشتی، حصولِ مسرت، ارتقائے حیات، طبقاتی روایات، معاشی تکالیف اور اسی نوع کے اہم انسانی مسائل کی طے شدہ ترجمانی کا اہم فرض عائد ہوتا ہے، اور اس سے پیشتر کہ یہ جوالا پھوٹ نکلے انہیں انسان کے ذہنی دھارے میں توازن اور ہمواری پیدا کرنا پڑیگی۔ عوامی ذہن میں جس زندگی بخش انقلاب کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے۔ اُسے پروان چڑھانے کے لئے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کو اپنی تخلیقی قوتیں پُوری شدت سے بروئے کار لانا پڑیں گی۔ شعوری بیداری کا ادھورا پن خطرناک ہے۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی ہم زندگی سے چمٹی ہوئی آمری روح کو کچل سکیں گے۔ جو بدلے ہوئے بھیس میں آج بھی موجود ہے۔

ہمارے اشاعتی ادارے مکتبہ اُردو نے سال رواں میں جو ادبی علمی اور سیاسی لٹریچر پیش کیا۔ وہ اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے اہلِ ذوق طبقہ میں بنظرِ استحسان دیکھا گیا۔ کاغذی اور طباعتی الجھنوں کے باعث ہم اپنے طے شدہ پروگرام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ پھر بھی ہمیں مسرت اور یقین ہے کہ جو کچھ بھی پیش کیا گیا وہ ایک مقامِ خاص کا مالک ہے — سنہ ۱۹۴۵ء کے خاتمے سے پیشتر ہم مندرجہ ذیل نئی کتابیں ملک کے سامنے پیش کر دیں گے۔

شعلۂ ساز۔ فراق گورکھپوری کی غزلوں کا مجموعہ
ایک بات۔ عصمت چغتائی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ
ٹیڑھی لکیر۔ عصمت چغتائی کا ناول
درپن۔ شکیلہ اختر کے تازہ افسانوں کا مجموعہ
جدید ادب نمبر۔ دھرم پرکاش آنند کے تازہ افسانے۔

ان داتا۔ کرشن چندر کے طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ اسمیں کرشن چندر کا لافانی افسانہ "ان داتا" بھی شامل ہے۔
بھرے بازار میں۔ حیات اللہ انصاری کے افسانے۔
تلخیاں۔ ساحر لدھیانوی کا مجموعۂ کلام۔

میلہ گھومنی۔ علی عباس حسینی کے جدید افسانوں کا مجموعہ
بادۂ مشرق۔ ساغر نظامی کی نظموں کا مجموعہ دوسرا ایڈیشن بہ ترمیم و اضافہ
ہائے اللہ۔ ہاجرہ مسرور کے افسانے
پرتو۔ جاں نثار اختر کی تازہ ترین انقلابی اور رومانی نظمیں

کرشن چندر

"آنند" کی کہانیاں

جس طرح ہر افسانے کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔ اُسی طرح کسی ایک مصنف کے تمام افسانوں میں بالعموم ایک ہی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہاں رنگ سے میری مراد طرزِ انشا نہیں بلکہ خالص مادی رنگ سے ہے۔ ایسا رنگ جو آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی کے افسانے پڑھ کر میرے ذہن میں ہمیشہ سبز رنگ کا تصور غالب آجاتا ہے۔ کہ اُس کے افسانوں میں وہی سرسبزی اور شادابی ہے اور اس کی شاعری کے پسِ پردہ بھی وہی سبز حریری پردے سرسراتے رہتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک کے افسانے پڑھ کر زردی مائل مٹیالے رنگ کا خیال آتا ہے اور منٹو کے افسانے اپنے رنگ میں قطعاً بھورے ہیں۔ سرخی مائل بھورے۔ ایسا رنگ جو گندے خون سے متشابہ ہو۔ اور یہ ہے بھی سچ کیونکہ منٹو ہمیشہ گندے سماج کی فصد کھولنے پر تیار رہتا ہے عصمت کے افسانے اُودی اُودی گھٹائیں ہیں، جن میں اکثر تبسم کی بجلیاں جھلکتی ہیں۔ اور شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایک رنگ میں کئی رنگ مگر سب شوخ چنچل، البیلے رنگ۔ سرخا سرخ۔ نارنجی۔ یاقوتی۔ زعفرانی۔ اسی طرح دھرم پرکاش آنند کے افسانوں کا مطالعہ میرے ذہن پر جس رنگ کو مسلط کرتا ہے۔ وہ اک عجیب اداس سا رنگ ہے۔ نہ بھورا۔ نہ مٹیالا۔ بلکہ کچھ کچھ نیلاہٹ لئے ہوئے ان دونوں کے بیچ کا رنگ ہے۔ گرے کلر۔ ہاں گرے کلر سے ملتا جلتا رنگ۔ ایسا رنگ جو تپتی ہوئی گرمیوں کی گھٹی گھٹی شاموں میں مغربی اُفق پر نظر آتا ہے۔ دھرم پرکاش آنند نے اپنے افسانوں میں مسکراہٹیں بھی بھری ہیں۔ شوخی اور طنز سے بھی کام لیا ہے۔ زندگی کی خوشیوں اور اُس کی تابناک سچائیوں اور اُنکے بنیادی حسن کو بھی آشکار کیا ہے اس کے افسانوں میں خوبصورت عورتیں گلگشت کرتی ہیں۔ توانا صحتمند مرد ہنستے نظر آتے ہیں۔ انتھاہ سمندر کا نیلا پانی لہریں لیتا ہے۔ یہاں کلب ہے ڈانس ہے۔ موٹر کار ہے ٹیلی فون ہے۔ روپے کی جھنکار ہے۔ لیکن ـــــ ان تمام چیزوں کے باوجود دھرم پرکاش آنند کے مرقعوں کے پس منظر میں گرے کلر ہی کار فرما نظر آتا ہے۔ اور مصنف نے اس رنگ کے بُرش کو اس شدید انہماک کے ساتھ پھیرا ہے۔ گویا اپنی حسرتوں کا خون اس میں بھر دیا ہے۔ قاری کا ذہن طنز۔ مزاح۔ تبسم۔ شوخی۔ چمک۔ پالش ہر طرزِ انشا کی مختلف جھلکیاں دیکھتا ہے اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے لیکن ہر ورق اُلٹنے کے بعد ذہن کی ہر کروٹ پر گویا وہی گرے کلر کا وارنش گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اور اک گرانبار افسردگی کا بوجھل غبار رُوح پر چھا جاتا ہے۔ اور قاری جب افسانہ ختم کر چکتا ہے۔ اور کتاب کا آخری ورق پلٹ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے، تب بھی یہی گرے کلر اُس کے ذہن کی پرچھائیوں پر طاری و ساری رہتا ہے یہ مخصوص رنگ، یہ مخصوص فضا دھرم پرکاش آنند کے افسانوں کا طغرائے امتیاز ہے!

لیکن یہ رنگ کیوں ہے! اگر مجھے اپنے ذاتی تاثرات کو بیان کرنا مقصود ہوتا۔ تو میں کہتا۔ کہ یہ گرے کلر خود آنند کی روح کا پس منظر ہے۔ یہ اداس تبسم خود اس کے لبوں کا ہے، یہ محزون چمک جو اس کے افسانوں میں بارہا نظر آتی ہے خود اس کی آنکھوں کی ہے۔ یہ سچ بھی ہے۔ لیکن یہ پوری سچائی نہیں، دیگر فہمیدہ ادیبوں کی طرح جن میں سماجی شعور اور سماجی قدروں سے عہدہ برا ہونے کا احساس غالب ہے۔ دھرم پرکاش آنند بھی اپنی انا، اپنی شخصیت، اپنے ذاتی ماحول کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے افسانے کو اتنی وسعت بخش دیتا ہے۔ کہ وہ افسانہ محض اک شخصی واردات ہو کر نہیں رہ جاتا۔ بلکہ اس کے تاثر کا دائرہ اور اُس کے اظہار کا پھیلاؤ اک پورے سماجی طبقے کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور اُس کے بیان کی شدت اور اس کے مرکزی خیالات کا رجحان اُس سوسائٹی کی غمازی کرتا نظر آتا ہے کہ جس کے ایک کونے میں دھرم پرکاش آنند خود کھڑا ہے۔ باہر نکلنا چاہتا ہے۔ لیکن ابھی تک اُس کے قدم وہیں ہیں۔ ڈگمگا رہے ہیں لیکن وہیں کے وہیں ہیں۔ اُونچے متوسط طبقے کا نوجوان ابھی تک اپنے ریشمیں خول میں کلبلا رہا ہے۔ یہ بھی

ایک شخصی حقیقت نہیں ایک اجتماعی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اُونچے متوسط طبقے میں درمیانے متوسط طبقے اور نچلے متوسط طبقے سے زیادہ مادّی، اور ذہنی اور جنسی آسودگی پائی جاتی ہے، اسی لئے تو یہاں کی مخصوص فضا کا رنگ زیادہ لطیف ہے یعنی گرے ہے۔ بھُورا یا مٹیالا نہیں، یہاں سماجی اقدار اتنی سخت اور غیر لچکدار نہیں ہوتیں۔ جتنی نچلے درمیانے طبقے کی، یہاں مرد اور عورتیں گھل مل کر بیٹھتے ہیں۔ کلبوں میں ڈانس ہوتے ہیں۔ شراب، کباب کے دَور چلتے ہیں۔ اور سمندر کے کنارے پکنک کا اہتمام ہوتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اس طریقے میں اس کے سوا اور کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ غمِ روزگار کی بھی وہ شدت نہیں ہوتی اور اس لئے وہ کشمکش نہیں ہوتی۔ جو نچلے اور درمیانے طبقے میں پائی جاتی ہے۔ اور اس لئے اُن کی زندگی کو اور اُن کی دنیا کو زیادہ دلچسپ بناتی ہے۔ اس لئے تھوڑے عرصے ہی کے بعد اُونچے متوسط طبقے کی محدود دسرو فیتیں اس طبقے کے لئے بار بن جاتی ہیں۔ کلبوں میں بے رنگ، سُتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے بجائے جمائیاں نظر آتی ہیں، ناچ اک مسرت آگیں کھیل کے بجائے اک غیر دلچسپ فریضہ بن کر رہ جاتا ہے حسین سے حسین عورت بھی بدصورت یا بدطینت نظر آتی ہے کسی سماجی شعور کی غیر موجودگی میں برج اور رمّی کے کھیل انقلاب، انسانیت، ہمدردی محبت اور ترقی سے زیادہ ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ انسان کی آزادی نہیں بلکہ یہ ہے کہ وقت کس طرح گزارا جائے۔ بلکہ کس طرح اُسے جان سے مار دیا جائے اِس حالت میں جذبات مردہ ہو جاتے ہیں، اور عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ دماغ بنجر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کی ہر چیز غیر افادی، بے مطلب اور غیر دلچسپ نظر آنے لگتی ہے۔ دھرم پرکاش آنند نے اپنے افسانوں میں اُونچے متوسط طبقے کے اس کھوکھلے پن اور اس خطرناک رجعتی۔ غیر سماجی بے راہروی کی خوب خوب ترجمانی کی ہے۔ جو کام فلک پیمانے اپنے مضامین سے لیا ہے۔ وہی کام دھرم پرکاش آنند اپنے افسانوں سے لیتا ہے۔ دونوں پرلے درجے کے سنکی ہیں۔ Cynicism کے حامل اور پیروکار۔ اور یہ ذہنی کیفیت کسی ایسے حسّاس ادیب سے بعید نہیں۔ جو اونچے متوسط طبقے میں پرورش پائے اور انقلابی قدروں کا شعور رکھتے ہوئے اُن میں یقین نہ کرے۔ دھرم پرکاش آنند کے افسانوں کا ہیرو بالعموم اس طبقے کا حسّاس مرد ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے بہت سوچتا ہے۔ بے عملی، جمود، عدم تیقّن اس مثلث کے ڈانڈے ہیں۔ اور وہ نوجوان ان میں محصور ہے۔ اور کہیں باہر نہیں نکل سکتا سب کچھ جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے بھی محصور رہنا پسند کرتا ہے۔ جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور خشک، بے عمل، غیر دلچسپ۔ غیر افادی محفلیت باقی رہتی ہے۔ جو زندگی کی ہر سچائی کو ایک ٹیڑھی لکیر پر چلتا ہوا دیکھتی ہے۔ اور ایک تنومند، حسّاس نوجوان کو نامرد بنا دیتی ہے۔ "جدید سے جدید تر" "چرچ گیٹ سے چوپاٹی تک" "ایک خط" اور "دو آنے" کا نوجوان اسی ذہنی جسمانی، نفسیاتی نامردی کا شکار ہے۔ یہ نامردی جو آج ہمارے اُونچے متوسط طبقے کے ہر شعبے پر چھائی ہوئی ہے۔ اُسے عضوِ معطّل بنا رہی ہے۔ اور نئی دنیا میں اُس کی بقا اور زندگی کی ساری راہیں مسدود کر رہی ہے میرا خیال ہے کہ دھرم پرکاش آنند کو اس کا احساس ہے، لیکن وہ اپنے فن میں اس قدر محتاط ہے۔ کہ اپنے افسانوں میں کہیں بھی اس امر کے غیر داخلی اظہار کا موقع نہیں دیتا۔ ہاں تجزیئے کی دیانت، سچائی اور شدّت سے آپ اس امر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کبھی کبھی مَیں سوچتا ہُوں اور یہ سوچ کر اکثر غصّے میں بھی آ جاتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ دھرم پرکاش آنند نے اپنے فن کے اظہار کے لئے اس طبقے کو کیوں چُنا؟ اور پھر اس طبقے کے بے عمل نوجوان کو، جو سب کچھ کرنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرتا ہے۔ کیوں اس طبقے کا ہر فرد اُس "لنجی رامی" کی طرح ہے جو آنند ہی کے ایک افسانے کی ہیروئن ہے جو اپنی اندھیری کوٹھڑی میں رہتے ہُوئے ریل گاڑی کی آواز سُنتی ہے اور دل مسوس کر رہ جاتی ہے کیونکہ وہ خود حرکت نہیں کر سکتی، جو نیلے آسمان میں ابابیلوں کو پر پھیلائے ہوئے تیرتے ہوئے دیکھتی ہے اور جادو چکی کے پتھریلے پاٹوں پر اپنا سر ٹپک دیتی ہے۔ مایوسی اور غصّے میں ــــ آنند کے افسانوں کے افراد رامی کی طرح لُنجے اور لنگڑے ہیں۔ وہ احساسِ زندگی رکھتے ہوئے بھی مُردہ ہیں، اور اپنے ماحول کے حصار میں محبوس ہیں جہاں اندھیر اور تاریکی ہے اور آنے والی موت ہے ایک روز یہ لوگ بھی رامی کی طرح گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے اور ان کے طبقے کی جڑیں سُوکھ کر ٹھنٹھ رہ جائیں گی۔ وہ دن بہت دُور نہیں اور جب وہ دن آئیگا اور آنے والا مؤرخ اس زمانے کے ادب میں اس کی وجہ جواز تلاش کریگا۔ تو تاریخ دھرم پرکاش آنند کے افسانوں کی طرف اشارہ کریگی۔ کہ جن میں اس سحر کار نقاش نے اپنے معجز نما قلم سے گہرے رنگ میں ایسے ایسے نازک گل بوٹے اُبھارے ہیں کہ اک پورے طبقے کی زندگی اور موت اپنی تمام تر رعنائیوں اور افسردگیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی ہے۔

عصمت چغتائی

حسین بی

(ناول ٹیڑھی لکیر کا ایک باب)

انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آ گئی۔ دو چار جلسوں کی صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصہ لیا۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاتا تو اس کا حصہ بس نام کا تھا۔ عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لئے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے۔ ریزولیوشن تجویز کرتے اور تمام کاغذات تیار کرتے اور یہ وہاں جا کر کٹھ پتلیوں کی طرح بتائی ہوئی لکیروں پر چلنے کی کوشش کرتیں، وہ بھی ایسے ڈگمگائے ہوئے قدموں سے کہ عین وقت پر مددگار کو آ کر پنسل اور کھویا ہوا اشد ضروری پرچہ مہیا کرنا پڑتا۔ یہ عورت ذات بھی کس قدر ذمہ دار جنس ہے۔ وہ لکچر دینے کا وعدہ کر کے بالکل بھول جاتی۔ عین وقت پر لوگ اُسے بلانے بھاگتے اور یاد آتا کہ جو اسپیچ اُسے تیار کرنے کو دی گئی تھی۔ اس کا سرسری طور پر بھی مطالعہ نہیں کیا۔

"کیا بتاؤں! بالکل بھول گئی" بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے بعد مسکرا کر کہہ دیتی۔ یہ اُس کا صنفی حق تھا۔ جس کا استعمال نہ کرنا حماقت تھی۔ کتنا ہی ضروری مرحلہ ہو۔ ان کا رویہ نہیں بدلے گا۔ بس یہ سمجھیں گی باوا جی کا گھر ہے مزے سے بیٹھی ہیں! کھانا دیر میں پھیکا سیٹھا پکے باورچی کا قصور، گھر میلا ہو نوکروں کا قصور، کپڑے گندے ہوں دھوبی کا قصور۔ کسی بات میں بھی تو اُن کا اپنا قصور نہیں۔ رنڈی بن جائیں سماج کا قصور، آوارہ مردوں کا قصور دھوکہ کھا جائیں نسوانیت اور بھول پن کا قصور، لُٹ جائیں چوری چلی جائیں بھگا لے جائی جائیں لونڈی بنا کر بیچ دی جائیں سب ظالموں کا قصور!

کئی اصحاب نے اس کے نام سے مضامین اور نظمیں لکھ کر چھپوائیں۔ کتابیں چھپوانے پر تیار ہو گئے۔ مگر اس خشک تحفہ کی طرف اُس نے اتنی بھی توجہ نہ دی۔ جتنی چاندی کے بندے پا کر ہوتی۔ نئے زمانے کی نئی الجھنوں نے لوگوں کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے سوائے حساس دلوں اور بےچین دماغوں کے۔ پہلے لوگ ساڑھیاں بندے جھومر ٹیکہ تحفہ میں دیا کرتے تھے۔ اب اشعار مضامین اور افسانے حاضر ہیں۔ دولت سے مطلب، سودا پٹانے کے لئے کچھ تو چاہیئے۔ کبھی ان سب پر ترس آ جاتا۔ وہ بھی تو انسان تھے، جوان تھے، خواب دیکھنا جانتے تھے۔ قصور یہ تھا کہ بٹوارہ کے وقت اُن کے حصہ میں احساس زیادہ اور دستیں کم پڑی تھیں۔ اگر امیر پیسے کے زور سے دس عورتیں رکھ سکتا ہے۔ تو قلم والا قلم کو کیوں زنگ لگائے۔ قلم بھی تو ویسے شمشیر کا توام بھائی ہے۔ وہ کیوں نہ ملک گیری کرے؟

چھٹی کا دن تھا اور فرصت تھی۔ ویسے ہیڈ مسٹرس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں اُس میں تو تھانہ داری کا مادہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ چار اُستانیوں سے گھما پھرا کر آٹھ کا کام لے سکے تو وہ صحیح معنوں میں محکمہ تعلیم کی بہی خواہ ہے۔ مختلف تیوریاں چپکا کر اُتو بنا کر زیادہ سے زیادہ بیگار لینا وقت مقررہ کے بعد بھی کام کرانا اور پھر بھی استانیوں میں انتہائی درجہ کا احساس کمتری پیدا کر دینا ایسے کہ اُنہیں اپنے دماغ اور قوت متخیلہ پر بھی بھروسہ نہ رہے اور بالکل ہی بیس کر رہ جائیں۔ مگر اُف نہ کریں۔ سارے الزامات اُن کے سر تھوپنا اور سرخروئی اپنے لئے رکھ لینا۔ بدانتظامی جنگلی لڑکیوں اور نالائق استانیوں کے حصہ میں قبرستان جیسی خاموشی اور سرکس کے جانوروں جیسی سدھائی ہوئی طالبات ہیڈ مسٹرس کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ!

چپراسی نے آ کر اطلاع دی کہ کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔ کہلوایا نہیں مل سکتی۔ ان عورتوں کی آمد بھی کئی قسم کی آفتیں لاتی ہے کہیں دشمن کی جاسوس تو نہیں کہ جا کر لگائی بجھائی کر دیں۔ کسی لڑکی کی ماں یا بہن ہوئی یا تو فیس معاف کروائے گی یا زبردستی درجہ چڑھانے کو کہے گی۔ نہ جانے یہ جاہل مائیں درجوں کو بانس کی سیڑھیاں کیوں سمجھتی ہیں جنہیں پار کرانا ہیڈ مسٹرس کا کام ہے۔ جہاں سالانہ امتحان شروع ہوئے اور کمزور اور بدشوق لڑکیوں کی ماؤں کو ہیڈ مسٹرس کی محبت چرائی۔ مٹھائیاں چلی آ رہی ہیں تحفے نازل ہو رہے ہیں۔ ہاتھ پیر جوڑے جا رہے ہیں اگر نہیں مانتیں تو دھمکیاں اور گالیاں بھی موجود ہیں۔

چپراسی نے آ کر کہا کہ عجیب ٹیڑھے قسم کی عورت ہے۔ نہیں مانتی ساتھ ساتھ وہ خود ہی آ گئی۔ مجبوراً ملنا پڑا۔ برقعہ اُتار کر گھر کی طرح ہو بیٹھی۔

"آپ مس گپتا ہیں ؟" چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"نہیں !"

"نہیں تو شاید مسز نورانی !"

"جی نہیں !" ذرا سختی سے کہا گیا۔

"کامنی دیوی ؟"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ... میں ....."

"تو آپ یقیناً زہرہ ہوں گی ..... کیوں ؟"

"جی ..... نہیں ۔ ! مطلب کیا ہے آپ کا ؟" جل کر کہا۔

"یا اللہ تو پھر آپ کون ہیں ؟"

"آپ کی بلا سے آپ کو کچھ کہنا ہو تو ...."

"اری بہنو کہنا تو بہتیرا ہے پر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سی ہو ......
چہ ...... اچھا ..... آپ ..... اوں ۔ وہ ...... وہی .....
ارے وہ کیا بھلا سا نام ہے اللہ مارا ..... چہ ہاں تسنیم ... تسنیم
..... خدا کی مار اس یاد پر !"

"جی نہیں ۔ میں نے کہا نا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ....."

"نہیں جی ۔ ایسی بھی کیا غلط فہمی ۔ اس حلقہ میں تو ..... یہی نام ہیں ۔ اچھا جانے دو ۔ یہ بتاؤ کوئی سن تو نہیں رہا ہے ؟"

"جی نہیں ۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے اور براہ کرم تشریف لے جائیے ۔"

"ہاں ہاں گھبراؤ مت تشریف بھی لے ہی جاؤں گی مگر ... خیر جو کچھ بھی ہو تمہارا نام خاک پڑے ۔ مجھے کیا، تم اُسے تو جانتی ہو گی ۔ افتخار احمد کو"

"این ؟" تسنیم سمجھ گئی سی ۔ آئی ۔ ڈی سے پالا پڑا مگر وہ بچہ نہ تھی ۔

"مکر نا مت ، تمہیں قرآن پاک کی قسم .... پاک پنجتن کا واسطہ ...
دیکھو بہن خدا کو بھی منہ دکھانا ہے ..... اپنے پیاروں کی قسم !"

"کیا مطلب ہے تمہارا ..... فوراً چلی جاؤ ورنہ ....."

"بیوی مجھے ان گیدڑ بھبکیوں سے تو دھمکاؤ مت ۔ تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے ۔ اور بھگتا بھی ہے جو ان جلے نصیبوں میں لکھا تھا پھر کیا فائدہ ۔ تو یہ بتاؤ اس نے تمہیں ماں بنایا تھا یا بہن یا معشوقہ !"

"تم دیوانی معلوم ہوتی ہو ..... جاتی ہو کہ پھر ......"

"اندازہ سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ ... کہ .... بہن خوبصورت نہیں پر ہاں غنیمت ہو۔"

"تم نہیں جاؤ گی ؟"

"جاؤں گی کیوں نہیں پر اپنی کہہ کر اور تمہاری سن کر ..... تو میرے خیال میں معشوقہ ہی ہو گی ..... ڈھنگ بھی بتاتے ہیں ۔ اللہ رکھے شرم آ گئی !" وہ طنز سے مسکرائی ۔

"تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ ؟"

"کچھ بھی نہیں مجھ اُجڑی کو کیا واسطہ ہوتا .... بس یہی کہ میں اس بدذات کی بیوی ہوں ۔"

"تم ..... تم !"

"ہاں میں ۔ یقین نہ آئے تو لو یہ سرٹیفکیٹ دیکھ لو .... میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گی جھوٹ ، تو لو یہ ..... حسین بی ۔ زوجہ افتخار احمد ...
قوم شیخ ...."

"تم کیا چاہتی ہو ؟" آنکھیں جھک گئیں ۔

"یوں کہو .... ہاں تو بن بیاہی ہو یا ماشاء اللہ ...."

"تم اپنی کہو .... کیا کہنا ہے ۔"

"تو ماشاء اللہ کنواری ہو ، منہ سے تو یہی لگتا ہے ، عیب کا حال اللہ جانے ۔ آج کل کنواری بیاہی میں اللہ مارا فرق ہی کیا رہ گیا ہے ..."

"بکواس بند کر کے اپنا مطلب بیان کرو !"

"تو بہن مطلب یہ کہ تمہیں اس کیڑوں بھرے کباب میں کیا دکھائی دیا جو ریجھ گئیں ۔ بُرا نہ ماننا اگر منہ سے کوئی بات نکل جائے تو ، چودہ برس کی عمر سے تو میں اُسے بھگت رہی ہوں ۔ ایک گھڑی بھی سکھ چین کی گذری ہو تو بارہ اماموں کی مار ..... دیدار نصیب نہ ہو ۔ تین بچے ہیں .....
تیرے میرے گھر اتنی عمر گذاری ..... باپ کے حقے بھرے بھتیجوں کے گو موت کئے ۔ بھاوجوں کی پھٹکاریں سہیں ۔ اللہ نے جیسا کچھ بھی ڈالا بھگتا
.... پر آپ بہنو میری ....." تسنیم کے ہاتھ پیر پھول گئے ۔
اس کی ہچکیوں نے آئے حواس غائب کر دیئے !

"میں ہار گئی ، پر تم ماشاء اللہ پڑھی لکھیاں ، اُسے بھگت رہی ہو ۔ تمہارا اس میں قصور نہیں ، وہ ہے ہی ایسا خدا کی پھٹکار اس پر ۔ صورت نہ

افسانہ نمبر

شکل اللہ جانے یہ عورتیں اُس پر کیوں لٹو ہوئی جاتی ہیں۔ اے اور تو اور بوڑھی بوڑھی ڈینڈو۔۔۔ کوئی بیٹا بنا کر کلیجے سے لگائے لیتی ہے۔ کسی کا ویرن بنا ہوا ہے۔ سنتی ہوں کہیں نکاح بھی کر رہا تھا۔"

"تم یہ کس افتخار کا ذکر کر رہی ہو؟"

"ایسا دیوانہ نہ سمجھو، میں خوب سمجھتی ہوں، کالج میں پڑھتا تھا تمہارے سنگ ..... شمشاد ہے نا تمہارا نام ..... خوب یاد آیا .... فوٹو بھی ہے اس کے پاس اور .... تم جھوٹ نہ سمجھو میں پکا ثبوت دے دوں گی۔ پہلے سن لو۔ یہ جو نواب ..... ہیں نا ان کی بیوی کا بھائی بنا ہوا ہے۔ اور میں ننھی نادان نہیں کہ ان بہنوں اور اماؤں کے چہل بٹے نہ پہچانوں، اللہ ماریاں اماں بہنیا کے رشتے کو شرماتی ہیں۔ ارے کام کرو تو کھلے بندوں کر دکھا جائیں ....."

"خیر۔۔۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"یہ بتایئے آپ اُسے روپیہ دیتی رہی ہیں؟"

"نہیں!"

"جھوٹ نہ بولو۔۔۔ میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں جن میں حوالے دیئے گئے ہیں۔ یہی نہیں بہن معاف کرنا آپ نے اُس کے لئے بیٹھ کر سویٹر بُنے ہیں۔ ہاتھ جلا جلا کر حلوے تیار کئے ہیں .... اور ...."

"میرے خط .... دکھا سکتی ہو ....."

"مجھے پہچان تو نہیں مگر آپ کے شہر کی مہر سے شاید ......" وہ مداری کی طرح تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ اور خطوں کے بنڈل نکال کر گود میں رکھ لئے ....

"میں .... آپ چھیننے کی کوشش نہ کرنا ....." اُس نے بے اعتباری سے ایک طرف مڑ کر کہا۔ اور شمن شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ کیونکہ ایک ثانیہ کو اُس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیوں نہ جھپٹا مار کر ظالم سے اپنی بیوقوفیاں چھین لے اور .....

"یہ .... نیلے لفافوں میں .... آپ خود دیکھ لیجئے۔" شمن نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ لے لیا۔ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی حقیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔

"خاطر جمع رکھو .... میں نے کوئی خط نہیں پڑھا۔ میرے بھیجے میں کہاں اتنا بوتہ کہ چھیلے کے محبت نامے پڑھوں۔ اور بنو شروع شروع میں چرائے بھی پڑھے بھی جلائے بھی۔ پر اب تو سب چیزوں پر خاک ڈال دی۔ ...... اسے لکھنے والیاں نہ تھکیں پر میں تو ہار گئی۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" شمن نے بھیگی بلی کی سی میاؤں کی۔

"اری بھینا میں کیا چاہوں گی تم خود سوچ لو۔" پلنگ پر پالتی مار کر کہا۔ "یہ دیکھو کہ نکھٹو کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہے اور مجھ دکھیاری کو لوگ گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ "چلو چلو مٹی کٹی بھیک مانگ رہی ہو"۔ تو بھئی جیسے ہمیں شوق ہی تو ہے در در ٹھوکریں کھانے کا۔ لوگوں کے آگے ہاتھ پسارنے کا، کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا سسر کی آنکھیں پٹم ہو گئی تھیں، نگوڑی کوڑی کوڑی پھونک دی۔ اور یہ کنگال بیٹا میکے میں پیخ خود نکل کھڑا ہوا۔ ویسے بچے دلانے برس کے برس پہنچ جائے۔ ابھی گئے مہینے تمہارے پاس آیا تھا رات گئے میں نے اسٹیشن پر پکڑا اور وہ ویٹنگ روم میں سے ہوا ہو گیا۔ پر میں بھلا چھوڑنے والی تھی۔ پھاٹک کے پاس چھپ گئی۔ جیسے ہی باہر نکلا میں ساتھ چلی کہ پتہ تو لگاؤں اس کے ٹھکانوں کا جب وہ تمہاری کھڑکی میں کودا تو میں سنگ تھی۔ وہ تو میں اسی وقت آجاتی پر فائدہ کیا تھا۔ دوسرے سنا ہے یار کے ساتھ مل کے عورتیں کام تمام کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ وہ تو خاک بچاتا مجھے۔ اُس کا بس نہیں جو گلا گھونٹ دے خود۔ مگر بہن جب تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا۔ پر اب معلوم ہوا۔ اگر اندازہ غلط نہیں تو شریف گھرانے کی بیٹی معلوم ہوتی ہو۔ آنکھوں میں شرم ہے۔"

شمن کا جی چاہا کاش وہ اندھی ہوتی اور کان بھی پھوٹے ہوئے ہوتے!

"تم کیا جانو اُس کے کتنے سلسلے چلتے ہیں۔ زمانے بھر کی عورتوں نے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ حکومت کو الگ تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ یہ جو بھاگ گیا تھا یہ بھی کوئی چال تھی۔ میں تو خوش ہو گئی تھی کہ اللہ مارا اب تو مرے گا۔ بلا سے رانڈ ہو جاؤں تو خیر خیرات کی تو حقدار ہو جاؤں۔ بچوں کا پیٹ تو پلے۔"

"آپ فرمایئے بھی کچھ ......" شمن نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

"یا اللہ اتنا جو فرمایا تو کچھ بھی نہیں۔ ماشاءاللہ سے اتنے

ماں باپ کو بھرا تھوڑا بہت بچوں کا حق بھی سمجھ لو۔ اگر نہیں، تو تمہاری مرضی، تم سے مل لی۔ جی خوش ہو گیا۔ شریف ہو شرافت کو ہاتھ سے نہ دو گی۔ یہ نہیں کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیوی کی طرح کر لگیں غرّے ڈبّے دکھانے۔ میں نے کہا ہوش میں رہ کر بات کرو بیگم، کس بھلاوے میں ہو۔ ہائے مردوں سے آنکھ لگاتے شرم نہیں آتی، اپنا چھ ہاتھ کا اچھا بھلا چھوڑ کر اس قبر بجو پر جی دے بیٹھیں۔ پھر اوپر سے اینٹھو تو بندی بھی ایسی ویسی نہیں صاف کہہ دیا۔ کہ خطوں کا بنڈل جاتا ہے سپرنٹنڈنٹ کے پاس کہ میاں دوسروں کے ہتکڑیاں جکڑواتے پھرتے ہو، گھر میں کیا مزے سے خود اپنی عزت پر ڈاکہ ڈلوا رہے ہو۔ آستین میں سانپ پال رہے ہو۔ بس۔ نکل گئی ساری ہیکڑی چپٹ ہاتھ کے کڑے اُتار کے دینے لگیں۔ میں نے کہا بوبی ایسی کچی گولیاں کسی اور کو نگلوانا، اتو نہیں ہوں ایسا بھی کیا کڑے لے جاؤں جو کل کو خصم سے کہہ کر جیل میں دھروا دو تو کیسی ہو ——— ذرا پانی منگوا دو ..... خدا کی پھٹکار حلق بھی تو سوکھ گیا۔" شمن نے پانی انڈیل کر برف ڈالی اور پیش کیا۔

"جگ جگ جیو بہن، دکھیاری کی خاطر داری کا اجر ملے گا۔"

"یہ میری بنک کی کتاب ہے۔ یہ بندے اور چوڑیاں .... اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کو نظر آ رہا ہے ...... آپ کو جو کچھ چاہیئے لے جایئے۔"

دیر تک حسین بی بیٹھی کتاب کے ورق اُلٹا کیں۔

"کچھ تم نے جمع ہی نہیں کیا۔"

"جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔"

"ہوں" وہ سوچنے لگی۔ "مگر میں تو کل جا رہی ہوں۔"

آج تو چھٹی کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔" شمن نے سوکھی آواز سے کہا۔

"یہ بندے تو اچھی وضع کے ہیں، پہن لو کان بوچے لگتے ہیں، چوڑیاں دلّی کی بنی معلوم ہوتی ہیں، کیوں؟"

"ہاں۔" شمن نے جبراً کہا۔

"اچھی ہیں قدسیہ کے لئے ایسی ہی بنواؤں گی۔ بن باپ کی بچی ہے پر دیکھ لینا جو کچھ بھی کمی رہ جائے۔ اُسے تو وہ خدائی خوار بھی چاہے ہے۔ پارسال سو روپے دے گیا تھا۔ دے کیا جاتا میں نے اینٹھ لئے۔ وہ زندگی اجیرن کی کہ اگلنا ہی پڑے۔ دو سویٹر بھی دیئے تھے کہ ادھیڑ کر بچوں کے بنا لے۔ تو میں نے منّے اور اسلم کے لئے بنا دیئے اتنا سا اُون بچ گیا۔ خدا کی سنوار اِن عورتوں پر کیا دریا دلی سے اس بدنصیب کے لئے بُنتی ہیں۔ اُون بھی تو مہنگا ہے۔

شمن خاموش سنتی رہی۔

"اچھا بہن تو میں چلی ...... یہ لو اپنے خط پتر گن لو سنبھال کر۔"

"اور روپیہ!"

"اب جانے بھی دو روپے، میرے آگے بھی کنواری بیٹھی ہے، بیری کی طرح بڑھ رہی ہے۔ بیوی دنیا نہیں دیکھی تم نے، ایسا ہی ہے تو، کچھ اُوپر پڑا ہو تو دے دو۔" شمن نے بٹوہ جھاڑ کر ایک سو چالیس روپے گنا دیئے۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم بھی بیاہ کر ڈالو تو۔ باپ دادا کا نام اچھا لئے سے کیا فائدہ، یہ منہ پہ مہاسے نکل رہے ہیں، سرسوں دودھ میں گھس کر لگاؤ۔ اللہ نے چاہا چٹی کھال نکل آئے گی .... تو میں چلی۔"

دروازہ کھُلا اور وہ تیز قدم مارتی نکل گئی ....

شمن مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان بیٹھی خطوں کے لاوارث بنڈل کو تکتی رہی۔ تو یہ تھی اُس کے گلشن محبت کی عمر بھر کی کمائی!

چپراسی نے آکر بتایا کہ جلسے کی کار انتظار کر رہی ہے۔ اسے آج ایک ضروری لکچر دینا تھا۔

"کہدو نہیں ہیں!"

اور واقعی اس وقت اس کی حقیقت "نہیں" سے بھی کم ہو رہی تھی ؏

اخترؔ اورینوی

پندرہ منٹ

اُس کی آنکھیں کئی دفعہ بے اختیارانہ جھپکیں۔ اُس نے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ قدموں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ وہ فیصلہ کر لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر فیصلہ کو عملی شکل دینا دو بھر لگ رہا تھا۔ وہ کئی قدم آگے بڑھا۔ لڑکیوں کا کالج اُس کی منزلِ مقصود تھی۔ وہ اِدارہ باہمی کے محکمہ میں کلرک تھا۔ افسرِ اعلیٰ نے اُس کے سپرد آج یہ خدمت کی تھی کہ مس ڈینزی کو گھر آ کے اس کی دو بچیوں کے پڑھانے پر راضی کر آئے۔ ویسے تو وہ اپنے افسر کے لئے کوئلہ اور کراسن تیل خرید کر لا ہی دیا کرتا تھا۔ مگر مس ڈینزی کو راضی کرنا۔ یہ خیال آتے ہی اُسے پسینہ آ گیا۔ دن دہاڑے گرلز کالج کے بڑے سے پھاٹک میں داخل ہونا پڑے گا۔ بہر کیف اُسے جانا ہی تھا۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹکا۔ گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بج چکے تھے۔ اُس نے سوچا۔ ٹرین کی روانگی کا وقت پانچ بجے ہے۔ وہ مس ڈینزی سے بات نبٹا کے سیدھا اسٹیشن جائے گا۔ کلرکی! آخر وہی کلرکی! اس کا سارا پروگرام یونہی ہمیشہ ناکام ہوتا رہا۔ وہ اپنی زندگی سے اُکتایا ہوا تھا۔ کتابوں کی اشاعت کا ایک کامیاب اِدارہ چلانا۔ اُسے بامِ ترقی پر پہنچانا اور پھر پھر؟ پھر نہ جانے کیا کیا! یہی اُس کی زندگی بھر کی حسرت تھی۔ اُس نے ایک بار قطعی فیصلہ کر کے ایک ادبی پرچہ نکالا اور اس کے ساتھ بک ڈپو بھی کھولا۔ سات مہینہ کے بعد نشہ اُتر گیا۔ وہ کہتا تھا زندگی میں بہت سی ترشیاں ہیں پھر وہ پڑھائی میں لگ گیا۔ بی۔ اے۔؟ نہیں، وہ یہ کام بھی نہ کر سکا۔ بس وُہی کلرکی اور ترکِ ملازمت۔ اور پھر کلرکی اور پھر ترکِ ملازمت۔ اُکتاہٹ۔ کی حد تک وہ برسوں یہی کرتا رہا۔ اور آج بھی وہ یہی کر رہا تھا، کلرکی۔ مگر اب وہ کلرکی نہیں کرے گا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس نے اٹل فیصلہ کر لیا ہو۔ راجہ چاند پورا اُس سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ وہ اپنے محکمہ کی طرف سے گنّے کا نیا نمونہ لے کر راجہ صاحب کی زمینداری پر گیا تھا۔ اُس حلقہ کا سُپروائزر چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ افسر نے راجہ صاحب کی خوشامد میں اس غریب کلرک کو ہی گاؤں دوڑا دیا تھا۔ راجہ صاحب اپنی سُرمہ سا دُنبالہ دار بادامی آنکھوں، کرخی کلّون، چست پائجامہ کی مُہریوں سے مڑھی ہوئی پتلی پتلی پھلیوں اور تنگ سینے سے چپکی ہوئی وضع دار شیروانی کے ساتھ نہایت ہی سُتھرا ادبی مذاق رکھنے والے متوسط العمر شخص تھے۔ اُن کی صرف ہستی نہیں، باضابطہ شخصیت تھی۔ فارسی اور سنسکرت کے فاضل۔ اُردو اور ہندی کے ادیب و شاعر۔ صدہا برمحل اشعار نوکِ زبان۔ گانے بجانے سے دلچسپی اور ناٹک میں اداکاری کا دَبا دَبا شوق۔ اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے تو نہ تھے۔ مگر پرانی تہذیب کے دل دادہ اور نہایت وضع دار۔ سنیما سے سخت چڑ تھی۔ گنّے کا نمونہ تو الگ ہوا۔ فیضؔ سے ادبی یگانگت کی وجہ سے دِل مل گیا۔ خوب صحبتیں رہیں۔ تعلقات بڑھے۔ تو راجہ صاحب موصوف نے کتاب گھر کی تجویز خود پیش کی کہنے لگے۔

"بھئی فیضؔ! میں نااہل ناشروں کو اپنی اُردو اور ہندی تصنیفات نہیں دینا چاہتا۔ میں سرمایہ لگاتا ہوں۔ ناظمِ دار الاشاعت تم۔ مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں۔ میری اور دوسرے اچھے ادباء و شعراء کی کتابیں شائع کرو۔ دیکھنا خوگیر کی بھرتی کتابیں چھپنے نہ پائیں۔ میں ذرا ان جدید اہلِ قلم حضرات سے چوکنا رہتا ہوں۔ قلم کی باگ تک درست نہیں شہسواری کیا جانیں۔"

اُس روز سے فیضؔ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔ کلرکی پاؤں کی زنجیر تھی۔ وہ اُسے توڑ دینے کے دن گن رہا تھا۔ بس راجہ صاحب کو آمادہ اور بیوی کو قایل کرنے کی دیر تھی۔ وہی راجہ چاند پور آج پانچ بجے کی ٹرین سے واپس گاؤں جا رہے تھے۔ کسی جنگی کمیٹی کی

شرکت کے لئے شہر آئے تھے۔ سکرٹریٹ میں ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگے۔

"بھئی فیض! آج میں جا رہا ہوں۔ اسٹیشن پر ضرور ملنا"۔

فیض کو راجہ صاحب سے تاکیداً ملنا تھا۔ شائد اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اس کے خواب کی تعبیر پوری ہو۔ اشاعت گھر کا قیام اور پھر اور پھر........

اُس نے اپنے کو ایک لیمپ پوسٹ کے پاس کھڑا ہوا پایا۔ گھبرا کر اُس نے پھر گھڑی دیکھی۔ پونے چار۔ وہ گرلز کالج کی طرف پھر بڑھا۔ کالج قریب ہی تھا۔ لڑکیوں کے لالہ زار کے تصور سے ہی اُسے پسینہ آنے لگ گیا۔ اُس کے قدم ڈگمگا گئے۔ وہ پھر ٹھٹکا۔ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک رکشا گرلز کالج کی طرف جا رہا تھا۔ اُسے روک کر وہ اُس پر سوار ہو گیا۔ اُس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس لی۔ قدم بہ قدم لڑکیوں کے کالج کی طرف بڑھنے کے ارادہ کی اذیت سے اُسے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ جا نہیں رہا تھا۔ لے جایا جا رہا تھا۔

"کہاں حضور؟" رکشا والے نے سوال کیا۔

جواب ندارد۔ وہ مس ڈیزی کی ملاقات کے مراحل، اشاعت گھر، راجہ چاندپور، لڑکیوں کی کہکشاں اور بہت سی دھندلی دھندلی، نیم درون نیم بروں، ادھ کھلی ادھ چھپی باتوں اور چیزوں کے متعلق مبہم طور پر سوچ رہا تھا۔ پانچ منٹ میں کالج آ گیا۔ اس کے ذہن پر کچھ رنگینیاں اور کچھ مسکراہٹیں اور کچھ ولولہ انگیز شور سا آ کر سایہ ڈال گیا۔ مگر رکشا آگے بڑھ گیا۔ جب وہ سینما کے پاس پہنچا تو چونکا۔

"واپس لوٹو! میں نے کہا گرلز کالج"

"کہاں کچھ بولے تھے بابو!" رکشا مڑا۔ "اور تو بہت نگیچ تھا۔"

رکشا رکا۔ لڑکیوں کا ایک گلدستہ کالج کے پھاٹک سے نکل رہا تھا۔

"نہیں نہیں! ذرا آگے بڑھا کر دوسری طرف روکو!"

فیض میں عین 'باب فردوس' کے سامنے اُتر پڑنے کی ہمت نہ تھی۔ رُک رُک آگے بڑھایا گیا۔ مگر فیض اب بھی رکشا پر ہی بیٹھا رہا۔ اُس نے سوچا چلو یہیں بیٹھے بیٹھے ملاقاتی کارڈ لکھ دو۔ کارڈ لکھا گیا۔ گھڑی تیسری بار دیکھی گئی۔ چار بجنے کو سات منٹ۔ وہ ہمت کر کے اُترنا چاہ رہا تھا کہ ایک خیال آیا۔ نادر سا خیال۔ اُسے حیرت ہوئی کہ اب تک کیوں اُسے یہ خیال نہ آیا تھا۔ اُس نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ پر سے پسینہ پونچھا۔

"چلو پھاٹک کے اندر ہی چلو۔ دیکھو! بائیں طرف۔ چھم چھم! ٹھیک برساتی کے نیچے روکنا۔ داہنے نہیں بائیں!"

پھر لڑکیوں کا ایک غنچۂ شاداب کالج کے چمن سے ٹوٹا۔ رکشا کے اندر خوشبو اور کرنیں مختلف زاویوں سے تیر گئیں۔ فیض کی سانس رک گئی۔ جیسے تیز سرچ لائٹ اُس کی آنکھوں پر پڑ گئی ہو۔ وہ سیدھے بیٹھا ہوا کہیں دور دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ میں سواری پر اندر داخل ہو رہا ہوں۔ مگر دل میں اُس کے متضاد شرمائی شرمائی سی ایک خواہش بھی تھی جو آنکھوں کے گوشوں سے جھانک رہی تھی۔ رکی ہوئی سانس جب پھر باہر آئی تو ٹھنڈی سانس بن کر آئی۔ رکشا برساتی میں رکا۔ فیض بڑی تیزی سے اُتر پڑا۔ گھڑی دیکھی اور پکار کی برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دور کہیں حریم تعلیم کے نہاں خانوں میں گھنٹی بجی اور اُس کی مدھم آواز نے باہر آ کر فیض کے دل میں بازگشت کی سی سنسنی پیدا کر دی۔ چار بجنے کو پانچ منٹ باقی تھے۔

ایک کالی سی مگر گوارا صورت دربان لڑکی کالی سلیٹ لئے ہوئے باہر آئی۔ سلیٹ سے بندھی ہوئی اُس کی پنسل بھی جھول رہی تھی۔

"کس کو۔ چاہتا ہے۔ آپ؟" اُس نے سلیٹ فیض کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"مس ڈیزی کو!" فیض نے گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ مگر سلیٹ اس کی طرف بڑھا ہی رہا۔ وہ اور گھبرا گیا۔

"اس۔ پر۔ نام۔ لکھنا۔ ہے۔" دربان لڑکی نے ہر ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ واضح انداز میں کہا۔

نام لکھا گیا اور وہ چلی گئی۔ اب فیض سر زیر بار منتِ دربان کئے ہوئے کھڑا تھا۔ جیسے بھرے بازار میں کسی نوجوان لڑکی کو

لاکر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ پر یہاں اُلٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ کئی کلاس ختم ہو چکے تھے اور اب آخری کلاس کی گھنٹی بجنے والی تھی۔ کمروں میں لڑکیاں، گلیاریوں میں لڑکیاں، دالانوں میں لڑکیاں، دہلیزوں پر لڑکیاں، سیڑھیوں پر لڑکیاں، بارانی میں لڑکیاں، صحن میں لڑکیاں۔ غرض جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ فیضؔ کے دماغ میں تیلیاں سی اڑنے لگیں۔ کوئی شے واضح نہ تھی۔ ہر سو نیرنگِ نظر، سیلابِ کیف، محشرِ آواز، طوفانِ نکہت اور امواجِ خرام کے نقشے بنتے اور بکھرتے اور پھر نئے سے نئے تماشٔں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔

وہ حیران کھڑا تھا۔ نظر بھر کے وہ اس پکچر گیلری کی سیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں اگر کوئی اس وقت دیکھ لیتا تو صاف معلوم ہوتا کہ وہ تماشائے غیر سے زیادہ اپنا تماشہ کر رہی ہیں۔ وہ کبھی کبھی باہر دیکھ لیتی تھیں۔ زیادہ تر تو اندر ہی کی طرف جھانک رہی تھیں۔ دل کے راستے سے ماضی کی دُنیا کی طرف۔ گرلز کالج ہوسٹل پہلو میں تھا اور اس کا چمن اور سبزہ زار مرتب بھی سامنے دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ فیض کو اپنے کالج کے دن یاد آنے لگے اور پھر ہوسٹل کی زندگی۔ اور اس کے بعد بہت کچھ۔ حافظہ نے ایک دفاعی صورت پیش کر دی تھی۔ ایک سہارا۔ ورنہ وہ اسی محشرِ جلوہ میں بے ہوش ہو چکا ہوتا۔

ع
متاعِ ہوش و طاقت نذرِ تمہیدِ تجلّی ہے۔

چار کی گھنٹی ابھی بجنی باقی ہی تھی۔ فیضؔ اپنی دُنیا میں سمٹ گیا۔ ایک محفوظ ذہنی دنیا۔ جیسے کوئی لاجونتی گھونگٹ کی اوٹ میں آجائے۔ فیضؔ نے اپنے نفسی گھونگٹ کے اندر اپنے ہی سنگار کو دیکھنا شروع کیا اور گذری ہوئی باتوں سے کھیلنے لگا ——————

اُس کے دوست اُسے سیمابی کہتے تھے۔ وہ پارہ کی طرح بیکل رہتا تھا۔ اُس کے دشمن اُسے ایک آوارہ خیال ناقابلِ اعتبار شخص سمجھتے تھے اور وہ لوگ جو اُس سے کبھی کبھار ملا کرتے تھے اُسے ایک دلچسپ فرحت انگیز مشغلہ کی طرح برتتے تھے۔ پہلی ملاقات میں وہ بُھیلا شرمیلا سا مگر مرعوب نظر خاموش خاموش، گھبرایا گھبرایا بیٹھا رہتا۔ مگر دو تین ملاقاتوں میں جب وہ کسی سے گھلتا تو بلا کا اثر پیدا کر لیتا۔ وہ بہت ہی کم آمیز تھا۔ مگر جب وہ گھُل مل جاتا تو پھر وہ یہی چاہتا کہ دوئی کی سرحدیں مٹ جائیں۔ اُس کی یگانگت کے معیار پر پورا اُترنے کے لئے صبر اور تیاگ کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اکثر یہی ہوتا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ شناسا وس سے اُکتا جاتا اور شناسا اُس کے متعلق طرح طرح کی رائیں قائم کر کے الگ ہو جاتے یا یونہی رسمی تعلق سا باقی رہ جاتا۔

سولہ سال کی عمر میں وہ اچانک ادبیات کی تیز و گرم، حسّاس، جذباتی، تخیلی دُنیا میں آنکلا۔ شاید یہ اُس کی پسند نہیں، پناہ گاہ تھی۔ اُن دنوں اُس کی آنکھیں شرم کے بار سے جھکی رہتی تھیں اور اس کے لب اَن کہی باتوں کے وزن سے کانپتے رہتے تھے۔ وہ کالج ہوسٹل میں دامن کشاں کنارہ کش، گوشہ گیر، اکیلا، بیگانہ بیگانہ سا رہتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا کتابیں پڑھتا رہتا اور اپنی تنہائی کو خوبصورت بولتی ہوئی تصویریں آویزاں کر کے انجان طور پر دور کیا کرتا تھا۔ مگر ان تصویروں سے اس کی تشنگی پوری نہ ہوتی۔ وہ انہیں بدلتا رہتا تھا۔ اس کے کمرے کی سجاوٹ ہوسٹل بھر میں نمایاں تھی۔ پھر بھی اس کا دل پکارتی ہوئی ویرانی سے گونجتا رہتا۔ وہ فطرتاً میل محبت کا بھوکا تھا۔ اس کی علیحدگی میں التفات کی طلب تھی۔

وہ اپنی ماں کا چہیتا تھا۔ شہر آ کر وہ ماں سے چھوٹا تھا۔ وہ چاہتا تھا اور چاہتا رہا کہ کوئی ماں کی طرح اُس سے پیار کرے۔ اس کے سر پر اپنے دامن کا سایہ ڈالے اور اس کے ہر بات پر مچل جانے پر اور زیادہ جان چھڑکے۔ مگر ہوسٹلوں میں جیسے لوگ بھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ چھوٹتے ہی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میلوں میں نامانوس جانور سینگوں اور تھوتھنوں سے اپنی اپنی جگہ بناتے ہیں۔ ہوسٹل بھی ایک چھتر ہوتا ہے۔

وہ بیدردانہ فقرہ بازیوں سے گھبرا گیا۔ صبح سے دس بجے تک وہ اپنے کمرے میں بند ادبیات میں ڈوبا رہتا۔ افسانوی شخصیتیں اس کے گرد منڈلاتی رہتیں۔ ان میں چند ایسی بھی ہوتیں جو اُس سے پیار کرتیں یا وہ اُن سے پیار کرتا اور سمجھتا کہ وہ بھی اُس سے محبت کر رہی ہیں۔ ہوسٹل کی فضا سے بہت دور وہ چونکے ہوئے

حواس، جاگے ہوئے احساسات، اُمڈے ہوئے جذبات اور آزاد و جولاں تخیل کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہتا۔ کالج کے گھنٹوں کے بعد وہ ہوسٹل آکر مُنہ ہاتھ دھوتا کپڑے بدلتا اور اپنے ایک دور کے رشتہ دار کے یہاں چلا جاتا۔ اسٹڈی کی گھنٹی بجنے کے وقت واپس آتا اور پھر لڑکوں کی پھبتیوں فقروں اور جملہ بازیوں کے طوفان سے گذر کر اپنے کمرے کے اندر امن کی بندگاہ میں پہنچ جاتا۔

آخر شش ہوسٹل میں بھی اُس کے دو تین دوست بن ہی گئے۔ یہ سب ادب کے رسیا تھے۔ اِن دوستوں نے دو تین مہینوں کے بعد یہ محسوس کیا کہ اس کی لانبی لانبی خمار آگیں پلکیں کسی نئی شراب سے سرشار ہو رہی ہیں۔ اس کا سانولا رنگ مسکرا اُٹھا تھا۔ اُس کی تنگ پیشانی کسی خوشگوار سوچ سے جھکی جھکی سی رہنے لگی تھی۔ اس کے سیاہ گھونگھریالے بال پیشانی کے محاذ سے پیچھے کی طرف یوں اونچے اُٹھتے چلے جاتے تھے جیسے اس کے دماغ سے اُبھرنے والے پُرپیچ خیالات نے مرئی صورت اختیار کر لی ہو۔ وہ مطمئن تھا۔ بیزاری کا فور ہو گئی تھی۔ ہوسٹل کا تمسخر اس کے دامن کو چھوتا تو تھا مگر بے اثری کا داغ تمسخر کرنے والے خود کھاتے تھے۔ ان ادنیٰ باتوں کی اب اُسے کیا پروا تھی وہ تو اپنے مَن کی دولت پاکر مگن تھا۔

رضوی نے ایک روز فیض کی الماری میں رکھے ہوئے خوبصورت سے ڈبے میں سوکھا ہوا بیلے کا ہار دیکھا۔ اُسے نہایت احتیاط سے رکھا گیا تھا۔ رضوی کو پوپ کی نظم "ریپ آف دی لاک" یاد آئی۔ فیض کو بھی کُھلنا پڑا۔ یہ ہار کسی کا عزیز تحفہ تھا پہلی محبت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ فیض اس عامیانہ اظہارِ محبت کے انداز سے جھینپا۔ ہار رنگین رومال اور معطر لفافوں کی عمومیت بازارِ عشق میں رسوا ہو چکی تھی۔ فیض نے محسوس کیا کہ حمام میں اُس کے دوستوں نے اُسے ننگا دیکھ لیا ہے۔ اس عریانی پر پردہ ڈالنے کے لئے اُس نے اپنی ڈائری کے اوراق سُنانے شروع کر دیئے۔ اُس میں متفرق اشعار بھی تھے۔ اس کے اپنے کہے ہوئے اشعار۔ اُس روز اس کی محبت اور شاعری کے راز افشا ہو گئے۔

اُس گھر میں کئی لڑکیاں تھیں۔ اُس سے چھوٹی۔ اُس سے بڑی اور اُس کی ہم عمر۔ وہیں وہ روزانہ شام کو جایا کرتا تھا۔ عورتوں کی صحبت میں اُسے گھریلو فضا کی یگانگت محسوس ہوتی تھی۔ لڑکیاں اُس کی نوعمری اور نمکینی سے اپنی صحبتوں کو بامزہ بنا لیتی تھیں۔ فیض کا بھولاپن۔ اُس کا کھویا کھویا سا انداز۔ اس کی تیز تیز بے تصنع گفتگو کی لہلہاہٹ اُن کی طبیعتوں میں محفوظ گدگدی پیدا کر دیتی تھی۔ ہندوستانی متوسط طبقہ کی دبی دبائی شریف لڑکیاں چہار دیواری کے اندر نئی باتوں کی اطلاعوں پر دانتوں سے اپنی زبان کی نوک داب لیتی ہیں۔ احساسات سے بریز ہنسی کی موجوں کو گھونٹ جاتی ہیں اور اپنے سینہ و شانہ پر آنچل ڈال کر خیالات کی بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو گم کرتی، ڈھونڈتی اور پاتی رہتی ہیں۔ فیض اُن کے لئے ایک کھلونا تھا یا کھیل کا کھونٹا۔ کھٹا چوری کھیلنے میں کوئی کھونٹا بن جاتا ہے۔ لڑکیاں چھپتی ہیں۔ ایک "چور" لڑکی انہیں ڈھونڈتی ہے۔ بھاگنے اور پیچھا کئے جانے کی لذت اور کھونٹے کو دوڑ کر خوف و مسرت کے ساتھ چھو لینے کی سنسنی خیزی اُن کی نوخیز زندگیوں کو برق تاب کرتی رہتی ہے۔ فیض کے گرد لڑکیاں ذہنی کھٹوا چوری کھیلتی رہتی تھیں۔ ایک مُبہم کشش اُسے وہاں کھینچ کر لے جاتی تھی۔ اس سہمیں غبار کے اندر رفتہ رفتہ ایک چاند نکلا۔ نازک سا ہلال۔ ابہام نے وضاحت اختیار کر لی۔ عمرانہ سات سال کی بچی تھی۔ فیض کی چہیتی۔ مگر فیض ایک دوسری لڑکی کا چہیتا بنتا جا رہا تھا۔ اُس کی عمر چودہ سال کی رہی ہو گی۔ راشدہ خاموشی سے اپنے آنچل میں محبت سمیٹ رہی تھی۔ مگر بڑی آپا، باجی اور بجیا کا فیض پر قبضہ تھا۔ یونہی ناحق، بے مصرف سا قبضہ۔ راشدہ مسابقت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑی لڑکیاں فیض کو چھیڑ چھیڑ کر لطف حاصل کرتی تھیں اور عمرانہ تو اُس کے گلے کا ہار ہی بنی رہتی تھی۔ راشدہ کی محبت کے جذب و کشش نے آخرش فیض کو بھی اپنی طرف کھینچا۔ چراغ سے چراغ جلا۔ مگر خود فیض میں بالغ جرأت اور پیشقدمی کی کمی تھی۔ اس کے

باوجود محبت کا پودا بڑھتا رہا۔ جذبات کے تار سے گذر کر اب ذہن و روح کو اطلاع اُلفت پہنچنے لگی تھی۔ پہلے تو جذباتی دلچسپی ہی رہی مگر جب شرم کے مارے فیض اور راشدہ دونوں ایک دوسرے سے مِل نہ سکے تو پھر مادہ نے اپنے حقوق فراموش کر دیئے۔ گوشت پوست کے شعلے مدھم پڑ گئے۔ الاؤ بیکار کیوں لہکتا رہتا مگر بیرونی سرد مہری کی کمی اندر دبے ہوئے آتش فشاں سے پوری ہو گئی۔ دونوں کے اندر روحانی آگ سُلگتی رہی۔ دونوں جلتے رہے۔ فیض راشدہ سے شدید ذہنی لگاؤ کی برقی ڈور سے بندھتا جا رہا تھا۔

راشدہ گاؤں کی ایک سادہ لڑکی تھی۔ اُس کا خون گرم جولان تھا۔ پُر جوش سانولا رنگ۔ نکلتا ہُوا قد۔ اس کے استوار اعضاء حرکت و خرام کے وقت زندگی کے برقپاروں کی بوچھار کرتے تھے۔ وہ اُبلتے ہوئے جوشِ حیات سے پھاگن میں کامنی کا پیڑ معلوم ہوتی تھی۔ مست خوشبو پھولوں، نازک ہریالے پتّوں، لچیلی شاخوں اور مضبوط گٹھیلے تنے کا ربط و ہم آہنگی لئے ہوئے۔ اور اس کی اَن دیکھی جڑیں ہندوستان کے تمنّا پرور، رس بھرے، سرجوش، اکھڑ گاؤں میں تھیں۔

فیض تھا تو گاؤں کا۔ مگر اپنے والد کے ساتھ شہروں میں بھی رہ چکا تھا۔ وہ چمبیلی کے پھول کی طرح تھا۔ جنگلی چمبیلی نہیں۔ چمن پرورده چمبیلی۔ نازک، لطیف۔ کاش وہ گلاب ہی ہوتا! اپنی شاخ پر۔ اپنے نوکیلے، خونریز کانٹوں کے ساتھ! اور اس کی چاہنے والی ماں نے تو اُسے دامن کے پھولوں کی طرح بنا رکھا تھا۔ فضا کی نرم و گرم ہواؤں کے جھونکوں سے محفوظ۔ مگر سخت زمین کے جیون رس، اُبلتے چڑھتے ہوئے رس سے بھی علیحدہ۔ وہ نفیس مزاج اور نہایت ہی مہذّب تھا۔ ادب نوازی نے اُسے اور مہذّب بنا دیا تھا۔ مہذّب اور ذکی الحس۔ وہ نہایت ہی نفاست و نزاکت و لطافت سے زندگی کے حُسن کو محسوس کرتا رہتا تھا۔ لیکن زندگی صرف احساسات کا مجموعہ نہیں۔ زندگی میں کبھی آرزوئیں، گہری، اقدیم، ازلی، سیہ مست، ناتراشں آرزوئیں بھی پھنکارا کرتی ہیں۔ مہذّب اور لطیف مزاج فیض ان داخلی پھنکاروں سے ڈر جاتا تھا۔ ایسا ہی ہوتا کہ اس کی خواہشات کے سانپ کسی کو ڈس ہی لیتے۔ مگر چند ساحرائیں ایسی بھی تھیں جو اُس وحشی سانپ کو رام کئے ہوئے تھیں۔ اُس نٹ کی طرح جو اپنی قوتِ ارادی کے زور سے سانپوں کو دودھ لاوا کھلا کر اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ ڈسنے نہیں دیتا۔ زہر کے اخراج پر بھی بڑی سیاہ بہیمانہ پُرشور وحشی لذّت ہے۔ ملتے ہوئے سانپ کا زہر دوسرے کے خون میں سرایت کرنے کی بجائے خود اُس کے خون میں گھُلتا رہتا اور خون کو تیزاب بناتا رہتا ہے۔ سانپ سپیرے کے سامنے ناچتا ہے، ناچتا ہے مگر جادو جگانے والی نگاہوں سے ہٹ کر وہ اور کٹیلا، چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ فیض فضائے حرم میں رقص کرتا رہا، رقص کرتا رہا۔ دو جادوگرنیاں اُسے نچاتی رہیں، نچاتی رہیں۔ اُن کی ساحر نگاہوں سے ہٹ کر اُس کا داخلی سانپ اور پھنکارنے لگتا۔ اُس کا جن اُس کو تیز تیز ترغیب دیتا۔ لیکن وہ تو مہذّب تھا۔ لطیف مزاج۔ اس کی سریع الحسی اُسے جلاتی رہی۔ اُس کا خون تیزاب بن گیا۔ اُس کے سانپ نے خود اُسی کو ڈس لیا۔ اُس کے بپھرے ہوئے بیکار جن نے خود اُسی کو دے مارا۔ اور اس کا ذمہ دار وہ راشدہ کو ٹھہراتا رہا۔ سطحی روحانی لذّتوں کا ماتا فیض۔ وہ اپنی ذہنی اور روحانی دُنیا میں کبھی کبھی یہ سوچ کر بھی خوش ہوتا تھا کہ اس کی محبت روحانی ہے۔ منزہ، مقدّس، آسمانی۔ پر نفس کی تاریک گہرائیوں میں بے پناہ تشنگی تھی۔ وہاں چڑچڑاہٹ کے کالے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ نفرت کا کالا پانی گھُٹ گھُٹ کر جوش مار رہا تھا۔ جیسے چٹانوں کے اندر گندھک کی سطح پر سربند سیاہ و گرم چشمہ جوش مار رہا ہو۔ اس گرم پانی نے رفتہ رفتہ چڑچڑاہٹ کے کالے دانوں کو سینچا۔ اب وہ شجرِ ملعون سیج کے کانٹوں کی طرح اپنے پھن پھیلائے اُگ جانے پر آمادہ ہو رہا تھا۔

راشدہ انسانی شخصیت کی ان پیچیدگیوں سے کہاں واقف تھی اور اگر واقف ہوتا بھی تو کیا۔ واقفیت اور شے ہے اور برتاؤ اور۔ اُس نے تو ایک ایسے شخص کو اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ جس کی محبت کا نمو اُس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ جیسے کسی نازک گملے میں بڑا سا پیڑ اُگنے لگا ہو۔ جو وہ چاہتی تھی وہ نہ ہوا۔ راشدہ

عورت تھی مکمل عورت۔ وہ مرد کو مضبوط سہارا کی صورت میں دیکھنا چاہتی تھی۔ صرف ترغیب نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ فیض آگے بڑھے۔ ساری رکاوٹوں کو دُور کردے۔ گھریلو رکاوٹیں، اور جذباتی رکاوٹیں۔ سب کچھ۔ اس کی تمنا تھی کہ فیض ہر قسم کے شبہات کو پگھلا دے۔ وہ اُس میں چمکتے ہوئے سُورج کی گرمی اور تندی دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر فیض خود اپنے آپ میں اُلجھا رہا۔ اور اپنی روشنی، اپنی ذہانت، اپنی گرمی بے اثر طور پر اُن ہستیوں پر صرف کرتا رہا جو چھچھلی تھیں۔ لہکتی پھولتی، خوشبو لُٹاتی راشدہ کا یہ حال ہو کر رہ گیا جو جاڑے کی صبح میں نکہت فشاں ہارسنگار کے درخت کا ہوتا ہے۔ سنہرے رو پہلے پھول بڑی بیچارگی سے اُس کے سایہ تلے خاک میں رُلتے رہتے ہیں۔

ایک سال یونہی گذر گیا۔ سوزِ عشق نے فیض کے خون کو تیزاب بنا دیا۔ اور ایک روز یہ تیزاب اُس کے ذہن و دماغ پر آگرا۔ اُس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ بہانہ یہ تھا کہ آنکھوں میں درد رہتا ہے۔ غالباً غیر شعوری طور پر نفس نے یہ عذر حقیقی شکل میں بھی تراشں لیا تھا مگر جب وہ ایک سال گھر پر بیٹھا بیٹھا فرانسیسی ناول پڑھتے پڑھتے تھک گیا تو پھر اُس نے پونا جاکر آئی۔ اے میں دوبارہ نام درج کروایا۔ پونا کی رنگین فضا اور کہستانی مناظر نے اُس میں پھر جان پیدا کردی اور اس کی طبیعت میں کچھ دنوں کے لئے استحکام آگیا۔ اس دو سالہ دور میں وہ گلفام بن جانے کا آرزو مند رہا۔ وہ اکثر اُڑن کھٹولوں پر پرواز کیا کرتا تھا۔ ادب و شاعری اُس کی نیلگوں جھیل تھی۔ وہ چنچل مچھلی کی طرح اُس میں آزادانہ تیرتا رہا۔ راشدہ اب اُس کے لئے شباب اور محبت کی صرف ایک علامت تھی۔ جیسے ایلورا اجنتا کی کوئی تصویر۔ وہ خود اپنے آپ پر عاشق ہو گیا تھا۔ اُسے اکثر یہ فریبِ رنگین ہو جاتا کہ پریاں اُس پر مرنے لگی ہیں۔ اور کھلی چھت پر چاندنی راتوں میں وہ طرح طرح کے خواب دیکھتا۔ کوئی سبز پری آتی اور اُسے اپنے تختِ رواں پر اُڑا کر لے جاتی۔ پُونا کے کہستانی شہر میں پریوں کے پَرے کے پَرے پھرتے تھے۔ وہاں فیض کے بتخانۂ تصوّر کی تعمیر کے لئے کافی مواد موجود تھا۔ اُس نے قوس و قزح اور کہکشاں کے دائرے میں رہ کر بھی آئی۔ اے پاس کر لیا۔ چھٹیوں میں جب وہ گھر آیا تو اُسے علم ہوا کہ راشدہ کی شادی ہو چکی۔

فیض اپنے خیال میں مظلوم تھا۔ عقلاً وہ اس کی کوئی دلیل اپنے آپ کو نہیں دیتا تھا۔ اور اس کا دماغ واضح طور پر راشدہ کو بُرا بھلا بھی نہیں کہتا تھا۔ مگر دماغ کے تاریک گوشوں کی تہ سے شدید غضب کی آنچ اُٹھ کر دل کو غیض سے بھر دیتی تھی۔ اس کی مجروح آرزو جراحت کے بعد اِس درد سے تڑپتی تھی کہ کاش راشدہ شادی پر راضی نہ ہوتی۔ کبھی کبھی تو وہ اس تمنا پرور خیال آرائی سے بھی مجرمانہ لذّت حاصل کرتا کہ اگر راشدہ کی شادی نہ ہوتی تو وہ تشنگیٔ محبت سے صرف اُس کی خاطر عمر بھر تڑپتی رہتی اور یہ کتنا اچھا ہوتا۔ فیض اُس وقت ایک روحانی بیوپاری کے بہروپ میں ہوتا۔ قحط سالی کے ایّام میں سرمایہ دار اندر ہی اندر چوری چوری کتنا خوش ہوتے ہیں کہ بھوکے کسانوں پر رعب رہے گا۔ اور فاقہ مست مزدور سستی مزدوری پر کام کریں گے۔ بشرطیکہ وہ اُس کے مال کے خریدار نہ ہوں اور بیوپار دساور میں ہوتا ہو۔ فیض کے روحانی بیوپار کے امکانات بھی دساور میں ہی تھے۔ پونا اور بمبئی۔ راشدہ تو اس کی خریدار نہیں تھی۔ اب پر کیا اب وہ اس کے لئے تڑپتی نہ ہوگی۔ فیض کو تسکین ہوتی۔ ضرور تڑپتی ہوگی۔ محبت کی تشنگی اور ہے اور جنسی بھوک اور۔ کبھی اُس کا ہمزاد اس شیش محل کو توڑ دیتا۔ اور پھر عُریاں حقیقتیں سامنے آجاتیں۔ تشنگیٔ محبت اور جنسی بھوک دونوں ہم آغوش ہو کر اُس کے سامنے ناچنے لگتیں۔ وہ اور اُس کا رجحن دونوں جذبات کے دوزخ میں اوندھے مُنہ جا گرتے۔

رقابت مقابلہ کی جان ہے۔ فیض نے یہ ٹھان لی کہ وہ بی۔ اے ضرور پاس کر کے دکھا دے گا۔ وہ محبت اور جنس کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔ مگر زندگی کی دوڑ میں وہ راشدہ کے شوہر کو بُری طرح شکست دے گا۔ اس کا دل تازہ ناکامی سے بیٹھا بھی جاتا تھا۔ اور رقابت کی آگ لہک بھی پیدا کر رہی تھی۔ فیض نے چھٹیوں کے ختم ہونے کے بعد ایک نئے پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ بی۔ اے کے بعد زندگی میں کامیابی یقینی نہ تھی۔ ہر جگہ پڑھے لکھے بے روزگاروں کی بہتات تھی۔

اور اُسے جلد از جلد زندگی میں کامیاب ہونا تھا۔ تجارت!——
تجارت؟ اُس کا ادبی ذوق اس راہ میں حائل تھا۔ دونوں میں مفاہمت ہو گئی۔ اُس نے ایک ادبی پرچہ نکالا اور ساتھ ساتھ بک ڈپو بھی کھول لیا۔ شہرت! عزت! دولت!۔ راشدہ کا شوہر بہت پیچھے چھوٹ کر ایک مُبہم صِفر بن کے رہ گیا۔ اُن دنوں فیض کا "ہلال" ماہِ کامل بننے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ ماہِ یک ہفتہ! پرچہ کا نام ہلال رکھا گیا۔ اور راشدہ؟ راشدہ بس اب ایک خیالی مرکز تھی۔ جہاں سے رومان کی لانبی ریشمیں ڈور شروع ہو کر دُور دُور کے سبزہ زاروں تک بڑھتی چلی گئی تھی۔ فیض اپنی بنائی ہوئی ادبی دُنیا میں خوش تھا۔

سات مہینے میں پرچہ اور بک ڈپو سب ختم۔ متوقع کامرانی جلد نہ آئی۔ اور اب بمبئی میں بی۔ اے۔ فیض بمبئی میں دو سال رہا۔ مگر بی اے پاس نہ کر پایا۔ صرف اتنا ہُوا کہ اُس نے کچھ دُنیا دیکھ لی۔ اور فرانسیسی ناولوں کی جگہ کمیونسٹ مینی فیسٹو اور "اکتوبر کا انقلاب" پڑھنے لگا۔ اب وہ گمنام بننے کے خواب نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ ایک اشتمالی انقلابی بننے کی رومانیت میں غرق رہتا تھا۔ دل کی مار نہیں پیٹ کی مار۔ مگر فیض کا دل اب بھی حقیقت کے تجزیوں سے گھبرا کر خواب کے آسمانوں میں نہ سہی جزیروں میں پناہ لینے کے لئے بے چین تھا۔ اور یہ کتابیں بھی تو چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ زندگی کے سمندر میں آباد، رچے سنورے ہوئے جزیرے۔ وہ رومانی ناولوں اور افسانوں کے نام سے بھی نفور محسوس کرنا چاہتا تھا۔ مگر ان رنگین جزیروں کی جادوگرنیاں اُسے چپکے چپکے اپنی طرف بلاتی رہتی تھیں۔ وہ ادب اور زندگی کے نظریے سے چمٹا ہوا دفعِ سحر کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ واقعیت پسند جو تھا۔ حقیقت پرست۔ وہ چیخوف، ٹرجنیف اور شولوخوف کے ناول اور افسانے پڑھا کرتا تھا اور لِن یوٹانگ تو اس کے لئے بالکل ایک نئی دریافت تھی۔ وہ برسوں تنگ لنگ، لوہسون اور لن یوٹانگ کی دُنیا کی سیر کرتا رہا۔ ایک نئے براعظم کا انکشاف جس میں زندگی کی حقیقتیں تھیں، حیرت تھی، قدامت کے باوجود تازگی تھی، انوکھا پن تھا، سنسنی تھی! وہ چینی انقلابیوں سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا۔ بلکہ وہ چینی کمیونسٹ بن ہی جایا کرتا تھا۔ شنگھائی، شنسی، شانسو، سنکیانگ، چنگنگ، چوتہہ، موسی تنگ یہ سب نام اس کے دل کو دھڑکا دیتے تھے۔ جوان جوان آرزومند خون اُس کی رگوں میں تیر جاتا اور وہ سرور و کیف کی دنیا میں پرواز کرتے کرتے مدہوش ہو جاتا تھا۔ لِن یوٹانگ کے ناول "لمحۂ پیکنگ" اور "طوفان میں ایک پتہ" کے چند کرداروں پر تو وہ عاشق ہی ہو گیا تھا۔ مولان اور تانیا اس کی خاص محبوبائیں تھیں۔ وہی پرانا ارژنگِ چین، وُہی چین کی شہزادی! یہ کتابیں بھی تو جزیرے ہیں۔ یا ایک نیا براعظم انوکھی چھبیلی دُنیا!

فیض گھر واپس آ گیا تھا۔ اُن ہی دنوں اس کی شادی بھی کر دی گئی۔ وہ شادی شاید نہ کرتا۔ بغیر انقلاب لائے ہوئے شادی؟ اور اُسے تانیا کہاں ملتی۔ مگر وہ مخالفت بھی نہ کر سکا۔ وہ کر بھی کب سکتا تھا۔ بہن کی شادی کی خاطر اپنے خیال میں اُس نے ایک سماجی قربانی پیش کی۔ "گلگشا" شادی ہونی تھی۔ والد کی بات اُس نے مان لی۔ آخر والد بھی تو اُس کی بہت ساری باتیں مان لیا کرتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد اُس نے ایک ادارۂ اشاعت کی طرح ڈال دی۔ اور ادارہ کا رکھ رکھاؤ اُس منزل کے معیار سے شروع کیا جہاں خواب حقیقت بن جاتے ہیں۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد دارالاشاعت بے در و دیوار سا ایک گھر بن کر رہ گیا۔

آئندہ دو تین سال فیض پر نہایت سخت گذر گئے۔ بے روزگاری اور بے کاری، بیوی اور بچے۔ اس دور میں مُرغِ زرّیں پر کے پر و بال بہت حد تک جھڑ گئے۔ اب وہ رقص سے زیادہ تلاشِ دانہ کی فکر میں سرگرداں رہتا۔ اس کی یمانیت کم ہو گئی اور اس کی توجہ کاغذی کتابوں سے ہٹ کر اوراقِ زندگی کی طرف پھر گئی۔ وہ زندگی کی تلخیوں، عریانیوں، ناانصافیوں اور کمینگیوں کو محسوس کر کر کے کُڑھتا اور لرزتا رہتا تھا۔ عملی اقدام کے لئے اس کی ساخت ہی نہیں ہوئی تھی۔ اگر اس کی تعمیر کسی اور خمیر سے ہوئی ہوتی تو یہی جذبہ بارود بن کر بھڑک اُٹھنے کا تھا۔ وہ صرف ایک تودۂ بیزاری بن کر رہ گیا۔ اُس کے جسم کے روئیں روئیں میں کُڑھن تھی۔ جوہر جوہر میں بیزاری۔ مگر وہ اس گھٹتی ہوئی بیزاری سے معدنی ریڈیم کی طرح خود ہی جلتا رہا۔

ایک عالم کو ایٹم بم کی طرح جلا نہ سکا۔

پھر وہ لوکر ہو گیا۔ وہی کلرکی۔ اُسے کچھ سکون ملا۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکا تھا۔ آرام کا ایک چلّو بھی اُس وقت بہت تھا۔ وہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح کلرکی کی روکھی، بے رونق گھاس ہی سے لپٹ کر سو رہا۔ اس نیند میں اُس کے چند پُرانے خواب انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئے۔ کلرکی کے ساتھ اُس نے مُبہم سی عاشقی بھی شروع کر دی۔ مخصوص نہیں، مشترک سی ہمہ گیر عاشقی۔ کنواری اور بیاہی لڑکیوں میں وہ ہنوز ہر دلعزیز ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صورتاً اور سیرتاً معتبر ہونے سے قطعی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ ہر روز تازہ بتازہ عشق کرنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا چاہنا اور چاہا جانا تازہ ہوا اور دھوپ کی طرح ضروری ہیں۔ محبت حیاتین ہے اور ہر حیاتین بقائے زندگی کے لئے لازمی۔ کوئی لڑکی حیاتین الف ہوتی ہے۔ کوئی ب، کوئی ت۔ اور حیاتین روز ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ وہ شوخ چنچل لڑکیوں کو وٹامن اے کہا کرتا تھا اور سنجیدہ لڑکیوں کو وٹامن بی۔ طرحداروں اور فیشن پرستوں کو "سی"، گداز اور بھرپور دوشیزاؤں کو وٹامن ڈی۔ اور جن میں جنسی کشش زیادہ ہو ان ستم آراؤں کو وٹامن اکس کا نام دیا کرتا تھا۔ غرض وہ بجھ ہوئی رنگ میں جنسِ لطیف کا مرنجاں مرنج عاشق بن کر رہ گیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ جب بھی کسی کنواری لڑکی کی شادی ہو تو اُسے دلی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ ہر برات کے باجوں کی آواز پر اپنے کو دولہا بنا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔

کہیں کہیں اس کی قدر بھی ہوئی۔ مگر عموماً وہ عورتوں کا کھلونا ہی بن کر رہا۔ آخر اُسے کلرکی اور عاشقی دونوں میں یہ احساس ہوا کہ ہر دو سرمایہ دارانہ استحصال اور نفع اندوزی کا شکار ہیں۔ لڑکیاں اس کو "اکسپلائٹ" کرتی رہیں۔ نمائش کے موقعوں پر وہ اُن کی ساریوں اور بلاؤز کے کپڑوں کے بنڈل ڈھوتا ہی رہا۔ وہی کلرک صلاحیت کے استحصال کی تلخیاں کم محسوس کرتا ہے جو خورد بُرد کرتا رہے۔ اور وہی عاشق غمِ عشق کے نیش سے بچ سکتا ہے جس میں "شوقِ فضول" کے ساتھ "جرأتِ رندانہ" بھی ہو۔ فیض نہ خورد بُرد کرنا جانتا تھا اور نہ جرأتِ رندانہ کا اہل تھا۔ لہٰذا غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کے پنجوں میں گرفتار رہا۔ کبھی کبھی وہ اپنے خاص دوستوں سے کہتا۔

"بھئی سرمایہ دارانہ نظام کے ہر شعبہ میں سراسر ضیاع ہوتا رہتا ہے۔ چند پیٹ بھرے جتنا بھی کھا سکتے ہیں ٹھونستے جاتے ہیں۔ جوان کے بھوگ لگا سو لگا اور بقیہ برباد ہی ہوتا ہے۔ جنسی اور جذباتی ضیاع دیکھنا ہو تو ان پڑھی لکھی کنواریوں کو دیکھو۔ یہ عمر رسیدہ دوشیزائیں"۔

اور بعض دفعہ تو اُس پر کچھ ایسا دورہ پڑتا تھا جیسا کبھی اللہ بخشے بیچارے غالب پر پڑا تھا۔ یعنی حسینوں سے انتقام لینے والا معاملہ۔ جنت کی حوروں کی شکل میں نہیں۔ بلکہ اسی مادّی دنیا میں۔ وہ نہ تو جنت کا قائل تھا اور نہ حوروں کا معتقد۔ جدلیاتی مادیت نے اُسے حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ اور دوستوں کے اعتراض سے بچنے کے لئے وہ اپنا عملی ہونا بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔

یوں بھی چندے گذری۔ پھر وہ کلرکی اور عاشقی دونوں سے اُکتا کر ادارۂ اشاعت کے خواب دیکھنے لگا۔ وہی جدلیات، وہی تضاد۔ وہی تصادم۔ نفس اور سماج کی اُلجھنیں کبھی دور نہ ہو سکیں۔

——— اور اس پانچ منٹ میں وہ اپنی زندگی کے سارے چکر کاٹ کر گرلز کالج کی سیڑھیوں پر کھڑا مس ڈیزی کا انتظار کھینچ رہا تھا

"آپ کس سے ملاقات مانگتا ہے؟"

ایک متوسط العمر نن کے چہرے نے اپنے سیاہ لبادہ کے اندر سے جھانکتے ہوئے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ادھر اُدھر چار کی گھنٹی بجی۔ جیسے کوئی جھیل کی مُرغابیوں کے پرّے پر فیر کر دے۔ ہر طرف لڑکیوں کے جھُرمٹ کے جھُرمٹ نظر آنے لگے پپیہے، مُرغابیاں، سُرخاب اور ہنس راج۔ فیض نو آموز شکاری کی طرح گھبرا گیا۔ اس کی نگاہیں کیسے زد میں لیں، کس پر نشانہ لگائیں۔ اُس کی سراسیمہ آنکھوں کے سامنے پھُلجھڑی سی چھوٹنے لگی۔

"آپ کس سے ملنے مانگتا ہے؟"

نن نے اب کے فیض کے بہت قریب ہو کر ذرا تلخی سے کہا۔ وہ چونک پڑا۔ ہڑبڑایا اور عجیب معصومانہ نظروں سے نن معلّمہ کو

تکنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ معلمہ کے بھورے بھورے کرم گستر اور متواضع چہرے میں شیشے کی سی آنکھیں نہایت ناموزوں معلوم ہو رہی تھیں۔ اُن آنکھوں کے اندر منجمد حسرتیں اور یخ بستہ ناکردہ گناہ پتھرا کر رہ گئے تھے۔ فیض پر ہلکا سا خوف طاری ہوگیا۔ خوف اور گھبراہٹ کی حالت میں اُس نے جواب دیا۔

"میں کارڈ بھیج کر یہاں انتظار کر رہا ہوں سسٹر"

"آپ کس کو مانگتا؟"

"مس ڈیزی کو سسٹر۔"

"آپ ایسا وقت آیا۔ لڑکی لوگ کو آپ سے تکلیف ہوتا ہے۔ اور آپ کو لڑکی لوگ سے تکلیف ہوتا ہے"

"مجھ کو ملنے کا وقت نہیں معلوم تھا سسٹر"

فیض نے کچھ ایسا تیور بنایا جیسے وہ سیڑھی سے اُتر کر جانے لگا ہو۔ اس کے چہرے پر مایوسی، ابلہی اور خوف کی ملی جلی کیفیت طاری ہوگئی۔ معلمہ کو اس پر رحم آگیا۔ کہنے لگی ——

"اب آپ آگیا ہے، تو ملاقات کمرہ میں ویٹ کیجئے"۔

پھر وہ لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولی "ویٹنگ روم سے تم لوگ ہٹ جاؤ"! لڑکیاں یوں بکھر گئیں جیسے بطخ کے تیرنے سے جھیل کی سبز کائی بکھر جائے۔ وہ اپنے اپنے رکشوں، فٹنوں اور موٹروں کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُن میں سے چند کاریڈر میں ٹہلنے لگیں، کئی صحن میں جانکلیں، اور کچھ کوٹھے پر دوڑ گئیں۔ ویٹنگ روم گلیاری کے ایک سرے پر تھا۔ وہیں سے اُوپر کی منزل کو زینہ گیا تھا۔ اور سامنے برساتی تھی۔ فیض وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نن معلمہ چلی گئی۔

وہ وحشی چکور کی طرح متوحش تھا اور کالج کی لڑکیاں بھی ہرنیوں کی طرح چوکنّا تھیں۔ اُن کی ٹولی میں ایک اجنبی آگیا تھا نا! شکر، فوراً ہی ایک اخبار نویس بھی آنکلا۔ یہ اخبار نویس ہر تعلیم اور ہر آب و ہوا میں پائے جاتے ہیں۔ قطبین سے لے کر خطِ استوا تک۔ خطۂ منجمد اور لہکتا ہوا صحرائے اعظم اُن کے لئے سب ایک ہیں۔ فیض کو سہارا مل گیا۔ اکھڑی اکھڑی باتوں میں اُس کے آنکلنے کی یہ تقریب معلوم ہوئی کہ وہ کالج میں داخلہ کی شکایات کے متعلق پرنسپل کا جوابی بیان لینا چاہتا تھا۔ لڑکیوں کی ٹولیاں بھی ذرا مانوس ہوگئیں اور فیض کو بھی دم لینے کا موقعہ حاصل ہوگیا۔

کرسیوں، میزوں اور دریچوں پر کتابیں اور کاپیاں مختلف ہیئت اور زاویوں میں بکھری پڑی تھیں۔ چند برقعے بھی کرسیوں کی پُشت پر رکھے ہوئے تھے۔ کالے، بھورے، سفید۔ تھیلے اور بیگ چھوٹے چھوٹے لپٹے ہوئے تھے۔ ایک بڑا سا المونیم کا ٹفن بکس بھی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ فیض ان سب کو باری باری دیکھتا رہا۔ برقعوں پر آکے اُس کی نظر آرام لینے لگتی تھی۔ وہ دیر تک اُن کو دیکھتے رہنا چاہتا تھا مگر اخبار نویس کی موجودگی ہچکچاہٹ پیدا کر دیتی۔ وہ برقعے فیض کے لئے علامت تھے۔ اس کا تخیل اُن برقعوں کو آباد کرتا اور چلاتا پھراتا رہا۔ وہ تنہا ان برقعوں کے پس پردہ صورتوں اور پیکروں کے تصورِ جمیل میں گُم ہو جانا چاہتا تھا۔ صحبتِ غیر اس خلوت میں حائل تھی۔

"مس ڈیزی نہیں ہے۔ اور آپ کو مدر بلاتا ہے"

پہلا جملہ خادمہ نے فیض کی طرف بڑھایا اور دوسرا اخبار نویس کی جانب۔ آخر الذکر پرنسپل سے ملنے چلا گیا۔ فیض کچھ مایوس اور کچھ مطمئن سا نظر آنے لگا۔

"سنو!" فیض نے جاتی ہوئی خادمہ کو پکارا۔

"کیا؟" وہ مڑی۔

فیض نے جوان خادمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اور اُسے بھرپور دیکھتے ہوئے کہا۔

"مس صاحبہ ضرور ہوں گی۔ دیکھو، ضروری کام ہے۔ تم اُنہیں ڈھونڈ نکالو۔"

خادمہ کا چہرہ تاباں ہوگیا اور وہ پہلے کا معاندانہ انداز کینچلی کی طرح اُتر گیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا!"

"تم بہت اچھی آدمی ہو!" فیض نے خوشامد کی۔

وہ جھوم سی گئی۔

اب وہ تنہا تھا اور اُس کا تخیل آزاد۔ اس کے اندر بھی گرمی سی آگئی اور وہ ہر سو دیکھنے لگا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی اگلی زندگی یاد آ رہی تھی۔ وہ کالج اور ہوسٹل کی فضاء میں یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ زندگی کے سارے بکھیڑوں، سارے جنجال سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد اُٹھا اور رگ و پے میں چھا گیا۔ وہ عالم مدہوشی میں ہر گزرنے والی لڑکی کو تکتا تھا۔ اس کی نظروں میں اس وقت نفوذ کی ایسی قوت تھی کہ جس لڑکی سے آنکھیں چار ہو جاتیں وہ اثر پذیر ہوتے ہوئے شرما جاتی۔ جو لڑکیاں ویٹنگ روم کو چھوڑ کر گئی تھیں اُن میں اکثر قریب ہی قریب منڈلاتی رہیں اور ایک ٹولی بالائی زینوں پر کھڑی گھُس پھُس کر کے قلقاریاں لگاتی رہی کبھی کوئی واضح فقرہ سنائی دیتا جو فیض کو سُنانے کی غرض سے ہی اوپر سے لڑھکایا جاتا تھا۔ پھر دبی دبی ہنسی۔

"اری کیسے جاؤں۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"تو پڑی سڑا کر یہاں۔"

"تو جانا!"

"اور کیا! جاتی ہوں۔"

"ہونہہ! ساتھ چلیں گے۔"

کوئی لڑکی ملاقاتی کمرے سے خود آ کر کتاب لے جاتی اور کوئی رکشا والے کو بتا کر بھیجتی کہ فلاں جگہ سے اُس کی کتاب اُٹھا لائے۔ فیض اُن کے بتا دیے سُن کر لڑکیوں کے فرستادوں کو اُن کی کتابیں چُن چُن کے دیتا رہا۔ لڑکیوں کی آوازوں کے لب و لہجے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ سب کی سب چونکی چونکی اور بیدار بیدار سی ہیں۔ کبھی کوئی انجان لڑکی کمرے میں دندناتی ہوئی گھُس آتی تو باہر خندہ ریزیاں ہوتیں اور وہ بیچاری فیض کو دیکھ کر گھبرائی گھبرائی مجوب ہو کر اُلٹے پاؤں بھاگتی۔ صبیح، ملیح، صندلی، شوخ، شاداب، متین، کتابی، بیضوی، لمبوترے اور بھولے چہرے نظروں کے سامنے آتے رہے۔ سرو قد خوش خرام دل گداز بدن گیج گامیوں اور بطا ساقہ والی کبک چالوں نے سو سو طرح سے حشر اُٹھائے۔ رنگ برنگ ساری کی پُر پیچ بندشوں، فتنۂ خوابیدہ جوڑوں، لچلچاتی ہوئی چوٹیوں اور لہراتی ہوئی زلفوں نے جادو جگائے۔ اور سیہ مست، آہو شکار، کٹیلی، شربتی اور بادامی آنکھیں، رسیلی نشیلی، اور نرگسی نگاہیں جاگتے کے خواب دکھلاتی ہوئی ستاروں کی طرح طلوع و غروب کی منزلیں طے کر گئیں۔ فیض عالم سکر و کیف میں بیٹھا اس گذران فلم کو دیکھ رہا تھا اور اس کی اندرونی آنکھیں کئی گذرے ہوئے مناظر ماضی کے نہاں خانوں میں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔

"معاف کیجیے گا۔ میں اپنی کتابیں لے لوں۔"

ایک تیز لڑکی نہایت رعنائی کے ساتھ شلوار اور اوڑھنی میں ملبوس آئی اور اپنی کتابیں چُن کر لے گئی۔ وہ بُت بنا بیٹھا رہا۔ یہ ہلکی سی بے مقصد چھیڑ تھی۔ چند لڑکیاں کھٹ پٹ کھٹ پٹ سیڑھیوں پر سے اُتریں اور ویٹنگ روم سے برق رفتاری کے ساتھ گذرتی ہوئی صحن میں جا کھڑی ہوئیں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ یکے بعد دیگرے چند ملازمائیں آئیں اور برقعے لے گئیں۔ صرف ایک سفید بُرقعہ دھرا رہ گیا۔ فیض اُس کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ بلا ارادہ "سفید برقع۔ سفید برقع" کا فقرہ کئی بار زبان پر لایا۔ اُس کے ذہن و دماغ میں بجلیاں سی چمکیں۔ سفید برقعہ ماضی کے حجاب سے جھانک رہا تھا۔ سفید برقعہ کی سفیدی اُس کے نفس کی گہرائیوں تک اُتر گئی اور اُس کا شعور ایک دلنواز تابندگی سے رچ گیا۔ اس کے دل کے گوشوں سے سوئے ہوئے جذبات اُبھر رہے تھے۔ سفید برقعے نے طلوع سحر کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اُس کا تخیل انگڑائیاں لے کر جاگ اُٹھا۔ رسیلے مگر درد خیز خواب منڈلانے لگے۔ جانی پہچانی ہوئی یادیں چونکے ہوئے حافظہ کی سطح پر چمکیں اور دل کا گداز بن کر رہ گئیں۔ اندھیرے اُجالے کی سی کیفیت اُسے اپنے اندر لپیٹے ہوئے تھی۔ اُس کا ادراک نیم خوابی کی حالت میں تھا اور شعور مبہم دھندلکے سے نکل کر آگاہی کی روشنی میں آ کے قرار لینا چاہتا تھا..........................

کہ ایک دُبلی سی لڑکی مخل ہوئی۔ اور پھر دھندلکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نیم بالیدہ احساسات ماضی کے نہاں خانوں میں جا کر روپوش ہو گئے۔ لڑکی بڑھی اور بظاہر جرأت کے ساتھ مگر دل میں خجل ہوتی ہوئی بھدّے سے ٹفن بکس کو اُٹھا کر لے جانے کی غیر شاعرانہ حرکت

کی طرف متوجہ ہوگئی۔ فیض کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ یونہی خالی خالی سا بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لڑکی ملاقاتی کمرے کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کے وجود نے فیض کے ذہنی خلا کو سُرعت کے ساتھ پُر کر دیا۔ لڑکی کا سرو قد، اُس کے بھرے بھرے اعضاء سانولا نمک ریز نظروں میں مرغوب طور پر کھُب جانے والا رنگ، اُس کا پھولتا نکھرتا ہوا شباب، ترشا ہوا بدن اور متجسس برق پاش نگاہیں۔ دروازے کے چوکھٹے میں بڑے تیکھے پن سے نمایاں ہو کر فیض کی ساری ہستی کو اپنی طرف کھینچ لے گئیں۔ اُس کے ذہن کا دھندلکا روشن ہوگیا۔ ماضی اُس انجان لڑکی کی ساحر نگاہوں کے جادو سے حال بنتا ہوا محسوس ہوا۔ میٹھا میٹھا درد ایک دل دوز ٹیس بن کر چھا گیا۔ اجنبی لڑکی اب اجنبی نہ رہی۔ وہ تو بالکل راشدہ ہی تھی۔ اُس کی کھوئی ہوئی راشدہ۔ فیض پر بیخودی سی طاری ہونے لگی۔ گردن آگے کو جھکانے کی وہ خاص ادا۔ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے کا انداز۔ ہو بہو راشدہ! سالوں سال کا بوجھ اُس کے دل کے اوپر سے ہٹ گیا۔ پیچیدہ جذبات کی تہوں کے اندر سے ایک کچلا ہوا مگر معصوم جذبہ بیدار ہوا۔ اُلفت اولیں کی کرن منجمد برفستان کے اوپر سے جھانکی۔ برف پگھل کر اُچھلتی ہوئی آبشار بن گئی۔ اس کے جسم کو ایک نئی روح عطا ہوئی تھی یا اس کی روح کو نیا جسم ملا تھا۔ وہ گھڑی اس کے لئے حشر کی گھڑی تھی۔ فیض نے اپنے سارے وجود سے یہ محسوس کیا کہ اس کی پہلی محبت اب تک زندہ ہے۔ لذت و درد کے ملے جلے احساسات کے ساتھ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی چٹان کے سرک جانے کے بعد اس کے نیچے سے اچانک ایک بیش بہا خزانہ نکل آیا ہے۔ اُسے یاد آیا۔ اطلاع ملی تھی کہ راشدہ بیمار رہتی ہے۔ وہ کرسی پر سے بیتابانہ اُٹھ بیٹھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ بڑھ کر پوچھے۔

"راشدہ تم اب کیسی ہو؟"

راشدہ کا پیکر اب دروازہ پر نہ تھا۔ فیض ملاقاتی کمرے سے باہر نکل آیا۔ برساتی میں ایک موٹر کھڑی ہوئی تھی پچھلی سیٹ سے جھک کر کوئی ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ تو راشدہ ہی تھی۔ ڈرائیور موٹر سے اُتر کر ویٹنگ روم میں گیا اور کچھ لئے ہوئے واپس آیا۔ موٹر زن سے چل دی۔ فیض سیڑھیوں پر کھڑا سارے عالم سے بے خبر اپنی راشدہ کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا جا رہا تھا۔ موٹر پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ مگر فیض کے سامنے ابھی تک وہی تجلی تھی۔ وہ بے اختیارانہ گرلز کالج کے پھاٹک کی طرف کشاں کشاں چلا گیا۔ پیچھے سے خادمہ کی آواز آئی۔

"مس ڈیزی نہیں ہے۔"

مگر فیض نے یہ آواز سُنی ہی نہیں۔ وہ پھاٹک پر مبہوت کھڑا تھا۔ سامنے دوکان کی دیوار گھڑی چار بجکر دس منٹ کا وقت دکھا رہی تھی۔ مگر اُسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ تو ایک تیر نیمکش کی خلش سے بے چین ہو رہا تھا۔ بے پایاں خلش اتھاہ درد۔ وہ بلا خواہش و ارادہ سڑک پر چلنے لگا۔ بے انتہا احساس درد کو مٹانے کی شاید یہ غیر شعوری حفاظتی کوشش تھی یا محض بوکھلاہٹ۔ پھر وہ اچانک بائیں جانب کی پہلی گلی میں گھس گیا۔ یہ بڑی آشنا گلی تھی۔ اس کے ذرے ذرے سے بوئے محبت آرہی تھی۔ وہ زمانے تک ہوسٹل سے شام کو باقاعدہ روانہ ہو کر اسی گلی سے مڑتا ہوا اپنے اُس رشتہ دار کے گھر جایا کرتا تھا۔ جہاں راشدہ رہتی تھی۔ مگر ابھی اُسے اِس کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو بس گلی کے اندر بڑھتا ہی چلا گیا۔ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آگے اور آگے —— بچھڑے ہوئے ماضی کی طرف۔

مگر گلی اُسے کہیں نہ پہنچا سکی۔

عبادت بریلوی

کہانی کا ارتقا

یوں تو انسان خود ایک کہانی ہے۔ زندگی کا بیتا ہوا ہر لمحہ، دل پر گذرا ہوا ہر سانحہ، کائنات کی آغوش میں پرورش پایا ہوا ہر واقعہ، وقت کے ساتھ ساتھ ایک کہانی کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اور انسان کے لئے اس کی یاد، ایک اچھی خاصی دلچسپی کا سامان بن جاتی ہے۔ وہ جب اس کے متعلق سوچتا ہے، غور کرتا ہے، تخیل کی پرواز کو اس تک پہنچاتا ہے۔ تو وہ اس میں لطف محسوس کرتا ہے۔ ہر چند ماضی کے واقعے کی ہر یاد اس کے دل میں اشکوں کے ایک سوتے کو بیدار کر دیتی ہے اور وہ رنج و غم کی فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔ لیکن بہر حال اس کو یہ باتیں یاد ضرور آتی ہیں۔ اور وہ ان سے دلچسپی ضرور لیتا ہے۔ کیونکہ وہ خود اس کی ذات سے متعلق ہوتی ہیں۔ زندگی کتنی ہی کیوں نہ بدل جائے۔ انسان ترقی کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کر لے تہذیب و تمدن کتنا ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائیں۔ انسان کا یہ احساس زائل نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ انسان جذبات کو اپنی ہستی سے کسی صورت، کسی حال، اور کسی وقت میں بھی علیحدہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ جذبات کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ جذبات ہی کے سہارے اس کی زندگی میں طرح طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جذبات ہی کے سہارے وہ زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں میں حصہ لیتا ہے۔ جذبات ہی کے سہارے اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ غرض اگر انسان میں جذبات نہ ہوتے تو زندگی کی محفل سونی، بے رنگ و بو، جامد، اور غیر متحرک نظر آتی۔ انسان سوچ نہ سکتا۔ غور نہ کر سکتا۔ ایک دوسرے سے دلچسپی نہ لے سکتا۔ اور وہ زندگی کی راہ میں اس طرح اپاہج بن کر بیٹھ جاتا کہ دیکھنے والے اس کو دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رکھنے والا پتھر خیال کرتے۔

یہ جذبات ہی ہیں۔ جنہوں نے کہانی کو پیدا کیا۔ اور اس کی اہمیت اس قدر بڑھا دی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے انسان کی محبوب چیز رہی ہے آج بھی اور رہتی دنیا تک رہے گی۔ انسانیت کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں کوئی دور بھی ایسا نہیں ہوا جس میں کہانیوں سے دلچسپی نہ لی گئی ہو۔ اور تاریخ سے بہت پہلے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں بھی انسان قصے کہانیوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ بہت سی کہانیاں اس نے بنائی بھی تھیں۔ اور جیسے جیسے زندگی کے دن گزرتے جاتے تھے۔ مختلف حوادثات سے دوچار ہونا اس کے لئے بہت سی ایسی چیزیں فراہم کر دیتا تھا۔ جو کہانی کے مواد کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ زندگی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ اس لئے وہ اس کی ہر بات کو تحیر کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور اس احساس تحیر کے باعث دنیا کی ہر بات، ہر واقعہ، اور ہر سانحہ اس کے لئے ایک کہانی بن جاتا تھا۔ ان میں سے ایک فرد پر بھی اگر کوئی عجیب بات گزرتی تھی تو وہ اس کی ساری کیفیت دوسروں تک پہنچا دیتا تھا۔ اور سننے والے، کہنے والے سے بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے۔

اس زمانے میں کس قسم کی کہانیوں کا رواج رہا ہوگا۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے اس وقت کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ضروری ہوگی۔ ابتدائے آفرینش میں انسانی زندگی کی جو حالت تھی وہ آج کی زندگی سے بالکل مختلف ہے آج کے تہذیب و تمدن کا اس زمانے میں پتہ نہیں چلتا۔ انسان، چونکہ شروع شروع دنیا میں آیا تھا۔ اس لئے اس کو یہاں کے تمام حالات سے پوری طرح واقفیت نہیں تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، وہ اسی دنیا میں، آئے دن نت نئی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا۔ اس کے تجربوں نے اس سے بہت سی چیزیں ایجاد کرائیں۔ اس نے بہت سی نئی نئی چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کیں اور اس طرح وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ بہر حال ایک انجان انسان تھا۔ اور اس میں تحیر کی کیفیت نسبتاً آج کے انسان سے زیادہ پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب

وہ کھانے کی تلاش میں جنگلی جانوروں کا شکار کرنے نکلا تو اس کو طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔ کہیں جانوروں کو اس نے مار ڈالا کہیں خود جانور اس پر حملہ آور ہو گئے اور جب وہ گھر لوٹ کر آیا تو اس نے یہ اور اسی قسم کے دوسرے تمام واقعات اپنی عورتوں، اور دوسرے ساتھ رہنے والوں کو سنائے۔ ان واقعات میں سے جو زیادہ اہم تھے، جن میں زیادہ جان تھی، جو زیادہ زوردار تھے۔ جن کے اندر دل میں زیادہ کھُب جانے والی کیفیت تھی، وہ زندہ رہے، آئندہ نسلوں نے بھی ان کو یاد رکھا اور وہ صدیوں تک برقرار رہے جب اُس نے لکھنا جان لیا تو ان کو لکھ کر محفوظ بھی کر لیا۔ جن میں سے پُرانے لوگوں کی بہادری کے واقعات آج تک ہمیں قصّے کہانیوں کی صورت میں مل جاتے ہیں۔

دوسرے سب سے اہم اور ضروری چیز، جس نے کہانیوں کو سب سے زیادہ رواج دیا۔ انسان کے تعلقات اور جنسی خواہشات کی تسکین کے مختلف واقعات تھے۔ عورت کے جسم سے پیدا شدہ لذت اور پھر اپنی اپنی محبوب عورتوں سے لذت حاصل کرنے کا خیال، اور اگر وہ ان کی نہ ہو سکیں تو ان کو حاصل کرنے کی فکر، اور ساتھ ہی ساتھ اس سلسلے میں ایک جارحانہ اقدام، —— یہ چیزیں ابتدائی انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ ایک خوبصورت عورت کو حاصل کرنے کے لئے دو مرد، اکثر ایک دوسرے سے برسرِپیکار ہو جاتے ہوں گے۔ اور ان کی زندگی کے ان واقعات کی اہمیت آئندہ نسلوں کی نظروں میں بہت زیادہ ہوتی ہو گی۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے خصوصاً ان واقعات سے بہت دلچسپی لیتے ہوں گے۔ اور یہ جذبات چونکہ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اہم ہیں، اس لئے نہ صرف ابتدائے آفرینش میں، بلکہ آج بھی کہانیوں میں ایسے ہی عناصر کی فراوانی نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ ابتدائے آفرینش میں غیر کے احساس نے بندگی اور عبودیت کے جذبات کو انسان کے اندر سب سے زیادہ بیدار کیا تھا۔ وہ جس عجیب چیز کو بھی دیکھتا تھا اس کے سامنے جُھک جاتا تھا۔ اور اس کو اپنا معبود خیال کر لیتا تھا۔ جب اُس نے شروع شروع میں سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔ جس کے نورانی مسکراہٹوں سے ساری کائنات روشن ہو گئی تھی، تو اس کو اپنا معبود سمجھا۔ اور قریب قریب ہر خطے اور قریے میں اس کو اپنا دیوتا مان لیا۔ اسی طرح چاند تارے، ہوا، پانی، آگ، غرض یہ تمام چیزیں انسان کے لئے اپنی اپنی جگہ معبود بن گئیں۔ ان معبودوں سے اس نے بہت سی چیزوں اور بہت سی باتوں کو متعلق کر دیا جس کے نتیجے میں مختلف طرح کی کہانیاں وجود میں آئیں۔

یہ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں تھیں جنہوں نے علم الاصنام کی تخلیق کی۔ اور سب سے پہلی کہانیاں ہمیں علم الاصنام ہی کے روپ میں ملتی ہیں۔ جس میں انسان نے اپنی تخیّل کی پرواز سے کائنات کی مختلف چیزوں کو دیوتا مان کر، ان کے گرد کہانیوں کے جال بن دیئے۔ جو باتیں اس وقت کے انسان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن جو دُنیا میں موجود تھیں، وہ اس کو کسی مافوق الفطرت اور بلند و برتر ہستیوں کی کارفرمائی نظر آتی تھیں۔ تاروں کو جب اُس نے روز آسمان پر چمکتے ہوئے دیکھا۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا، تو اس نے سوچا کہ وہ سوائے دیوتاؤں کے کوئی اور چیز نہیں ہو سکتے۔ جو پہلے اسی دنیا میں اسی سرزمین پر موجود تھے۔ لیکن جو اب آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اور ان کی ہستی نے ستاروں کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اسی طرح سورج، چاند، دن، رات، ہوا، بادل، گرج، بجلی، مینہ —— ان تمام چیزوں کے متعلق اس نے بہت سی کہانیاں بنا ڈالیں۔ جن میں آج بھی، باوجود بعید از قیاس، ہونے کے ایک رعنائی ہے۔ ایک دلکشی ہے۔ ایک شگفتگی ہے۔ اور ایک دل موہ لینے والی کیفیت ہے۔ چنانچہ انہیں تمام خصوصیات کی وجہ سے اس وقت کے انسان کی تخیّل کی بلند پروازی اور تخلیقی صلاحیتوں کی داد دینی پڑتی ہے۔

انسان میں تخلیق کرنے کی خواہش بالکل فطری ہے۔ اور شاید دوسری خواہشات سے، اس کا پلہ بہت بھاری ہے۔ تخلیق کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں، جن میں سے ایک فنونِ لطیفہ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی تخلیق ہے۔ انسان سوچتا ہے۔ اور سوچ کر جب تخیل کی آنکھ سے گوناگوں نظاروں کو دیکھتا ہے۔ تو اس کی ایک

فطری خواہش ان نظاروں کی تفصیلات کو دوسروں تک پہنچانے اور ذہن نشین کرا دینے کیلئے مجبور کرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جس طرح اس نے اس خیال سے لطف اٹھایا ہے اسی طرح اس کے دوسرے ہم جنس بھی اس سے لطف اٹھائیں۔ چنانچہ وہ اس کو دوسروں تک بہتر سے بہتر انداز میں پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہانی بھی انسان کی تخلیق کا ایک پہلو ہے۔ جو ادب میں شامل ہے اور ادب میں شامل ہونے کی وجہ سے فنونِ لطیفہ میں ایک ممتاز مرتبے کی مالک ہے۔

لیکن ابھی کہانی کی فنی اور ادبی حیثیت سے بحث نہیں۔ ابھی تو دیکھنا یہ ہے کہ اُن دنوں اس کی صورت کیا تھی۔ اور وہ اپنے ابتدائی سفرِ ارتقا میں کن منزلوں سے گزر رہی تھی۔ علم الاصنام یا دیومالا کے تحت جو کہانیاں لکھی گئیں۔ وہ انسان کی ذہنی تخلیق کی بہت قدیم یادگاریں ہیں۔ اس کے بعد وہ دور ہے جب انسان کی عقل زیادہ کام کرنے لگی تھی۔ اس نے بہت سی ایسی چیزوں کا پتہ لگا لیا تھا جو اب تک اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھیں۔ یعنی اُس نے جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کی بجائے اب غلہ پیدا کرنے کا طریقہ جان لیا تھا۔ اس نے نیچر کی مختلف چیزوں کے متعلق آگاہی حاصل کر لی تھی۔ اس پر فطرت کے بہت سے اسرار و رموز بے نقاب ہو گئے۔ اس زمانے میں اس نے رہنے سہنے کا ایک نظام بھی بنایا تھا جس کی وجہ سے اب اس کے ماحول میں روز بروز پیچیدگی آتی جا رہی تھی۔ اس نظام کی پیچیدگی کے باعث اب کچھ ایسی گتھیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں، جن کو سلجھائے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ اور اس کے لئے اس کو طرح طرح کے ذریعے نکالنے پڑتے تھے۔ چنانچہ کہیں لڑائیاں ہوتی تھیں اور کہیں دوسرے طریقوں سے یہ مسائل طے ہوتے تھے۔ اس دور کی خاص چیز ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش اور ہوسِ ملک گیری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی کہانیوں میں جنگ وغیرہ کے موضوعات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ان میں مافوق الفطرت عناصر کو دخل ضرور ہے کیونکہ ابھی انسان کا شعور اس کو رد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ ان جنگوں کی داستانوں کے بیانات میں غیبی طاقتوں کو بڑا دخل ہے لیکن بہر حال یہ دور انسانوں کے متعلق کہانیاں لکھنے کا دور ہے۔ رامائن اور مہابھارت ایلیڈ اور اوڈیسی وغیرہ اس دور کی خاص چیزیں ہیں۔ جس کا سلسلہ الف لیلیٰ اور اسی طرح کی دوسری کہانیوں پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ان کہانیوں کا موضوع اگرچہ انسان اور اس کی زندگی کا مدوجزر ہے لیکن بیچ بیچ میں کہیں جادو کا ذکر ملتا ہے۔ کہیں جن و پری اور بھوت پریت وغیرہ کے اثرات بھی کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کہانی کی ابتدائی حالت پر یہ طائرانہ نظر بتاتی ہے کہ انسان نے شروع ہی سے اس میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور اس کی ترقی کی رفتار سے اس صنعت کی رفتار ترقی بھی ہم آہنگ رہی۔ انسانی زندگی نے جتنے پہلو بھی بدلے۔ جس قدر رخ بھی اختیار کئے جتنی تیزی سے وہ آگے بڑھتی رہی، اسی قدر اور اتنا ہی کہانی بھی آگے بڑھتی گئی۔ انسان کو جب بولنا نہیں آتا تھا۔ تو وہ اشاروں میں کہی جاتی تھی۔ جب اس کو لکھنا نہیں آتا تھا تو وہ آوازوں کے ذریعے ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی تھی۔ اور انسانوں کے دماغوں میں محفوظ رہتی تھی۔ جب اس نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ تو وہ بھی لکھ کر ایک دوسرے تک پہنچائی جانے لگی۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ جب انسان میں ادب پیدا کرنے کا شعور پیدا ہوا تو کہانی نے بھی ایک ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔

ادبی صنف کی حیثیت سے کہانی ایک خاص مرتبے کی مالک ہے۔ اور اس کی قدامت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ جس وقت سے انسان نے ادب پیدا کرنا اور اس کو لکھ کر محفوظ کرنا شروع کیا، اسی وقت سے کہانی کا پتہ چلتا ہے۔ یونان، روم، مصر، بابل، چین، ایران، ہندوستان، غرض یہ کہ قدیم تہذیب و تمدن کے تمام گہواروں میں کہانی کی صنف ادب میں پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ البتہ اس کی صورت قریب قریب، ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہی۔ اور اپنے اپنے دور کے مخصوص رجحانات اس پر اثر انداز ہوتے رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں

ہمیں اس وقت کی کہانیوں میں بے نقاب ملتی ہیں۔ ہم ان کو پڑھ کر اس وقت کے سماج کے افراد کے ذہنی رجحانات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ ان کے رہن سہن، رسم و رواج، آداب معاشرت، ان تمام چیزوں سے ہمیں واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ شروع شروع میں شاعری کے اندر لمبی لمبی رزمیہ نظموں میں ہمیں کہانی کے عناصر ملتے ہیں۔ یونان میں ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی، اور ہندوستان میں بالمیکی کی رامائن اور ویاس کی مہابھارت میں اسی طرح کی کہانیاں ملتی ہیں۔ جن میں اس وقت کی تہذیبوں کے دلوں کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔

شاعری میں جو کہانیاں، ادھر ادھر بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ان سے قطع نظر، آگے چل کر کہانی ایک مستقل فن کی حیثیت سے ملتی ہے۔ کہانی کہنا اور سننا تو ایک زمانے سے رائج تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو ویروں اور بہادروں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ اس خیال سے کہ دلوں میں ایک طرف تو شجاعت اور بہادری کے جذبات بیدار ہوں اور دوسری طرف ان کا دل بہلے۔ ایک دوست دوسرے دوست سے دل بہلانے اور وقت کاٹنے کی غرض سے کہانیاں کہتا تھا۔ لیکن داستان گوئی کو ایک فن کی حیثیت سے اس جاگیردارانہ اور سامنتی، دور کے درباروں نے پیدا کیا، جن کا وقت کسی طرح کٹتا ہی نہ تھا۔ چنانچہ جہاں وہ اور بہت سی عیاشیاں کرتے تھے وہاں داستانوں اور کہانیوں سے بھی اپنا دل بہلاتے تھے۔ اور چونکہ درباروں میں اس کو باریابی حاصل ہو گئی تھی۔ اس لئے ایک سے ایک مشاق داستان گو بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جن کی چرب زبانی، تخیل کی بلند پروازی، طبیعت کی ہمہ گیری، ذہانت، ظرافت، اور شوخی سے کسی صورت میں بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ یہ لوگ درباروں میں کہانیاں سناتے تھے، اور ان میں سے بعض انہیں لکھ بھی ڈالتے تھے۔ چنانچہ ادب میں داستانوں کا بھی اچھا خاصا دفتر ملتا ہے۔ جو اور کسی خصوصیت کی مالک ہوں یا نہ ہوں، دلچسپ ضرور ہیں۔

داستان گوئی کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں اگرچہ انسانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان پر بیتی ہوئی مختلف کیفیات کے نقشے کھینچے جاتے ہیں۔ ان کے جذبات و احساسات کی ہو بہو تصویریں بنائی جاتی ہیں، لیکن ان سب کے پیش کرنے میں مبالغہ آرائی کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ باشعور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ داستان گوئی مبالغہ آرائی کے بغیر ایک قدم تک آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ اس میں ایسے ملکوں کا تذکرہ ہوتا ہے جس میں تخیل کے سوا کسی دوسرے کا گذر نہیں ہو سکتا۔ کہیں زمین آسمان سونے کے بن جاتے ہیں۔ کہیں انسان جانور کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں معجزات ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جن، پری، بھوت، پریت کے ہاتھوں آن کی آن میں دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ داستانیں جس زمانے کی پیداوار ہیں اس میں تکلف، تصنع، بناوٹ، تخیل پرستی، اور مبالغہ آرائی کے عناصر پوری طرح گھلے ملے تھے۔ اور اس کی وجہ صرف ایک خاص قسم کا نظام تھا۔ ایک خاص قسم کی تہذیب تھی جس کی بنیادیں سائنٹیفک اصولوں پر قائم نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے اس زمانے کے آرٹ میں بھی کسی قسم کے سائنٹیفک نقطۂ نظر کا پتہ نہیں چلتا۔ بہر حال اسی نظام نے داستان گوئی کو ایک فن بنا دیا۔ جو کہانیوں کے ارتقا میں ایک کڑی کی حیثیت سے بڑی اہمیت کی مالک ہے اور جس نے مشرقی افسانہ نگاری پر بے پناہ اثرات کئے ہیں۔

یوں تو قدیم ادب میں اس قسم کی بے شمار داستانیں ملتی ہیں۔ لیکن ہمارے مشرقی ادبیات میں الف لیلے کی مختلف کہانیوں کو اس سلسلے میں جو مرتبہ حاصل ہوا، وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکا۔ الف لیلے کی ساری کہانیاں ان تمام خصوصیات کی حامل ہیں۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے فن کار کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے قدم قدم پر اس کے اندر دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بہت کامیاب ہوا ہے۔ الف لیلے کے علاوہ جو دوسری داستانیں آگے بڑھ کر لکھی گئیں اُن میں کسی حد تک کچھ کہنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ان کا مقصد صرف دلچسپی پیدا کرنا ہی نہیں رہ گیا ہے بلکہ ان کے فن کاروں نے ان داستانوں کے ذریعے زندگی کے بعض اہم بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً کلیلہ و دمنہ، انوار سہیلی یا پھر سعدی کی لکھی ہوئی داستانیں ان سب

میں نہ صرف اس زمانے کی حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ مختلف لوگوں اور مختلف طبقوں کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے کی تدابیر پیش کی گئی ہیں۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کہانیوں کو پڑھ کر انسانی زندگی کی شاہراہ پر زیادہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ اس قسم کی داستانوں کا رواج نہ صرف مشرق میں ہوا بلکہ مغرب میں بھی ایک زمانے تک ان کا دور دورہ رہا۔ وہاں بھی سامنتی اور جاگیردارانہ نظام نے داستان گوئیوں کو پیدا کیا۔ وہ درباروں میں اپنی داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلاتے رہے۔ اور ان کے لئے ذہنی تعیش کا سامان فراہم کرتے رہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ان کا بازار کسی حد تک سرد پڑ گیا۔ داستان گوئی اس طرح مغرب میں نہیں چل سکی جس طرح مشرق میں چلتی رہی۔ بات یہ تھی کہ مغرب کے لوگوں میں اس فن کارانہ اور صناعانہ شعور کی زیادتی تھی۔ آب وہوا کے اثرات نے ان کی طبیعتوں میں جولانی کے عنصر کو بھی مشرقیوں سے کہیں زیادہ کر دیا تھا۔ مشرقی جہاں گوشہ نشینی، عزلت گزینی، اور تھک کر بیٹھ جانے کو انسانیت کی معراج خیال کرتے تھے، وہاں مغربیوں کے نزدیک زندگی کے ہر شعبے میں ایک آگے بڑھ جانے والی کیفیت کی کارفرمائی ضروری تھی۔ وہ اسی کو زندگی سمجھتے تھے۔

مغرب کی اسی خصوصیت نے اس کو بہت زیادہ عرصے تک داستان گوئی سے وابستہ نہیں رکھا۔ مختلف قسم کی کہانیاں اگرچہ اب بھی چلتی رہیں لیکن ادبیات کی دنیا میں اب داستانوں اور کہانیوں کو ناول کا روپ دے دیا گیا۔ جو فنی اعتبار سے بالکل ایک نئی چیز تھی۔ اور جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کرتی گئی۔

ناول کی صنف ادب اگرچہ کہانی ہی ہوتی ہے لیکن مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے، وہ داستان گوئی سے بالکل مختلف ہے۔ داستان گوئی کی بنیادیں تصنع، تکلف، بناوٹ اور مبالغہ آرائی پر قائم تھیں اور بعید از قیاس باتوں کے بیانات ہی کو ان کے فن کار اپنے اپنے فنوں کی معراج خیال کرتے تھے۔ اور ایک خاص سماج کے افراد، فن کا ذوق، فن کا احساس جمال، فن کی افتاد طبع فن کا ذہنی رجحان، ایک مخصوص ماحول میں پرورش یافتہ ہوتے تھے۔ ان کو اسی قسم کی چیزوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی ہوتی تھی۔ ناول میں بھی اگرچہ شروع شروع میں کم وبیش یہی خصوصیات غالب رہیں، لیکن اس کی ابتدا، انسان کے اندر ایک بڑھتے ہوئے صناعانہ اور فن کارانہ شعور کا پتہ ضرور دیتی ہے۔ اس کا وجود اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اس کو انسان کے ایک بدلتے ہوئے ماحول ایک بدلتی ہوئی سماجی حالت، ایک بدلتے ہوئے ذوق، اور ایک بدلتے ہوئے احساس جمال نے پیدا کیا۔

جو خصوصیات ناول کے فن کاروں نے اس میں پیدا کرنی چاہئیں۔ وہ مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے نئی اور ساتھ ہی ساتھ بڑی اہم ہیں۔ مواد کے اعتبار سے سب سے بڑی تبدیلی تو یہ ہوئی کہ اس کو زندگی سے زیادہ قریب لایا گیا۔ اس میں اصلیت، حقیقت اور واقعیت کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔ توہم پرستی اور بعید از قیاس باتوں کے عناصر اگرچہ اب بھی کہیں کہیں نظر آتے رہے لیکن ان کو بھی حقیقت و واقعیت کے ساتھ اس طرح شیر وشکر کر کے پیش کیا گیا کہ وہ داستانوں کی طرح باشعور انسانوں کے اذہان پر گراں نہ گزریں۔ واقعات اب جن پری، بھوت پریت وغیرہ کی بجائے انسانوں کے عام طبقوں کی زندگی سے لئے جانے لگے۔ اب پڑھنے والوں نے خود اپنی زندگی اور اس کے مد وجزر کی تصویریں چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی دیکھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں مہماتی اور ہیجانی زندگی کے واقعات کو زیادہ دخل رہا جو دلوں میں ایک ہنگامہ برپا کر دینے کے ساتھ ساتھ اس وقت کے سماج کے افراد کے لئے زیادہ دلچسپ ہوتے تھے۔ اور وہ کم وبیش انہی خصوصیات کے حامل تھے۔ جو رزمیہ شاعری کی خاص چیزیں تھیں چنانچہ فیلڈنگ تک نے ناول کی تعریف یہی کی کہ وہ ایک ایسی رزمیہ ہے (Prose Epic) جو نثر میں لکھی گئی ہو۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں زیادہ تنوع، زیادہ ہمہ گیری، اور زیادہ وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اب کہیں اس میں حسن وعشق کی پیچیدہ داستانوں کا بیان ہونے لگا۔ کہیں انسانی زندگی کے دوسرے جذبات واحساسات کی تصویریں کھینچی

جانے لگیں۔ کہیں بادشاہوں، راجاؤں، اور امیروں کی زندگی کے نقشے بنائے جانے لگے۔ اور کہیں پامال انسانوں کی زبوں حالی، بے بسی، اور کس مپرسی پر خون کے آنسو بہائے گئے۔ پہلے وہ صرف دلچسپی کے لئے تھا لیکن حالات و واقعات کے تقاضوں نے اب اس کے اندر افادیت کا رنگ بھی بھرنا شروع کیا۔ چنانچہ ناول کے فن کاروں نے اس سے ایک سماجی ہتھیار کا کام لیا۔ اور اپنے اپنے اقوام و ممالک کے لوگوں کو جگانے، جھنجھوڑ کر اٹھانے اور ایک نئی روح پھونک دینے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ فنی اعتبار سے بھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اب صرف داستان اور داستان میں تحیر کے احساس کو پیدا کرنے کی خواہش ہی کوئی خاص چیز نہیں رہ گئی بلکہ دوسرے لوازمات سے بھی اس میں دلچسپی پیدا کرنے والے عناصر کو سمویا گیا۔ پلاٹ میں سادگی کے بجائے اب کچھ زیادہ پیچیدگی آچلی۔ ایک کہانی میں کئی کئی کہانیاں پیدا کی گئیں۔ اکثر جگہ پلاٹ سے زیادہ کردار نگاری پر زور دیا گیا۔ اور اسی طرح ناول کے قدم ترقی کی شاہراہ پر برابر آگے کی طرف بڑھتے رہے۔

دنیا میں ناول کے تحت جو ادب پیدا کیا گیا، اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے سب سے زیادہ ترقی انتشار و پریشانی کے زمانے میں کی۔ بات یہ ہے کہ سماجی انتشار و پریشانی کے زمانے میں، بڑی شخصیت رکھنے والے ادیبوں کا شعور اپنے فن میں زیادہ زندگی پیدا کر لیتا ہے۔ ایسے زمانے میں سب سے زیادہ جو چیز ان کے پیش نظر رہتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات سماج کے افراد پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہوں۔ اس لئے وہ اول تو اپنے وقت کے سماجی مسائل کو اس میں زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے ان کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کا خیال، ان فن کاروں کو اس بات کیلئے مجبور کرتا ہے کہ فنی اعتبار سے وہ اپنی تخلیقات اور سماج کے افراد کے ذہنی رجحانات اور افتاد طبع میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کریں۔ تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناول کی انتہائی ترقی کا زمانہ ہر ملک میں وہی ہے جس میں سماجی کشمکش کے اثرات نمایاں تھے۔ فرانس میں ناول نے سب سے زیادہ ترقی، انقلاب سے قبل یا انقلاب کے فوراً بعد کی بالزک، فلابرٹ، وکٹر ہیوگو، اناطول فرانس اور زولا وغیرہ کے کارنامے اس بیان پر صداقت کی مہر لگاتے ہیں۔ روس میں ٹالسٹائی، گوگل، ترجنیف، چیخوف، اور گورکی وغیرہ نے جو ناول لکھے۔ وہ سماجی کشمکش ہی کے زمانے میں لکھے۔ ہندوستان میں سرت چندر چیٹرجی، بنکم بابو، نذیر احمد، اور پریم چند وغیرہ کے ناول اس اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ اسی طرح انگلستان، امریکہ، جرمنی، اور دوسرے ممالک میں بھی ناول نگاری نے ایسے ہی زمانوں اور ایسے ہی ماحول میں زیادہ ترقی کی۔

آج ناول کو سب سے زیادہ کامیاب سماجی ہتھیار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اپنے مخصوص خیالات و نظریات کا پرچار اس سے بہتر کسی اور صنف ادب کے ذریعے ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اول تو سماج کے افراد اس سے دلچسپی لیتے ہیں اور دوسرے چونکہ اس کے دامن میں سخت سے سخت اور خشک سے خشک، مسائل تو دل خوش کن پیرائے میں سمویا جاسکتا ہے، اس لئے پڑھنے والا ان سے اکتاتا نہیں۔ برخلاف اس کے اس کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج دنیا بھر کے عام باشعور ادیب اس کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ کام لے رہے ہیں۔ ویلز، پرل بک، الکسی ٹالسٹائے، الیا اہرنبرگ، ٹامس مان، ہالٹر سنکلیس، ہنری بارٹس اور کرشن چندر وغیرہ کی تخلیقات اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی مالک ہیں۔ ان ناول نگاروں اور اسی طرح کے دوسرے ناول نگاروں نے نہ صرف اپنے اپنے ملکوں کی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں بلکہ اپنے وقت کے بیسیوں سماجی مسائل کا حل تلاش کیا اور عوام کے اندر ایک ایسا شعور پیدا کرنے کا خیال ان کے دل سے ایک لمحے کے لئے بھی دور نہیں ہوا ہے۔ جس سے وہ اپنے وقت اور ماحول کے سماجی مسائل کی گتھیوں کو سمجھیں اور سمجھ کر ان کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ مواد اور ہیئت میں ایک تناسب اور ہم آہنگی کے خیال نے ان کو اس بات کے لئے بھی مجبور

کیا کہ وہ فنی اعتبار سے بھی اپنی تخلیقات میں تبدیلیاں کریں۔ چنانچہ ناول کی ہیئت اور ٹکنیک میں اسی طرح کی بیسیوں تبدیلیاں عمل میں آچکی ہیں، آ رہی ہیں، اور آئندہ آتی رہیں گی۔

فن کارانہ شعور نے جہاں ناول کی ہیئت اور ٹکنیک میں تبدیلیاں کیں، وہاں اسی کے تحت دوسری اصناف ادب کو بھی پیدا کیا۔ جس میں سب سے زیادہ اہم کہانی کی وہ صورت ہے۔ جس کو مختصر افسانہ کہتے ہیں اور جس نے پیدا ہو کر نہ صرف پڑھنے والوں کے دلوں کو موہ لیا ہے اور اپنی دھاک بٹھا دی ہے۔ بلکہ ناول کا بازار بھی بڑی حد تک سرد ہو گیا ہے۔ اور اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو مختصر افسانے کی صنفِ ادب کے وجود میں آنے سے قبل تھی۔

مختصر افسانے کو حالات و واقعات کے تقاضوں نے پیدا کیا۔ ناول، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، ایک جاگیردارانہ ماحول اور سرمایہ دارانہ نظام میں زیادہ آسانی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس ماحول میں لوگوں کے پاس زیادہ وقت تھا، زیادہ سکون تھا، زیادہ فرصت تھی، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگی کے لمبے لمبے دنوں کو کس طرح کاٹیں۔ چنانچہ ان کو کاٹنے کے لئے ان کو ایسی چیزوں سے لَو لگانے کی ضرورت پڑتی تھی، جس میں ان کے وقت کا زیادہ سے زیادہ صرف ہو سکے۔ اس کے لئے ناول سے بہتر کوئی دوسری صنف ادب نہیں ہو سکتی تھی۔ جب انسان عیش و عشرت کے سائے میں امن و سکون کے درمیان زندگی کے دن گزارتے تھے۔ اس وقت وہ ایسی ہی چیزوں سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ لیکن جب حالات بدلے، زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ زمانے میں ایک انقلاب ہوا۔ تو یہ صورتِ حال بھی باقی نہ رہ سکی۔ جاگیردارانہ دور نے جب دم توڑا، تو اس کی جگہ ایک صنعتی دور نے لے لی۔ بڑے بڑے کارخانے کھلے، انسان اب اپنے محلوں سے نکل کر کارخانوں اور ملوں کی دنیا میں آگیا۔ بیکاری ختم ہو گئی۔ عیش و عشرت کاہلی اور سستی ــــ ان سب کا زمانہ ختم ہو گیا۔ انسان کے پاس اب وقت کی کمی تھی۔ وہ اب دن بھر اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اور کام کے بعد اس قدر تھک جاتا تھا کہ زیادہ دیر تک وہ دماغی اور ذہنی باتوں سے دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن یہ چیزیں ادبی ذوق کو ختم نہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ انسان کے اندر اس کا ہونا بالکل فطری ہے۔ چنانچہ اس کے اس ماحول نے ادبی ذوق کو تو ختم نہیں کیا البتہ ادبی اصناف میں تغیّر ضرور پیدا کر دیا۔ اور اس کو ایک ایسی شکل دے دی، جو اس کے ماحول، ذہنی کیفیات، اور افتادِ طبع سے ہم آہنگ ہو سکے۔ مختصر افسانے کو انہیں حالات نے پیدا کیا۔ اور چونکہ وہ صنعتی دور میں رہنے والے انسان کی طبیعت اور مذاق سے ہم آہنگ تھا، اور اس کے پڑھنے میں کم وقت بھی لگتا تھا۔ اس لئے اس نے ہر ایک کے دل میں گھر کر لیا۔ اور بڑی سُرعت کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔

لیکن یہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آخر ناول اور مختصر افسانے میں فرق کیا ہے؟ بظاہر جو سب سے بڑا فرق نظر آتا ہے وہ تو یہی ہے کہ ناول بہت زیادہ طویل ہوتا ہے اور مختصر افسانہ مختصر، لیکن اس کے علاوہ بھی مختصر افسانہ باعتبار ہیئت اور ٹکنیک کے ناول سے بالکل مختلف ہے۔ موضوع دونوں کا انسانی زندگی ہی ہے۔ لیکن ناول زندگی کے جزئیات کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس کے ایک ایک لمحے کی کیفیت کو اپنے اندر سموتا ہے، زندگی کے سارے نشیب و فراز کو پیش کرتا ہے۔ مختصر افسانے میں برخلاف اس کے انسانی زندگی کے کسی ایک واقعے، کسی ایک جذبے اور کسی ایک کیفیت کی تصویر ہوتی ہے جس میں رمزیت کا عنصر افسانے میں بھر دیتا ہے۔ فن کار کے اشاروں ہی میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ جتنا ہی غور کرتے جائیے۔ اس میں نئے نئے پہلو پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ساری انسانی زندگی کی تصویر نہیں ہوتی۔ ناول میں کردار نگاری کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ لیکن مختصر افسانہ کردار کی کسی ایک کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ جس سے اس کے عادات و اطوار اور افتادِ طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن کردار کا پورا تجزیہ آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ ناول مختلف طرح کے اثرات انسان کے ذہن پر چھوڑتا ہے۔ لیکن مختصر افسانے کے اندر تاثر کی وحدت کا ہونا ضروری ہے۔ پڑھنے والا اس کو پڑھ کر تو

کے صرف چند ہی منٹ ہیں۔ لیکن ان چند منٹ کے بعد گھنٹوں اس پر غور کرتا رہتا ہے۔ اور غور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر حقیقتاً یہ خصوصیات کسی مختصر افسانے میں ہیں۔ تب تو اس کا فن کار کامیاب ہے، ورنہ نہیں۔ تحیر کا احساس پیدا کرنا اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہونی چاہئے۔ اور تحیر کے اندر اس کی کیفیت کو شروع سے آخر تک برقرار رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس خصوصیت کے ساتھ آخر میں فنکار اپنی کہانی کو کچھ اس طرح ختم کرتا ہے۔ کہ پڑھنے والا کتاب بند کر کے کچھ سوچنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے، اس کو خیالات کے سمندر موجیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مختصر افسانے کے اندر اس خوبی کا پیدا ہونا ازبس ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ مختصر افسانہ زیادہ باتوں کو کم جگہ میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے اگر اس کا فنکار اشاروں کے ذریعے ان چیزوں کو پیش نہ کرے گا۔ اور اس کے بیان میں رمزیت کے عناصر نہ ہوں گے تو اس کو زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔

مختصر افسانہ طویل سے طویل بھی ہو سکتا ہے اور مختصر سے مختصر بھی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ جن کا بیان اوپر کیا گیا ہے۔ مثلاً مختصر سے مختصر تو ایک یہ بھی ہو سکتا ہے، جس کا لکھنے والا اگرچہ غیر معروف ہے لیکن جو شہرت کا مالک ہے۔ یعنی ایک شخص نے ریل کے ایک ڈبے میں اپنے ہمسفر سے یہ پوچھا۔ کہ آیا وہ بھوتوں کا قائل ہے یا نہیں؟ ہمسفر نے جواب دیا "بالکل نہیں"۔ اس نے کہا۔ "کیا سچ مچ"۔۔۔ اور یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ اس سے زیادہ مختصر کہانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے اندر جو وسعت ہے اور جو فنی گہرائیاں اور خوبیاں ہیں ان کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ اسی طرح طویل افسانے بھی مختصر افسانے کے تحت شمار کئے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے اندر وہ تمام فنی خوبیاں موجود ہوں جو مختصر افسانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے طویل افسانے لکھے گئے ہیں۔ جن کو "طویل مختصر افسانہ" کہا جاتا ہے اور جس نے اب بذات خود ایک صنف ادب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ موجودہ زمانے میں کہانی کی اس صنف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اور اس کی مقبولیت بھی عالمگیر ہے۔ آج کے چیدہ ادیبوں میں پہنچنے والا افسانہ، جس قدر اس صنف ادب سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کا اندازہ ان رسائل و اخبارات سے ہو سکتا ہے جن کی کوئی اشاعت مختصر افسانوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کی اسی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر بہت سے افسانہ نگاروں نے اس میں اپنے وقت کے سماجی مسائل کو سمو کر، ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور سماج کے افراد کو اپنے پیش کردہ نظریات کی شاہراہ اصول پر چلانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ آج جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان میں افادیت سب سے زیادہ پیش پیش ہے۔ اور آج ہی پر کیا منحصر ہے، جس وقت سے مختصر افسانہ وجود میں آیا اسی وقت سے اس میں اس چیز کی فراوانی ملتی ہے۔ قریب قریب اسکے ہر فنکار نے اپنے فن کے ذریعے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی پیغام دینا چاہا ہے۔ اور یہ بات بھی عجیب ہے کہ مختصر افسانہ قریب قریب ہر ملک میں اس وقت اپنے عروج پر نظر آیا ہے جب فنکاروں نے شعوری طور پر سماج کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے، اور جبر و استبداد کے آہنی پنجوں سے چھڑانے کا خیال کیا ہے۔ فرانس میں انقلاب سے قبل یا انقلاب کے فوراً بعد ہی بڑے افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ جن کی شہرت فرانس سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ بالزاک، فلابرٹ، اور موپاساں وغیرہ کے نام آج محتاج تعارف نہیں۔ روس میں ٹالسٹائی، ترجنیف، چیخوف، گورکی، ایلیا اہرنبرگ اور شولوخوف وغیرہ نے اس صنف میں جو چار چاند لگائے ہیں۔ اس میں بھی ان کے ماحول اور ان کے شعور کو بڑا دخل ہے۔ اب چین میں اچھے افسانہ نگار پیدا ہو رہے ہیں۔ اور آج ہندوستان میں بھی جب وہ ایک مستقل اور مسلسل کرب کے عالم میں مبتلا ہے اچھے افسانہ نگار پیدا ہو رہے ہیں۔ اور اچھا افسانوی ادب پیش کیا جا رہا ہے۔ کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی، احمد ندیم، حیات اللہ، احمد علی اور اسی طرح کے دوسرے لکھنے والوں کے ہاتھوں جس افسانوی ادب کی تخلیق ہوتی ہے وہ صحیح معنوں میں دونوں اعتبار سے بڑی اہمیت کا مالک ہے اور جسکو دنیا کے بڑے سے بڑے ملک کی افسانہ نگاری کے دوش بدوش رکھا جا سکتا ہے۔ ان سب کے یہاں افادیت بھی ہے اور فنی خوبیاں بھی!

دیکھنا یہ ہے کہ کہانی نے وقت کے ساتھ، حالات و واقعات کے تقاضوں سے کتنے روپ بدلے ہیں۔ زندگی اب بھی بدل رہی ہے۔ بدلتی جا رہی ہے اور اسی طرح کہانی بھی بدلتی جائے گی۔ کون جانے کہ آئندہ وہ کونسی کروٹ لے گی۔

دیوندر ستیارتھی

اگلے پڑاؤ کی طرف ...

خانہ بدوش رقاصہ کی پائل کی جھنکار اُس کی روح کی گہرائیوں میں چھنک رہی تھی۔ یکے پر بیٹھے بیٹھے اُس نے سڑک کا جائزہ لیا۔ اور پھر اُس رقاصہ کا تجزیہ کرنے لگا۔ وُہ ابھی انجان ہے۔ جانے کس سانچے میں ڈھالی گئی تھی یہ پتلی۔ اُس کا نام 'الکا'، نہ ہوتا تو شاید مجھے اُس کا رقص پسند نہ آتا۔ میں اُس کا رفیقِ کار بن جاؤں تو اُس کا فن چمک اُٹھے۔ اُس نے اپنا فن اپنی ماں سے دودھ کے ساتھ حاصل کیا ہوگا۔ اُس کا بھائی طبلہ بجاتا ہے اور بڑھیا ماں جو اپنے زمانے میں اچھی نرتکی رہی ہوگی، جھانجھ بجایا کرتی ہے۔ اور وُہ نندن مہاراج؟ —— اُس کا ہارمونیم ماسٹر تو اُسے سُلجھے ہوئے مذاق کی چیزیں بتانے سے قاصر ہے۔ کاش وُہ نندن مہاراج کو چھٹی دے دیتی اور ہمیشہ میرے رباب پر ناچتی۔

ایک پڑاؤ —— دوسرا پڑاؤ —— اور اب وُہ مایوس ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک ہی جست میں تیسرے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ یکے والے نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ اب وُہ لوگ وہاں ضرور مل جائینگے۔

وُہ یکے والے پر اپنا رنگ جمانے لگا —— "چھ راگ ہیں۔ اور چھتیس راگنیاں۔ پھر ان راگنیوں سے نکلی ہوئی اور راگنیاں بھی ہیں۔ اِن راگنیوں کے کئی کئی بیٹے اور کئی کئی پوتے ہیں۔ راگوں کا خاندان بہت پرانا ہے۔ سمندر ہے سمندر۔ کون تھاہ پائے گا بھلا۔ ہر راگ کی اپنی تصویر ہے، اپنی تاثیر ہے، ارے میاں، تم نے بھیروں تو نہ سُنا ہوگا۔ اسے سُن کر تو جنگل کے ہرن بھاگے چلے آتے ہیں۔ تان سین نے دیپک گایا تھا اُس کی روح سُلگ اٹھی تھی۔ اور تانی نے میگھ گا کر اُسے پھر جیون بخشا تھا۔ ارے میاں میگھ کے اثر سے تو بادل گھِر آتے ہیں اور بارش ہونے لگتی ہے۔ دیپک گا کر تو دیئے بھی جلائے جا سکتے ہیں آج کل تو ایسے راگی نظر نہیں آتے۔ لیکن میاں جی، تلاش کرو تو مِل بھی سکتے ہیں۔ سنگیت کے علاوہ وُہ نرت سے متعلق بھی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن جھٹ الکا کی تصویر اُس کے سامنے آگئی اور باتوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے الکا پوچھنا چاہتی ہو کہ تمہیں پیلو میں بہار کے سُر اچھے لگتے ہیں یا نہیں۔ اری بھولی، وُہ کس کو اچھے نہیں لگتے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے دو عطر ایک ہی شیشی میں بھر دیئے جائیں۔ من ہی من میں اُس نے الکا کو بتایا کہ وُہ کئی بار سات رنگ کے شربت پی جاتا ہے اور اُس کے سینے میں قوس قزح سی بن جاتی ہے۔ اُسی طرح جیسے وُہ اپنے ناچ میں ساتوں رنگ بھرتی چلی جاتی ہے۔ وُہ اُسے یہ بھی سمجھا چکا تھا کہ نغمے کا تعلق کانوں ہی سے نہیں ہوتا۔ اِسے ہم چھو بھی سکتے ہیں، چکھ بھی سکتے ہیں اور چاہیں تو سونگھ بھی سکتے ہیں۔ اور جیسے ان سب باتوں کے جواب میں وُہ کہہ اُٹھی —— ماسٹر جی، نندن مہاراج نے تو کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔"

یکے والے نے اُس کے رباب کی طرف گھُورتے ہوئے کہا: "آپ بھی کوئی بیجو باورا ہونگے۔"

رادھے شیام نے جیسے خواب سے چونک کر یکے والے کی طرف دیکھا۔ اُسے خوشی ہوئی کہ یہ معمولی دیہاتی بھی بیجو باورے کی کہانی جانتا ہے۔ وُہ اُسے بتانا چاہتا تھا کہ بیجو باورا آج بھی زندہ ہے۔ ودیا کا بیج ناش تو نہیں ہوتا۔ ہاں بھائی، آج بھی بیجو باورے اور تان سین میں مقابلہ ہو سکتا ہے اور آج بھی تان سین ہی کو مُنہ کی کھانی پڑے گی۔

یکے والا پھر بولا: "کیوں جی، جب وُہ چھوکری ناچتی ہوگی۔ تو اُس کے بالوں کی لٹیں اُڑ اُڑ کر گالوں کو چھُونے لگتی ہوں گی۔"

رادھے شیام نے نہ جانے کیا سوچ کر کہہ دیا: "کل رات تم بھی الکا کا ناچ دیکھتے تو یکہ چلانا چھوڑ کر عمر بھر اُسی کے پیچھے گھومتے رہتے۔"

یکے والے نے للچائی ہوئی آواز میں کہا: "آج کل سا ہے خوب چمکتے ہیں اور ان لوگوں کی تو چاندی ہے۔"

رادھے شیام چاہتا تھا کہ یکے والے کو ڈانٹ کر کہے کہ بس بس میاں۔ تم کیا جانو الکا کیسے کیسے ناچ ناچتی ہے۔ لیکن اُس نے کچھ رُک کر

جواب دیا: "ہاں ہاں، میاں جی، تم سب ٹھیک کہتے ہو۔"

باتوں کا تسلسل پھر ٹوٹ گیا۔ رادھے شیام سوچنے لگا کہ اُس کے آبنوسی رنگ سے ہر اک کو نفرت ہے اور اُس کے بھدّے خدوخال ہمیشہ اُس کی کامیابی میں سدِّ راہ رہے ہیں۔ اُس وقت اُسے اپنی مینا یاد آنے لگی۔ وہ سکول سے لوٹتا تو مینا چہک اُٹھتی، جیسے کہہ رہی ہو —— بھلے آئے، ماسٹر جی، صبح سے رباب سننے کو جی چاہ رہا ہے۔ ذرا دو تار چھیڑ دو۔ پھر اُسے اپنی پالتو بلی کی یاد آئی جو اُس کے پاؤں سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ مینا کیا سوچتی ہوگی؟ بلی اُداس سُروں میں میاؤں میاؤں کرتی پھرتی ہوگی؟ اب میں کبھی نہیں لوٹوں گا۔ لڑکے تو خوش ہوں گے کہ ایک ظالم کے پنجے سے چھٹکارا ملا۔ لیکن مینا جانتی ہے کہ میں دراصل اُنہیں کیوں پیٹتا تھا۔ اور پھر جیسے چونک کر اُس نے یکّے والے کی طرف دیکھا جو گھوڑی کو دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ وہ اُسے بتا دینا چاہتا تھا کہ جب الکا ناچتی ہے تو اُس کا انگ انگ جھنجھنا اُٹھتا ہے۔

"آج کل سا ہے خوب چمکتے ہیں۔" اُس نے دل ہی دل میں کہا، لیکن مجھے کون اپنی لڑکی دے گا؟ میری عمر کے لوگ تو پانچ پانچ بچوں کے باپ ہیں۔ میرے سکول میں کسی بھلے آدمی نے اپنی لڑکی کی چھٹی ڈالنا پسند نہیں کی۔ اب اگر میرا رنگ آبنوسی ہے تو میرا کیا دوش؟ میں شکل و شباہت سے حبشی معلوم ہوتا ہوں تو اس میں میری کیا خطا؟ مینا جانتی ہے کہ مجھے پے در پے ناکامیاں ہوئی ہیں۔ اور اپنی ناکامی کی رو میں، میں لڑکوں کو پیٹتا ہوں۔ اُس سے باتیں کرتے ہوئے بیوی کی کمی کو پورا کر لیتا ہوں۔ جب کبھی مینا کسی تیکھے سُر میں چہک اُٹھتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کہہ رہی ہو —— ماسٹر جی، میں جانتی ہوں کہ تمہارے سپنے بیچ ہی سے ٹوٹ چکے ہیں اور تم رباب بجا کر خود کو یقین دلانا چاہتے ہو کہ نغمے کی دُنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ....

ہو ہو ہو۔ اُس نے ایک پاگل کی طرح ہنستے ہوئے یکّے والے کا بازو کھینچ کر کہا: "وہ تمہارا خیال سولہ آنے درست ہے، میاں یکّے والے! آج کل سا ہے واقعی خوب چمکتے ہیں۔"

اُس کے ذہن میں گذشتہ شب کی محفلِ رقص و سرود کا ایک ایک نقش اُبھرنے لگا۔ گیس کی روشنی میں الکا کے چہرے پر معصومانہ شوخی برس رہی تھی۔ اُس کا تھرکتا ہوا انگ انگ اُس کے ذہن میں عجیب قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ جب وہ سنہری انگیا اور قوسِ قزحی لہنگا پہنے اور نینون کے دوپٹے سے گھونگھٹ کاڑھے دُلہنیا کا ناچ ناچنے لگی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی اپسرا دھرتی پر آ کر راستہ بھول گئی ہو۔ اور جب الکا نے ہارمونیم کی گت پر اپنا دل پسند نغمہ الاپنا شروع کیا ——

"اب تو نبھایاں سرے گی، بانہہ گہے کی لاج!"

تو اُسے ہارمونیم میں وہ پرواز نظر نہ آئی جو ناچ کو عروج پر لے جا سکتی۔ جانے کس جذبے کے تحت وہ اپنا رباب اُٹھا لایا تھا۔ اور نندن مہاراج کی بغل میں آ بیٹھا تھا۔ لیکن ہارمونیم اور رباب ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ نندن مہاراج نے ہارمونیم بند کر دیا۔ الکا بھی ناچتے ناچتے رُک گئی۔ معلوم ہوتا تھا خلا پڑ گیا۔ لیکن اگلے ہی پل پھر پائل چھنک اُٹھی۔ الکا نے وہی گیت پھر سے گانا شروع کیا۔

"اب تو نبھایاں سرے گی، بانہہ گہے کی لاج!"

اُس وقت اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس کے سامنے نہ مینا تھی نہ بلی۔ وہ صرف الکا کو دیکھ سکتا تھا .... وہ گاتے گاتے ناچ رہی تھی —— چھن چھن —— چھنا چھن چھن —— چھن چھن چھن —— اور ناچتے ناچتے گا رہی تھی۔

"اونچا نیچا محل پیا کا، ہم سوں چڑھیو نہ جائے!"

اور جیسے اِس نغمے کے جادو سے اُس کا چہرہ پگھل کر کسی نئے سانچے میں ڈھل گیا ہو اور اب اُس پر کسی کو حبشی کا شبہ نہ ہو سکتا ہو۔ جیسے برف اور انگارے کا میل ہو جائے، جیسے بلپت اور دُرت میں سمجھوتہ ہو جائے۔ اُس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑتی گئی۔ وہ چاہنے لگا تھا کہ اُٹھ کر الکا کے ساتھ ناچنے لگے۔ رقص جاری تھا۔ جیسے پورنماشی سے پہلے ہی پورنماشی کا چاند جھک کر زمین کا بوسہ لے رہا ہو —— ازلی و ابدی چاند جو حیات و ممات کی آنکھ مچولی پر جی جان سے قربان ہو سکتا تھا۔ جانے الکا کی کیا چیز گر پڑی تھی۔ جیسے ڈھونڈنے کے لیے وہ سو سو چکر کاٹ رہی تھی۔ ہوا میں ناچ کی خوشبو بسی ہوئی تھی جیسے چمپا اور چنبیلی کھل اُٹھے ہوں۔

اُس وقت ——— رباب بجاتے بجاتے اُس نے سوچا تھا۔ کہ الکا کے جسم پر بھلے ہی نندن مہاراج کا قبضہ ہو چکا ہو لیکن آج اس کی آتما مجھے مل گئی۔ کہاں ہارمونیم کہاں رباب۔ ایک سلجھی ہوئی خاندانی رقاصہ شکستہ ہارمونیم کی گت پر ناچے یہ تو ذلت ہے۔ اب تک وہ ضرور ایک شدید ذہنی اُلجھن میں پھنسی رہی ہوگی۔ لے جاؤ اپنا ہارمونیم، نندن مہاراج! اب تمہارا ہارمونیم یہاں نہیں چلے گا۔ اب یہاں رباب بجے گا۔ اور رباب کی تال پر الکا گا رہی تھی۔

سُولی اُوپر سیج ہماری
کس بدھ سونا ہوئے!
گگن منڈل پر سیج پیا کی
کس بدھ ملنا ہوئے!
ہے ری میں تو پریم دیوانی
میرو درد نہ جانے کوئے!

اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کے رباب کے سوئے نغمے جاگ اُٹھے ہیں۔ وہ چاہتا تھا اُٹھ کر الکا سے کہے ——— "اب سب کچھ سمجھے اپنے جذبات مجھے سونپ دے، الکا! میری فنکارانہ رفاقت تیری ہستی کو جاوداں بنائے گی۔ تیرا فن اور بھی چمکے گا۔ ہاں، پھر گگن منڈل پر ہماری سیج ہوگی۔ الکا ——— الکا رانی، تم نے اپنے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ تم تو یوں کنگھی چوٹی کرتی ہو جیسے یہ بال تمہارے نہیں ہیں۔ تجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ رقص کی طرح بالوں کا زیر و بم بھی ضروری ہے۔ جیسے ناچتے ہوئے پاؤں تھرکتے ہیں، ایسے ہی کنگھی گھومتی چلی جائے تاکہ بالوں کی انفرادیت نمایاں ہو سکے۔ بہت سی لٹیں تو تمہارے سر پر سوئی سی رہتی ہیں۔ کہو ——— کہو، تو میں ان خوابیدہ ناگنوں کو جگا دوں۔ کہو تو ......"

یکے والا گھوڑی کو گالی پہ گالی دیئے جا رہا تھا۔ رادھے شیام نے ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گذشتہ شب کی محفلِ رقص و سرود میں وہ کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا کتنا راستہ کٹ گیا اور کتنا باقی ہے۔ یکے والے نے یہ سمجھ کر کہ مسافر کو جھپکی آ رہی ہے، اُس کا رباب اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

"چل ——— میری بانکی بنو" یکے والا اپنی گھوڑی کو پچکار رہا تھا۔

رادھے شیام نے سوچا کہ چند لمحے پیشتر یکے والا گھوڑی کو گالیاں دے رہا تھا، اب پچکار رہا ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر اس قدر تضاد ملتا ہے کہ جواب نہیں۔

بجلی کے کوندے کی طرح گذشتہ شب کی کہانی پھر اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ جب الکا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ ماسٹر جی ہارمونیم بھی ساز ہے لیکن رباب کا مقابلہ نہیں۔ تو اُس کے لب و لہجہ میں تکلف کا رتی بھر شائبہ نہیں تھا۔ اور پھر اُس نے لچک کر کہا تھا کہ اگر اُسے پہلے خبر ہوتی تو وہ کب کی ہارمونیم پر ناچنا بند کر چکی ہوتی۔

اُس کا خیال تھا کہ وہ لوگ ایک آدھ روز اور ٹھہریں گے۔ لیکن شاید نندن مہاراج کو یہ منظور نہ تھا۔ صبح پتہ چلا کہ وہ رات ہی کو وہاں سے چل دیئے تھے۔

اُس کا تن بدن سلگنے لگا جیسے اُس نے اَن منے طریقہ پر دیپک گا دیا ہو۔ اور اب میگھ کے سروں کے لئے اُس کی روح بُری طرح تڑپ رہی ہو۔ شوخ و شنگ آفتاب آگ برسا رہا تھا۔ ایسے میں بھلا کہاں سے میگھ اُمڈ آتے۔

یکے کے ہچکولوں سے اُس پر نیم خوابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پسینے کی کسیلی بُو پر وہ بُری طرح جھنجھلا اُٹھا۔ وہ تو کسی مہکتے ہوئے نغمے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

اُس نے یکے والے کا بازو کھینچ کر کہا: "کیوں میاں! بھلا بتاؤ تو سہی کہ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں گھومتے رہنا بہتر ہے یا آدمی آگے کو قدم اُٹھائے، چاہے اُس کی رفتار سست ہی کیوں نہ ہو؟"

لیکن یکے والے کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی اور اُس نے بغیر جواب دیئے گھوڑی کو پچکارنا شروع کر دیا: "میری بنو! بس یہی چال چلتی چل۔"

رادھے شیام نے پھر کہا: "سنگیت اور نرت سے تو بڑی بڑی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں، میاں یکے والے! آج محفل

جمے گی۔ تم بھی وہیں ٹھہر جاؤ۔"

یکّے والے نے ایک عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے کہا:" یہ بھی بھلا کچھ کہنے کی بات ہے؟"

رادھے شیام سوچنے لگا الکا سے کہوں گا۔ — "الکا! تم تو باگیشوری ہو" اور شاید وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے گی اور کہے گی۔ "واہ ماسٹر جی! میں تو ابھی باگیشوری کا [illegible]" پھر میں اسے کہوں گا — الکا، اگر تم باگیشوری نہیں تو اس کی بہن راگیشوری ضرور ہو۔"

اگر یکّے والا گویا ہوتا تو وہ وقت کاٹنے اور اس پر اپنا رعب جمانے کے لئے اس سے بحث چھیڑ دیتا کہ بڑے میاں! استاد تو بھلا بہار اتر کے گر یہ ہنڈولا راگ صبح کے وقت کیوں گاتے ہیں جبکہ ہم اسے رات کو گاتے ہیں۔ ہر راگ کا وقت مقرر ہے نا۔ اور یہ ہنڈول ......" اور اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔

ایسے ہی اُسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے دور الکا ہنڈولے پر جھولتی ہوئی ہنڈول گا رہی ہو۔ پھر ایک دھچکے نے اُسے تخیل کی دنیا سے حقیقی دنیا میں لا پھینکا۔ یکّے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ اور اس نے دیکھا کہ گھوڑی پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔

یکّے والے کی نگاہ سامنے سڑک پر تھی کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک پر — وہ گھوڑی کو گالیاں دیتے اور پچکارتے تنگ آ چکا تھا۔ اور اب اُس نے اُس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔

رادھے شیام سوچنے لگا کیا دو راگی بیک وقت ایک راگ نہیں الاپ سکتے؟ اور کیا دو انسان بیک وقت ایک عورت سے محبت نہیں کر سکتے؟ لیکن نندن کہاں کا گائک ہے؟ وہ تو راگ کی ابجد بھی نہیں جانتا۔

یکّے والا بولا: "میرا چھوٹا بھائی پہاڑی خوب گاتا ہے"

رادھے شیام نے اپنی ساری مسکراہٹ آنکھوں کے ایک گوشے میں جمع کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پھیپھڑے مضبوط ہوں گے۔ پہاڑی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں میاں جی! اس میں گہرا سانس لینا پڑتا ہے۔ پہاڑی راگ بھی ہے اور رنگ بھی۔"

پھر وہ سوچنے لگا کہ میری الکا جب گاتی ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ زندگی کو قوس قزحی لباس پہنا رہی ہو۔ اپنے ناچ میں وہ ہمیشہ حسن کی تخلیق کرتی ہے — حسن، جس میں پرانی مسکراہٹیں نئی مسکراہٹوں میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اس کی گھنی پلکیں گل کی طرح کانپنے لگتی ہیں۔ الکا! الکا! ...... وہ خاموشی سے دہرانے لگا۔ تیری آواز تو جیسے جیسے خیال یا دھناسری کی طرح پرواز کرتی ہے — اور تیری مسکراہٹ — ابھرتی کنواری کھمباوتی کی طرح نشیلی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے ذہن میں اس وقت یہ نا جھنک اٹھی — "ماسٹر جی!"

اور جیسے رتی چلائی — "ماسٹر جی"!

لیکن اسے اُس دیپک گانے والے گوّیے کا دھیان آیا۔ جو اپنے راگ میں کچھ اس قدر کھویا ہوا تھا کہ گاتے گاتے آگ کی نذر ہو گیا تھا.........

پھر جیسے الکا اسے پکارنے لگی — "ماسٹر جی، ماسٹر جی!"

لیکن وہ اپنا رباب بجائے گیا۔ جیسے رباب کا نغمہ موت سے ٹکرا سکتا ہو۔ لیکن الکا چلائے جا رہی ہے — ماسٹر جی — آگ کے شعلے — دوڑو — بھاگو — لیکن وہ تو اپنے رباب میں مست ہے۔ بیشک الکا کی پکار بے حد [illegible] ہے۔ لیکن وہ تو یہ سمجھ رہا ہے جیسے وہ میگھ گا رہا ہو۔ نغمہ دہکے گا؟ ہیں تو کیا جلوں گا۔ میرے میگھ کے آگے دیپک کی لگائی ہوئی آگ کیسے ٹھہر سکے گی؟ الکا! تم تو نادان ہو! جھلی! ناسمجھ۔

یکّے والے نے اُس کے بازو کو جھنجھوڑ کر کہا: "دیکھو جی گھوڑی کیا چال چل رہی ہے"

رادھے شیام نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: "میاں! تم بھی کبھی کسی کے پیچھے بھٹکتے پھرے ہو؟ یقیناً نہیں۔ بڈھے! تم جوان ہو سکتے ہو!"

یکّے والا کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر بولا: "جی اب تو میں قبر میں پہنچ کر ہی جوان ہوں گا!"

رادھے شیام کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی مجاہد کی طرح قلعہ فتح کرنے جا رہا ہو ...... پھر یکلخت اُسے

محفلِ رقص و سرود کے خیال نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ رباب بجا رہا ہے۔ الکا اُس کے رباب پر تھرک رہی ہے۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک نغمئی شراب رستی ہوئی اُس کی روح میں تحلیل ہو رہی ہے اور پھر جیسے اس نغمے کی بھینی بھینی عطر بیز خوشبو فضا میں بکھر گئی، اس کا رزم و نازک رنگ قزحی کمان کی طرح چھا گیا۔ اس کا رسیلا ذائقہ اُس پر جادو سا کرنے لگا۔ اور وہ الکا کو اپنے بازوؤں میں تھامے، رقص کرتا ہوا، گاتا ہوا، اوپر ہی اوپر اُڑتا چلا جا رہا ہے ـــــ دُور بلندیوں پر ـــــ ایک جانی پہچانی منزل کی جانب ـــــ جو ایک مُدت سے اُسے پکار رہی تھی،......

اب سرائے نظر آنے لگی تھی۔ گھوڑی زور سے ہنہنائی اور یکے والا خوشی سے بولا: "بس دو قدم اور میری بنو، ـــــ دو قدم اور۔"

جیسے ہی یکہ رُکا۔ رادھے شیام رباب اُٹھائے لپک کر نیچے اُترا۔ اور سرائے میں گھس گیا۔ اُس وقت اُس کا سر اُونچا ہو گیا تھا۔ اُس کے قدم سبک خرامی دکھا رہے تھے۔

لیکن جب وہ سرے ہی لمحے وہ، سرائے سے باہر نکلا۔ تو یکے والے نے دیکھا۔ کہ اُس کا سر جھُکا ہوا تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور وہ یکے پر آ کر گم سُم بیٹھ گیا۔ یک لخت اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ الکا کا نہیں زندگی کا تعاقب کر رہا ہے ـــــ زندگی جو ایک نرتکی کی طرح مسکراہٹیں بکھیرتی ہے اور ایک ساحرہ کی طرح نین مٹکا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اُس نے یکے والے کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور آہستہ سے کہا: "اگلے پڑاؤ کی طرف...... ......"

ہماری ایجنسیاں

ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں رسالہ "ادب لطیف" مل سکتا ہے۔ ذیل میں اُن ایجنسیوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ جہاں سے آپ ہر ماہ رسالہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہیلر بک سٹالز سے بھی مل سکتا ہے:۔

ایم۔ ایم۔ اسحاق نیوز ایجنٹ۔ چوک فتح پوری۔ دہلی۔
غلام یاسین نیوز ایجنٹ جامع مسجد۔ دہلی
ایم۔ احمد بخش۔ نیوز ایجنٹ۔ جے جے ہاسپٹل۔ بمبئی۔
کلکتہ نیوز ایجنسی۔ ۳۴۔ ذیرلین۔ کلکتہ۔
دانش محل۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ
ادبستان۔ گوٹن روڈ۔ امین آباد۔
دکن بک ڈپو۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔
مکتبہ ابراہیمیہ، عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔
ایم الہ داد نیوز ایجنٹ۔ کھوکھر بک سٹال۔ راولپنڈی۔
ڈی۔ آر۔ سورج بلرام نیوز ایجنٹ راولپنڈی
موجی بک سٹال راولپنڈی۔
لائل بک ڈپو۔ لائل پور
ملکھراج چوپڑہ نیوز ایجنٹ۔ گوجرانوالہ
گوربخش رائے کھنہ نیوز ایجنٹ بندر روڈ کراچی۔
نیا سنسار کتاب گھر۔ بانکی پور پٹنہ۔
اُردو محل۔ چہار باغ۔ جالندھر۔
پراگریسو بک ڈپو۔ کیمبل پور۔
مسلم نیوز پیپر ایجنسی۔ ہوشیار پور۔
موہن لعل نیوز ایجنٹ۔ بک سیلرز۔ مردان۔
صادق کمیشن ایجنسی۔ قصہ خوانی بازار۔ پشاور۔
فردوسی بک ڈپو۔ بنگلور چھاؤنی۔
کلیم بک ڈپو۔ خاص بازار۔ احمد آباد۔
آزاد نیوز ایجنسی۔ چاندنی چوک۔ بنگلور چھاؤنی۔
شرما بک ڈپو۔ ۱۰۸۔ لوئر مال۔ شملہ۔
میسرز رلیارام نیوز ایجنٹ۔ کانگڑہ۔
ملک اینڈ سنز تاجران کتب۔ سیالکوٹ۔
لالہ آیا رام نیوز ایجنٹ۔ فیروز پور شہر۔

از پرکاش موہن

تنکا

رفیع نے تیسرے درجہ کے ڈبہ پر نگاہ ڈالی - اور ٹھٹھرتی ہوئی انگلیوں میں ٹکٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا - جگہ اس ڈبہ میں بھی نہ تھی - کھڑکیوں سے لاتعداد گھٹے ہوئے سر اور زرد چہرے جھانک رہے تھے - کوئی ایسا چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا - جسے جاذبِ نظر کہا جا سکے - سامنے کھڑکی میں بیٹھی ہوئی دوشیزہ نے اُسے غور سے دیکھا - اُس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی - ایک دبا ہوا سا وقار - جیسے کہہ رہی ہو - میرے گال کیسے سُرخ ہیں - لباس کیسا چُست - رفیع کو اس کی کھُبتی نگاہوں سے ایک گونہ اطمینان ہوا - لیکن اُس کی فاتحانہ مسکراہٹ پر اُس نے ناک سکوڑ لی -

"اگر میں اس گاڑی میں نہ جا سکا" رفیع نے سوچا - "تو رات سٹیشن کے کسی بنچ پر پڑے پڑے گذارنا ہوگی - وہ آگے بڑھا - ایک فوجی دروازہ روکے کھڑا تھا - اُسے معلوم تھا - کہ وہ اُس فوجی سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں رکھتا - اُسے اپنی کم حوصلگی کا احساس ہوا اور "کیفے" کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا - ـــــ وہ لڑکی جو شاید اُس سے بات کرنے کی خواہشمند تھی - مگر جسے وہ بلانے کی جرأت نہ کر سکا تھا - اور وہ کالی کلوٹا انڈین کرسچین جو بڑھ کر اُس کرسی پر قابض ہو گیا تھا - جس پر رفیع بیٹھنا چاہتا تھا - چائے کا وہ سرد پیالہ، جسے واپس بھیج دینے کا خیال اُسے بار بار آتا رہا تھا - اور کیفے کا وہ بیرا جسے وہ پکارنا چاہتا تھا ....

وہ آگے بڑھا - فوجی نے راستہ دے دیا - اور رفیع کو خیال آیا - کہ میری شخصیت اُس بڈھے سے کہیں زیادہ بارعب ہے جسے دیکھتے دیکھتے اسی فوجی نے پرے دھکیل دیا تھا - اور جو اب ساتھ والے ڈبے میں گھسنے کے لئے گڑگڑا رہا تھا - لیکن اندر سے مسافروں کے حقارت آمیز قہقہوں کی صدا آ رہی تھی - رفیع کو اُس بڈھے پر سخت غصہ آیا - "بزدل! ان کمینوں کو مزا کیوں نہیں چکھا دیتا؟ رذیل!" کھڑکی سے سر نکال کر وہ ان بدتمیز مسافروں کو بھی کھری کھری سُنانا چاہتا تھا -

ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے اُس کا پاؤں بُری طرح کچل دیا - رفیع نے اپنا پاؤں زور سے پیچھے ہٹا لیا - مسافر کو غلطی کا احساس ہوا - وہ بولا "معاف کیجئے گا!"

اپنا پاؤں سہلاتے ہوئے رفیع نے سوچا - کہ وہ مسافر کے گھٹے ہوئے سر پر چپت دے مارے اور پھر اُس سے اُسی کے سے انداز میں معافی مانگے - کسقدر غیر فطری ہے ہماری تہذیب - اُس نے سوچا - اور یہ ہمارا نظام - ہاں - اس کی بنیادیں معافی ہی پر تو قائم ہیں - جبھی تو یہ مسافر خاموش ہیں ـــــ خاموش اور بے جان! کبھی بھول کر بھی نہیں سوچتے کہ باہر نکل کر فرسٹ اور سیکنڈ کے ڈبوں پر قبضہ جمالیں - اچانک اُس کے تصور نے پلٹا کھایا - جیسے ڈبے میں کھلبلی مچ گئی ہو - اور مسافروں کے چہروں پر غیظ و غضب کے آثار نمودار ہو گئے ہوں - جیسے گھٹے ہوئے سر والا مسافر بھاگ رہا ہو - اُس کی داڑھی لہرا رہی ہو - دوشیزہ ہاتھ ہلا ہلا کر کوسنے دے رہی ہو - اور اس کی ماں ایک کونے میں کھڑی چھاتی پیٹ رہی ہو - سامنے والا بابو زور زور سے نیم انگریزی انداز میں جھگڑ رہا ہو - فوجی کی آنکھوں میں جیسے آگ سی بھڑک اٹھی - اور وہ گھٹنا ٹیکے بندوق کی نشست لگا رہا ہو ....

رفیع نے ایک گہری سانس لی - ایک ہی جھٹکے میں وہ تصور کی دنیا سے حقیقت کی دُنیا میں آ پہنچا - مسافر اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے تھے ـــــ خاموش اور بے جان! اپنے تخیل کی بوالعجبی پر وہ زیر لب مسکرایا - اس نے دیکھا - بیشتر مسافر دیہاتی تھے - ان کی کالی کلوٹی ٹانگیں گاڑھے کی دھوتیوں میں سے بے ڈھنگے طور پر باہر جھانک رہی تھیں - ان کے چہروں پر دبا دبا سا خوف تھا - کسان

ہر جگہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ رفیع نے سوچا۔ کھیتوں میں دیکھو۔ تو کٹ مرنے کو تیار۔ لیکن ریل کے ڈبے میں پہنچتے ہی دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے وہ دشمن کے ملک میں آنکلے ہوں۔ اُسے یاد آیا کہ جب وہ اپنی بوسیدہ پتلون پہنے اس ڈبہ میں داخل ہوا تھا۔ تو ان کسانوں کے چہروں پر ندامت سی چھا گئی تھی۔ جیسے وہ محسوس کر رہے تھے۔ کہ خود بیٹھ کر اور "بابو صاحب" کو کھڑا رکھ کر وہ کوئی گناہ کر رہے ہیں۔ وہ جھلا اُٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان جاٹوں کے ساتھ اس قدر سخت کلامی سے پیش آئے۔ کہ وہ بھڑک اٹھیں۔ اور یہ خوف ان کے چہروں سے دور ہو جائے۔ پھر چاہے وہ اُسے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔ وہ اپنی بوسیدہ پتلون اتار کر پھینکتے ہوئے ان سے کہنا چاہتا تھا" لو اب میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔ پھر اُسے خیال آیا کہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس قدر چڑچڑاہٹ کیوں محسوس کرتا ہوں؟ پہلے تو میری طبیعت ایسی نہ تھی۔ وہ بھی دن تھے۔ کہ کوئی کسان اُٹھ کر میرے لئے جگہ بھی خالی کر دیتا۔ تو میں اُسے اپنی برتری کا ثبوت سمجھتا۔ اور جھٹ اطمینان سے بیٹھ جاتا۔ اُن کے ساتھ باتیں کرتا۔ ان کے نام اور مقام پوچھتا۔ ان کے سکھ دکھ ٹٹولتا۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ کہ میں ان حقیر کسانوں کو اپنے برابر کا انسان سمجھتا ہوں ....

کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں گھٹے ہوئے سر والا مسافر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ رفیع کو سعادت کا خیال آیا۔ وہ تو زبردستی اس مسافر کے پاس جگہ نکال لیتا۔ مجھ میں ایسی جرأت کیوں نہیں؟ جرأت! اسے تو بدتمیزی کہنا چاہیئے۔ اُسے اس خیال سے قدرے تسلّی ہو گئی۔ مسافر کے گھٹے ہوئے سر پر سے ہوتی ہوئی اُس کی نگاہ اس کی داڑھی میں اٹک کر رہ گئی۔ مسافر نے عجب انداز سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آیئے جناب یہاں تشریف لایئے۔ آخر کب تک کھڑا رہئے گا؟"

رفیع بیٹھ گیا۔ مسافر نے پوچھا "آپ کہاں جائیں گے؟"

رفیع کے جی میں آیا۔ کہے۔ جہنم میں۔ یہ لوگ سفر میں کتنی جلدی ذاتی سوالات پر اُتر آتے ہیں۔ اگر میں بتا بھی دوں۔ کہ میں کھنڈوا جا رہا ہوں۔ تو جھٹ یہ سوال ہوگا۔ کہ میں یہاں کس مطلب سے آیا تھا۔ اور کھنڈوا کس سلسلہ میں جا رہا ہوں اور سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ کبھی اُسے خود یہی عادت تھی۔ اور اُسے ایسے لوگوں سے نفرت تھی۔ جو خاموش رہنا چاہتے۔ یا جواب دیتے ہوئے بے رُخی برتتے۔ آج کل تو وہ بات بات پر جھنجھلا اُٹھتا۔ اور پھر یہ سوچ کر اُسے اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی۔ کہ وہ کیوں جھنجھلاتا ہے۔

مسافر اپنے سوال کا جواب نہ پا کر کھسیانا سا ہو گیا۔ اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

رفیع نے کتاب کھول لی۔ ایکا ایکی اسے محسوس ہوا۔ کہ کوئی اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے دیکھا۔ یہ وہی دوشیزہ تھی۔ اُس نے آنکھیں پھیر لیں۔ اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ رفیع اب اس کے چہرے کا صرف ایک ہی رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہی لمبوترا چہرہ۔ وہی ستواں ناک، وہی چمکتا ہوا نگینہ۔ جو اسے ناپسند تھا۔ وہی کس کر باندھے ہوئے بال۔ اور بے ڈھب سی چوٹی ——— کوئی بھی چیز جاذب نظر نہ تھی۔ اُس کے سینے کا ابھار اُس کے بازو کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ مجھے بہت کم لڑکیاں پسند آتی ہیں۔ اُس نے سوچا۔ یہ شاید میری نظر کا قصور ہے۔ سعادت کے لئے ہر نوجوان لڑکی حسین ہے۔ دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔ وہ کہتا ہے۔ اور محسوس کرنے والا دل۔ اس کی نگاہ اس قول کی تصدیق کے لئے پھر دوشیزہ کی طرف اُٹھی۔ وہ پھر شرما گئی۔ اور گھبرا کر ڈبے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس ادا میں گلہ تھا اور اظہارِ بے اعتنائی۔ جیسے وہ کہنا چاہتی ہو۔ آخر آ گئے نا راستے پر۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے تو بڑی اینٹھ سے ناک سکوڑ لی تھی۔

رفیع کے چہرے پر خفت کی ایک ہلکی سی لہر اُٹھی۔ اس نے کتاب کھولی "اجنتا کے غار دیکھ کر وہ بمبئی جا رہا تھا۔ تیسرے درجہ کے ڈبہ میں اُسے بمشکل جگہ ملی۔ اتنی بھیڑ! اُس کا دم گھٹ رہا تھا" اور جیسے رفیع نے بھی محسوس کیا۔ کہ اس کا بھی دم گھٹ رہا ہے۔ کاش وہ کسی کھڑکی کے نزدیک ہوتا۔ اسی کھڑکی کے نزدیک جہاں وہ دوشیزہ بیٹھی تھی تاکہ ان کے جسم مس کرتے۔ اور اگر وہ بُرا نہ مانتی۔ تو اس کے اور قریب سرک جاتا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے اُسے دوشیزہ کا لمس محسوس ہونے لگا۔ اس

کی نگاہیں بے اختیار ادھر اُٹھ گئیں ۔ دوشیزہ بھی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اب اس کی آنکھوں میں نہ گھبراہٹ تھی نہ گلہ ۔ رفیع گھبرا گیا ۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں ۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اُسے اپنے اوپر غصہ آنے لگا ۔ میں اتنا بُزدل کیوں ہوں ؟ ...... بار بار اُس کی نظریں اُسی محور کے گرد گھومنے لگیں ۔ دوشیزہ کی آنکھوں میں چھپی چھپی سی شرارت تھی ۔ دبی دبی سی دعوت ۔

گھٹے ہوئے سر والا مسافر کھانسنے لگا ۔ رفیع چونکا ۔ اس نے بھانپ لیا ۔ کہ مسافر اس کے راز سے ناآشنا نہیں ۔ اس نے ایک نظر دوشیزہ کے چہرے پر ڈالی ۔ اور پھر مسافر کی طرف دیکھا ۔ لیکن مسافر کی نگاہیں رفیع کی نظروں کے رُخ کا جائزہ لیتے لیتے لڑکی کے چہرے تک جا چکی تھیں ۔ جو سیٹ کے نیچے پڑی ہوئی پھلوں کی ٹوکری کو دھکیلنے کے بہانے نیچے جُھک گئی تھی ۔

جیسے کسی نے رفیع کو چوری کرتے پکڑ لیا ہو ۔ اُسے غصہ آنے لگا ۔ جاہل ۔ بدتمیز ۔ یہ جہالت دراصل غلامی کی پیداوار ہے ۔ ہاں ۔ ہم سب آزادی کھو بیٹھے ہیں ۔ یہاں نہ خود مُسکرانے کی آزادی ہے ۔ نہ کسی کی مسکراہٹ سے لطف اُٹھانے کی ـــــ جرأت کا تو یہی تقاضا تھا ۔ کہ وہ دوشیزہ کو جی بھر کر دیکھے ۔ مگر ہمت نہ ہوئی ۔ اس نے سوچا سعادت ہوتا ۔ تو کسی کی پروا نہ کرتا ۔ آخر میں کیوں اتنا بزدل ہوں ؟ یہ مسافر اجنبی ہے ۔ اور زندگی بھر اجنبی رہے گا ـــــ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے ۔ کہ والد صاحب کسی روز اسی کی چھیل چھبیلی بیٹی سے میری نسبت طے کر دیں ؟ ....

اُس نے فیصلہ کیا ۔ کہ اب آرام سے کتاب پڑھے گا ۔ لیکن اُسے رہ رہ کر خیال آتا ۔ کہ دوشیزہ کدھر دیکھ رہی ہو گی ۔ اور گھٹے ہوئے سر والے مسافر کی آنکھیں کہاں ہوں گی ۔ اُس نے سوچا ۔ دوشیزہ یقیناً میری طرف دیکھ رہی ہو گی اور جیسے کتاب کے صفحے پر دوشیزہ کی ایک تصویر سی اُبھرنے لگی وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اُس کی آنکھوں میں بے بسی تھی ۔ مجھے بھی کیسے کیسے خیال آتے ہیں ۔ دُوسرے ہی لمحے اُس نے سوچا ۔ ابھی تو وہ مجھ سے پوری طرح مانوس بھی نہ ہو پائی ہو گی ۔ ہم دو لہروں کی طرح آپس میں کھیل رہے ہیں ۔ دو لہریں ،

جو چند لمحوں کے لئے پانیوں کی وسعت پر اکٹھی ہوتی ہیں ۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتی ہیں ۔ اس کے ذہن نے پلٹا کھایا ۔ جیسے سامنے اتھاہ پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہو ۔ اس نے دیکھا ۔ وہ اس دوشیزہ کے ساتھ بہے چلا جاتا ہے ۔ دوشیزہ کے ہاتھ ایک بار اس کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں ۔ اور پھر وہ گہرے پانی میں چلی جاتی ہے ۔ وہ ڈبکی لگاتا ہے اُس کے ہاتھ دوشیزہ کو ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ اور وہ اُسے بازوؤں پر اُٹھائے باہر نکل آتا ہے ....

وہ چونک اُٹھا ۔ میں بھی کیا پاگل ہوں ، اُس نے سوچا ۔ اب میں اُس کے متعلق کچھ نہیں سوچوں گا ۔ وہ ایسا زاویہ بنا کر بیٹھ گیا جس سے سر گھمائے بغیر وہ دوشیزہ کو نہ دیکھ سکے ۔ اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا ۔ گاڑی تیزی سے ایک خزاں رسیدہ جنگل سے گذر رہی تھی ۔ جہاں نکھری ہوئی چاندنی میں درخت عجیب کس مپرسی کا احساس پیدا کر رہے تھے ....

"یہ کیا کتاب ہے جی ! ـــ میں اسے پڑھ سکتا ہوں ؟" گھٹے ہوئے سر والے مسافر نے لجاجت سے کہا ۔

رفیع نے سوچا ۔ کہ کتاب کھول کر خود پڑھنا شروع کر دے ۔ اور اسے جواب تک نہ دے ۔ مگر مسافر نے اس کی اجازت کا انتظار کئے بغیر کتاب اُٹھا لی اور پڑھنا شروع کر دیا ۔ رفیع کو اپنی شکست کا بُری طرح احساس ہوا ۔ جیسے کسی نے اُسے ہزارہا تماش بینوں کے مجمع میں پچھاڑ دیا ہو ۔ اور تالیوں کے شور میں اُس کے سینے پر گھٹنا ٹیکے ایک فاتح کی طرح چڑھا بیٹھا ہو ، دانتوں میں پھنسے ہوئے تنکے کی طرح ، جسے زبان چھو سکے ۔ مگر جسے ہاتھ بار بار باہر نکالنے میں ناکام رہیں ۔ چڑچڑے پن کی خلش بڑھنے لگی ۔ اُس وقت اُسے کتاب پڑھنے کی چنداں خواہش نہ تھی ۔ شاید وہ ابھی دیر تک کتاب نہ کھولتا ۔ اور باہر کے افسردہ منظر کو دیکھتا رہتا ۔ لیکن مسافر کی یہ حرکت اُسے ناگوار گذری ۔ خصوصاً مسافر کا شوقِ مطالعہ اور انہماک تو اُسے بالکل پسند نہ آیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے مسافر اُسے چڑا رہا ہو ۔ اور کہہ رہا ہو ۔ محویت کا یہ عالم تم بھی پیدا کر سکتے ہو ؟ رفیع نے سوچا ۔ ہاں ۔ میری زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں ۔ جو مجھے محو کر

سکے ۔ میری زندگی پر چھا جائے ۔ میری ہستی کو مدغم کر دے ۔ اور زیست
کے ہر لمحے میں نئے معنی بھر دے ۔ میں یقیناً اس راہی کی طرح ہوں ۔
جو جنگل میں بھٹک رہا ہو ۔ زندگی کی جزئیات کے جنگل میں دریا کے کنارے
کھڑا ہؤا میں لہریں گِن رہا ہوں ۔ میری نظریں لہروں کے انفرادی
پیچ و تاب میں پھنس کر رہ گئی ہیں ۔ میں اس سیلِ رواں کی مجموعی کیفیت
اور وسعت کو نہیں دیکھ سکتا ۔ نہ ہی اس میں کود کر ڈوب سکتا ہوں ۔
پھر اُسے خیال آیا ۔ میں تو خود اس دریا کی ایک لہر ہوں ۔ ایک چھوٹی
سی لہر ۔ جو ساحل سے دور ہے ۔ جو ازل سے بھٹکتی چلی آئی ہے ۔ اور
ابد تک بھٹکتی رہے گی ۔ زندگی اب جزئیات میں بٹ کر رہ گئی ہے ۔
ایک لمحہ دُوسرے لمحے کا تعاقب کرتا ہے ۔ پھر ایک اور لمحہ پھر ایک
اور ۔ اور لمحات کا یہ لامتناہی سلسلہ یکایک کسی وقت ٹوٹ جاتا ہے ۔
لمحات ۔ جزئیات ۔ لمحات ۔ جزئیات ۔ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ
کھٹ کھٹا کھٹ ....

گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی ۔ اور وہ چونک پڑا ۔
اُف ۔۔ ! میں تو سو چلا تھا ۔ اس نے گھٹے ہوئے سر والے مسافر کی
طرف دیکھا ۔ وہ پڑھنے میں ہمہ تن مصروف تھا ۔ اس کی نگاہیں بے
ساختہ دوشیزہ کی طرف اُٹھ گئیں ۔ جو اس کی طرف سے مایوس ہو کر
باہر دیکھ رہی تھی ۔ اور اسٹیشن کے لیمپ پوسٹ کے ساتھ ٹیک
لگائے ایک نوجوان کھڑا اُسے تاک رہا تھا ۔ لاابالیانہ انداز ڈھیلی
ڈھالی پتلون ۔ کھُلی آستین ، پریشان بال ۔ دوشیزہ کی ماں کھڑکی
کے ساتھ سر لگا کر سو گئی تھی ۔ اور خود دوشیزہ شاید اسی نوجوان
کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ رفیع کے دل پر چوٹ لگی ۔ اُس نے محسوس
کیا ۔ جیسے وہ برسوں سے بیمار ہو ۔ اور بہت نحیف ہو گیا ہو ۔ اس
قدر نحیف ۔ کہ اب چڑچڑاہٹ کی سکت بھی باقی نہ رہی ہو ۔ اتنا کمزور ۔
کہ جسم تک نہ ہلا سکتا ہو ۔ یہ خیال اس کے ذہن پر بُری طرح مسلط
ہو گیا ۔ حتےٰ کہ اُسے جھٹلانے کیلئے اُس نے اپنے جسم کو ایک جھٹکا
سا دے ڈالا ۔ دوشیزہ نے مڑ کر دیکھا ۔ رفیع کی طرف ، پھر مسافر
کی طرف ۔ جس کی نظریں بے ساختہ اسٹیشن پر کھڑے نوجوان کی جانب
اُٹھ کر دوشیزہ کے چہرے پر واپس آگئی تھیں ۔ وہ زیرِ لب مسکرائی ۔ جیسے
کہہ رہی ہو ۔ اجی ! وہ تو میں یونہی ذرا دیکھ رہی تھی ۔ رفیع کے چہرے
پر لجاجت آ رہی تھی ۔ جیسے اُس سے بھیک مانگ رہا ہو ۔ پھر اودھر
نہ دیکھنا ۔ ورنہ میں کچھ کر گذروں گا ۔ وہ سنبھل بیٹھا ۔ اور اپنے
چہرے پر بے اعتنائی اور بے رُخی کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش
کرنے لگا ۔ اُسے معلوم تھا ۔ کہ یہ ناکام کوشش ہے ۔ دوشیزہ کی
مسکراہٹ اور بھی کھل گئی تھی ۔ وہی فاتحانہ مسکراہٹ ۔

اس کے بہتے ہوئے خیالات رُک گئے ۔ اور اس کے شعور نے
ان رُکتی ہوئی لہروں کا جائزہ لیا ۔ اس کا سویا ہؤا وقار جاگ اٹھا اس کی
طاقت عود کر رہی تھی ۔ لیکن اس کے شعور میں یہ دھندلا سا خیال بھی
اُبھر رہا تھا ۔ کہ زندگی بے معنی ہے ۔ آہستہ آہستہ اس خیال نے
زور پکڑنا شروع کر دیا ۔ میں کتنا بےبس ہوں ۔ اس نے سوچا ۔ کتنا اچھا ہے ۔
کیا زندگی انہیں لہروں کا نام ہے ۔ جو کسی پُراسرار کنارے سے اُٹھتی
ہیں بڑھتی ہیں ۔ اور پھر سِمٹ جاتی ہیں ؟ اُسے اپنی بے چارگی کا شدید
احساس ہؤا ۔ اور زندگی کی متعدد لہریں اس کی آنکھوں کے سامنے
کھیلنے لگیں ۔ جو بار بار اُسے ساتھ بہا کر لے گئی تھیں ۔ اور جن کے
ریلے میں وہ سب کچھ بھُول گیا تھا ۔

پرلے کونے سے آتے ہوئے قہقہوں نے اُسے پھر چونکا دیا ۔
پانچ چھ نوجوان ۔ جو اسی اسٹیشن سے سوار ہوئے تھے ہنس رہے تھے ۔
ایک لمبی ناک والا نوجوان بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا ۔ اس کی ہر بات
پر قہقہہ پڑتا تھا ۔ ڈبے کے مسافر چونکتے ہو بیٹھے تھے ۔ لمبی ناک
والے کی پھبتیاں رفیع کو چبھنے لگیں ۔ پھر اُس کا دل اس اُمنگ پر
مچلنے لگا ۔ کہ وہ بھی ان میں شامل ہو جائے ۔ اور باتوں باتوں میں لمبی ناک
والے کو پچھاڑ دے ۔ اس کے مذاق کس قدر عامیانہ ہیں اور میرے
کسقدر شائستہ ۔ میرے سامنے اُن کی ہستی ہی کیا ہے ؟ اس نے سوچا ۔
اب بھی اگر میں چاہوں ۔ تو رنگ جما سکتا ہوں ۔

اب گاڑی چل پڑی تھی ۔ پہیّوں کی کھٹ کھٹ میں نوجوانوں
کے قہقہے دبتے چلے گئے ۔ اب وہ کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے
تھے ۔ انجن نے دو چار لمبی دلدوز سیٹیاں دیں ۔ گاڑی تیز ہو گئی ۔
رفیع نے دیکھا ۔ منظر بدل چکا ہے ۔ چاندنی میں ایک عجیب سی

کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ چاند بھی ایک ساحر ہے۔ دُنیا کا سب سے بڑا ساحر۔ چاندنی سے متعلق اس کے ہزاروں احساسات بیدار ہو گئے۔ جن کے اظہار میں اُسے ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ متعدد تصویریں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ چاندنی راتوں کی تصویریں جنہیں دنیا کے بڑے بڑے شاعروں نے پیش کیا تھا۔ اُسے حیرت ہوئی۔ کہ ان شاعروں کو اس قدر لطیف جذبات بیان کرنے کے لئے ایسے حسین اور سُبک الفاظ کہاں سے مل جاتے ہیں۔ میرے احساسات اس قدر بیدار ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر میرا تخیل ان کے لئے مناسب زبان کیوں حاصل نہیں کر سکتا۔

پہیوں کا سنگین شور بلند ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں طرف بڑی بڑی چٹانیں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اس کا ذہن تھک گیا۔ جب اُس نے اَن گنت صدیوں کا سفر ختم کرنا چاہا۔ جن کے دوران میں یہ چٹانیں اسی طرح خاموش، سر اُٹھائے کھڑی رہی تھیں۔ اس نے سوچا شائد اس ویرانے میں ہزاروں برس تک کسی ذی حس انسان کا گذر نہ ہوا ہو۔ ان ہزاروں سالوں میں آہستہ آہستہ یہاں کی ان دیکھی نباتات اُگتی رہی۔ جیتی رہی۔ اور گل سڑ کر مرتی رہی۔ چاندنی اس پہاڑ سے ہزاروں برس ہمکنار ہوتی رہی۔ چاند اپنا جادو اس پر چلاتا رہا۔ ہزاروں بار چاندنی نے اس پہاڑ کے ساتھ سرگوشیاں کرنے کی کوشش کی۔ اس کے پتھروں پر مخمور جوانی کے ڈورے ڈالے۔ بار بار اس کی تمنائیں اس سے ٹکرائیں۔ اور اس کی ناکامیاں، صدیوں کے تھکا دینے والے سفر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔ اتنا لمبا عرصہ، اتنی گہری محبت، اتنی زبردست ناکامی۔ یہ ولولے۔ یہ بے رخی۔ یہ بیتابیاں۔ یہ بے نیازی۔

اب گاڑی تیزی سے ایک وسیع کھڈ کے کنارے کنارے سفر کر رہی تھی۔ کھٹ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹا کھٹ۔ سیاہ چٹانیں رفیع کی نظروں سے اس کھڈ کو اوجھل کر دیتیں۔ اور وہ صرف درمیانی دراڑوں سے کھڈ کی جھلک دیکھ پاتا۔ مگر جب چٹانوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ تو کھڈ کی وسعت ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی آنکھوں کو ایک بار پھر پھیلنے پر مجبور کر دیتی۔ کھڈ کے اُس پار دوسرا عظیم الشان پہاڑ خاموش کھڑا تھا۔ رفیع نے سوچا شائد آج سے بہت پہلے جب دنیا میں ہمارے جیسے بونے نہیں۔ بڑے بڑے دیو بستے تھے۔ کسی دیو نے اپنا طویل بھاری بھرکم ہل اُٹھا کر بیس پچیس میل کی یہ گہری کھائی بنا ڈالی تھی۔ اور پھر دفعتاً کسی شکار کی بُو پاتے ہی اپنے زراعتی مشغلے کو بیچ ہی میں چھوڑ کر لپک پڑا تھا۔ اُس نے دیکھا دونوں ڈھلوانیں نیچے ہی نیچے چلی گئی تھیں۔ جیسے ان کے عریض سینوں میں ہمکنار ہونے کی خواہش نہاں ہو۔ جو کھڈ کی تہ میں بہتے ہوئے پانی کی شفاف۔ روپہلی لکیر میں غرق ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ ندی بھی کس قدر حقیر ہے۔ اُس نے سوچا۔ کیا اس عظیم الشان گہرائی کا مقصد صرف یہی تھا کہ پانی کے چند قطرے اس کی تہ میں رینگ سکیں؟

رفیع اس منظر کی کیفیت میں ہمہ تن محو تھا۔ اس کا شعور اور لاشعور دونوں اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کیفیت کے دھندلکے میں ہزاروں خیالات اور احساسات کسی ایک ہی تال پر تھرک اُٹھے۔ اس نے سوچا۔ یہ گاڑی اس کھڈ کا ساتھ کیوں نہیں چھوڑتی؟ شائد چاندنی کی طرح اسے بھی کھڈ سے محبت ہو گئی ہے۔ شائد یہ اسی لئے اتنا سیاہ دھواں چھوڑ رہی ہے کہ اپنے رقیب کے جادو کو ناکام بنا دے۔ دھوئیں کی عجیب عجیب شکلیں اُسے حاسد کے چہرے کی طرح تبدیل ہوتی نظر آئیں۔ ایک لمحے کے لئے تو اُسے خیال گذرا۔ کہ دھوئیں نے اُسی مہیب دیو کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جس نے اپنے طویل بھاری بھرکم ہل سے شائد اس کھڈ کی تخلیق کی تھی!

آہنی لکیروں اور سنگین کھڈ کی یہ لمبی "کورٹ شپ" آخر ختم ہو گئی۔ گاڑی نے انتھک چاندنی کے ہاتھ میدان سونپ کر اپنی راہ لی۔ اور رفیع نے سوچا۔ ذرا سی دیر کے لئے اس ریل گاڑی نے یہاں کی مقدس فضا کی خامشی کو اپنی آہ و بکا سے توڑ دیا۔ مگر اب چاندنی بھر رات بھر اپنی خاموش محبت کا اظہار کرتی رہیگی۔ جو صدیوں سے اُس کے سینے میں دفن ہے۔ رات بھر اپنا بوسہ پہاڑ کے ٹھنڈے، بے حس لبوں پر ثبت کرنے کے بعد وہ ایک لمبی آہ لے کر رخصت ہو جائے گی۔ اور پہاڑ اپنا فراخ سینہ ایک بازاری عورت کی طرح سورج کی کرنوں کے سپرد کر دے گا! ایک بار پھر اُسے

خواہش ہوئی۔ کہ اُسے تن تنہا یہاں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ با آواز بلند گائے۔ اور اس کی آواز اس وسعت میں کھو جائے۔ مگر پھر اُسے احساس ہوا کہ آواز اس خاموشی کو ناگوار گذرے گی۔ وہ یقیناً یہاں نہیں گائے گا۔ چاہے اس کے اچھلتے ہوئے دل کی دھڑکنیں اُس کے کانوں کو بہرا کر دیں۔ اور اُسے اُس نغمہ کے سننے سے محروم کر دیں جو خدا نے ان وسیع فضاؤں میں حل کر دیا ہے۔ مگر جسے ایک ٹھہرا ہوا دل سُن سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید یہ پہاڑ بھی اُسی لئے خاموش کھڑا ہے۔ یا شائد ابھی چاند کے نغمے سے اس کا جی نہیں بھرا۔ اس کا سینہ اتنا فراخ ہے۔ اور دل اتنا بڑا۔ کہ اسے ہزاروں نغمہ سرا سالِ درکار ہیں۔ آج سے ہزاروں سال بعد جب اس کا دل سیر ہو جائے گا۔ تو یہ فرطِ انبساط سے ناچنے لگے گا۔ دنیا کے لئے وہ قیامت کا دن ہوگا۔ مگر چاندنی کے لئے شبِ وصل۔ ہزاروں برس کی انتھک نغمہ سرائی کے بعد وہ اپنے محبوب سے ہمکنار ہوگی۔ اچانک لمبی ناک والے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یار وہ۔ میں دیویکا رانی سے ملوں گا۔ تو سب سے پہلے یہی سوال کروں گا۔ کہ تجھے پہاڑ اور چاندنی راتیں کیوں پسند ہیں دیویکا رانی! ہم نے بھی تیری چاندنی راتیں دیکھی ہیں۔ ان سے تم خود کہیں زیادہ سیم گوں ہو۔" اور اس کی آواز اپنے ساتھیوں کے قہقہوں میں دب گئی۔

رفیع نے چونک کر نوجوانوں کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا ہو۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ اس کی ذہنی ہم آہنگی ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کا مزہ۔ جسے اس کے جوان تخیل نے تھپکیاں دے دے کر تھوڑی دیر کے لئے سُلا دیا تھا۔ پھر بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ میں بھی کیسا خبطی ہوں۔ چاندنی رات اور ریل گاڑی کا پیارا پہاڑ سے؟ انسان کتنا تنگ نظر ہے۔ وہ اپنے احساسات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔

گاڑی اب نربدا کے اونچے پل پر سے گذر رہی تھی۔ چاند کی تنویر میں اُسے یہ منظر کچھ افسردہ سا محسوس ہوا۔ ایک پھیکی ہنسی کی طرح۔ اُس نے سوچا۔ یہ افسردگی اس منظر میں نہیں۔ میرے دل میں ہے۔ ہر انسان کے دل میں ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں ہے۔ پُل کی گڑگڑاہٹ اور ریل کے پہیوں کی مدھم اور باقاعدہ کھٹ کھٹ کا امتزاج مجھے سنگیت معلوم ہوتا ہے۔ سنگیت جس میں ماتم ہے۔ کسی ٹوٹتے ہوئے دل کا ماتم۔ اس منظر میں وسعت ہے۔ کیونکہ میں ایک بونا ہوں۔ نربدا کا قلیل پانی گہرائی اور شادابی کا احساس دلاتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاٹ میں ریت نہیں، کنکر ہیں۔ کیا سبھی کچھ فریب نظر ہے؟ آخر حقیقت کیا ہے؟

نربدا کے پھیلے ہوئے پانیوں پر چاند کی کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے اُس نے سوچا۔ اگر میں چُپ چاپ اس کھڑکی کے نیچے کود پڑوں۔ تو؟ — ایک خاص رفتار سے۔ جس کا انحصار ازلی اور ابدی قوانین پر ہے۔ جو مجھ پر اور ایک پتھر پر یکساں لاگو ہوتے ہیں۔ میں نیچے گروں گا۔ ایک مخصوص وقت تک۔ جس کا انحصار میرے وزن۔ کرۂ ہوائی کی مزاحمت۔ اور کشش ثقل پر ہے۔ میں نیچے گرتا رہوں گا۔ اور پھر نربدا کا پانی مجھے اپنی گود میں لے گا۔ گاڑی اپنی کھٹ کھٹ اور اپنا ماتمی گیت لئے آہستہ آہستہ اس وسعت میں کھو جائے گی۔ اس خاموش فضا میں اس کی آواز کی گونج ایک معین عرصہ تک مرتعش رہے گی۔ اور پھر یہاں خاموشی مسلط ہو جائے گی — اٹوٹ خاموشی گویا آواز نے یہاں کبھی قدم ہی نہ رکھا ہو۔ گویا یہاں کسی نے سانس تک نہ لیا ہو۔

نوجوانوں کے قہقہے پھر بلند ہوئے۔ اور گھٹتے ہوئے سروالابرار کتاب پڑھنے لگا۔ رفیع نے ایک بار پھر چاندنی کا جائزہ لیا۔ اور سوچا۔ یہ وسیع نظام انسان کی ہستی سے کس قدر بے نیاز ہے۔ اگر دُنیا کے سبھی انسان دم توڑ دیں۔ تو بھی چاندنی اسی طرح اُس کھڈ کو چومتی رہے گی۔ اور نربدا کا پُل اسی طرح اس عظیم وسعت سے گھرا رہے گا۔ ایک لمبے اور نہ شروع ہونے والے عرصہ سے۔ ایک لمبے اور نہ ختم ہونے والے عرصہ تک۔ یہ منظر یونہی رہے گا۔ پانی کے وہ چند قطرے پھر بھی اُس عظیم الشان گہرائی کی تہ میں گونجتے رہیں گے۔ یہاں کی نباتات اسی طرح اُگتی رہے گی۔ جیتی رہے گی۔ اور گل سڑ کر مرتی رہے گی۔ حتےٰ کہ ایک دن کسی سماوی تصادم کے

باعث یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ "رتل پانی" کے اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔ دوشیزہ اور اس کی ماں اُٹھ بیٹھیں اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے دروازے کے پاس جا پہنچیں۔ دوشیزہ نے رفیع کی طرف دیکھا اور انگڑائی لی۔ اس وقت اُس کے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے سرکتے ہوئے دوپٹے کو سنبھالا۔ اور نیچے اُتر گئی۔

یک لخت کسی فوری جذبہ کے زیر اثر رفیع دروازے کی طرف لپکا۔ گھٹے ہوئے سر والے مسافر نے اس کی طرف ایک طنز آمیز مسکراہٹ پھینکی۔ نوجوانوں نے قہقہہ استہزا بلند کیا۔ اور وہ جھینپ کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ......

فکر تونسوی

جینا مرنا ایک کہانی

جنّت میں دو گلاب کے پودوں کے درمیاں
اک سیم تن پری نے تڑپتے ہوئے کہا
"مجھ کو کسی نے آج تلک یہ خبر نہ دی
کیا ہو رہا ہے عرش کی نیلی فضا کے پار
آتے نہیں سمجھ میں یہ دن رات، صبح شام
پڑتے ہیں میرے ذہن کی لہروں میں خم پہ خم
سُنتی ہوں جب ـــــ 'وہ پیدا ہوا ہے'، 'وہ مر گیا'"

لہراتی، جھومتی ہوئی ـــــ رگہائے شاخ میں
خوشبو کی ایک موج اُٹھی، دوڑتی گئی
پلکیں اُٹھائیں، غنچہ بنی، کھلکھلا پڑی
دم بھر کو ایک پھول کے ملبوس میں رہی
پھر پتّی پتّی ہو کے ـــــ زمیں پر بکھر گئی

(ماخوذ)

بلونت سنگھ

بابو مانک لعل جی

مانک لعل عرصۂ سات سال سے لکشمی کیمیکل ورکس میں بحیثیت کلرک ملازم تھا۔

وہ موٹا، اور بے ڈول سا شخص تھا۔ اس کا جسم پلپلا، رنگ مٹیالا، آنکھیں زیادہ لکھنے پڑھنے کی وجہ سے چندھیائی ہوئی، اگر قدرے جھکی ہوئی۔ اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کی طرف گھوم کر اس کی باچھوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ خشخاشی بالوں والے سر پر گاندھی ٹوپی، آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ، گاڑھے کا کرتا، ململ کی دھوتی، اور پاؤں میں عموماً سیاہ رنگ کا پمپ شو پہنتا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو اس کے ہاتھ میں لکڑی کے دستے والی چھتری ضرور ہوتی۔ وہ ناک کی سیدھ میں گردن آگے کو بڑھائے لپکتا ہوا چلتا تھا۔ اس کتے کی طرح جو کسی جانور کی بو پاکر سیدھا اس کی کمین گاہ کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

سورج نکلتے ہی وہ صدر بازار کی طرف چل کھڑا ہوتا۔ اور پھر رات ہو جانے پر لوٹتا تھا۔ جس رفتار اور انداز میں وہ جاتا اسی طرح واپس چلا آتا۔

دکان میں اس کے علاوہ سات ملازم اور تھے۔ ایک اکاؤنٹنٹ باقی چھ ملازم ادھر ادھر کے کاموں کے لئے۔

بڑے لالہ اپنی میز کے قریب کرسی بچھائے پان چبایا کرتے۔ ان کا سر خوب بڑا، آنکھیں روشن، کنپٹیاں چکنی، نتھنے پھولے ہوئے، مونچھیں الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح خوب بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی۔ ان کی گدی کے نیچے گوشت پر تین چار بل پڑے رہتے تھے وہ کرسی پر پاؤں سمیٹے اس طرح بیٹھتے تھے جیسے چارپائی پر بیٹھے ہوں۔ خوب گرجدار آواز میں بولتے اور نت نئی گالیاں سناتے۔

ان کے قریب چھوٹی میز پر اکاؤنٹنٹ بڑی تمکنت اور خاموشی سے بیٹھا کام میں مصروف رہتا۔ لالہ اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرتے تھے۔ شائد اس کا کام ہی کچھ ایسا تھا کہ کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

باقی نوکر ادھر ادھر کے کاموں میں لگے رہتے۔ کوئی بوتلوں پر کارک لگا رہا ہے، کوئی لیبل چپکا رہا ہے، کوئی پیٹیاں بند کر رہا ہے۔ کوئی دوائیاں گھوٹ رہا ہے۔ کوئی گولیاں بنانے والی مشین کا دستہ گھما رہا ہے۔

ان سب میں مانک لعل ہی کی زیادہ شامت آتی تھی۔ مانک لعل بڑے لالہ کی مین سیدھ میں دکان کے پرے کونے میں تخت پوش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے سامنے تخت پوش پر ایک چھوٹی سی ڈیسک دھری ہوتی۔ ڈیسک پر کاغذات کا انبار اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے بہی کھاتے۔

بڑے لالہ کو اگر کوئی بات بھی دریافت کرنی ہوتی۔ تو مانک لعل ہی کو للکارتے۔ "کیوں بے منکے! وہ بلٹی واپس کیوں آئی؟ —— کوہاٹ کو تین وی۔ پی روانہ کر دیئے؟ —— میں جو ڈھائی انچ کیلوں کا بکس لایا تھا وہ کیا ہوا؟ —— اب میری کھڑاؤں کدھر ہیں؟ —— تو مہر والوں کے ہاں گیا تھا؟ —— ٹھیلے والوں کو تاکید کر دی تھی؟" غرض دنیا بھر کی کوئی بات ایسی نہ تھی۔ جس کی جواب طلبی مانک لعل سے نہ کی جاتی۔ شائد لالہ مانک لعل کو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سمجھتے تھے۔ کہ دنیا بھر کی جو بات چاہو دریافت کر لو۔ اور پھر ستم ظریفی یہ تھی کہ لالہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مانک لعل کے پاس ہر بات کا معقول جواب بھی ہونا چاہیئے۔

مانک لعل سب سے پہلے دکان پر پہنچتا۔ اس وقت نوکر جھاڑو دے رہا ہوتا۔ نوکر صفائی سے فارغ ہوتا تو مانک لعل اپنی ڈیسک کے قریب بیٹھے بیٹھے سوچتا کہ گرد اڑ کر بڑے لالہ کی میز پر جا پڑی ہے۔ نوکر کس قدر بے وقوف ہے۔ اسے اتنی بھی تمیز نہیں کہ فرش پر جھاڑو دینے کے بعد کم از کم بڑے لالہ جی کی میز ہی صاف کر دیا کرے۔ چنانچہ

یہ سوچ کر وہ ڈرتے ڈرتے بڑے لالہ کی میز کے قریب جاتا اور دیکھتا کہ واقعی میز کی ہر چیز پر گرد کی باریک سی تہ جم گئی ہے۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا۔ جیسے وہ چوری کرنے جا رہا ہو۔ پھر جھاڑن لے کر بڑی احتیاط سے میز کی ہر شے صاف کر دیتا۔

رفتہ رفتہ دکان میں چہل پہل بڑھ جاتی۔ باقی نوکر بھی پہنچ جاتے۔ دس بجے کے قریب لالہ بھینسے کی طرح گردن ہلاتے ہوئے آتے۔ اکاؤنٹنٹ ان کے ہمراہ ہوتا۔ لالہ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بڑی گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ اہم کاموں میں اسی کا مشورہ طلب کرتے۔ ویسے عام گفتگو میں بھی اسے تم یا تو کہہ کر مخاطب نہ کرتے تھے۔ آتے ہی بڑے لالہ پہلے تو دکان کے اندر والے کمروں کا مختصر سا چکر لگاتے۔ پھر نوکروں کو مختلف ہدایتیں دینے کے بعد واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھتے۔

انگوچھے سے گردن اور پیشانی پونچھتے ہوئے وہ میز پر پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیتے۔ یکایک انہیں کل کی ڈاک کا خیال آ جاتا۔ جو اکثر وہ گھر ہی پر بھول آتے تھے۔ لیکن سمجھتے یہ کہ وہ خطوط میز ہی پہ پڑے تھے۔ وہ للکار کر کہتے۔ "منکے!"

مانک لعل دسویں پاس کرنے کے فوراً ہی بعد بڑی سفارش سے لالہ کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک لالہ اسے "منکا" ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ مانک لعل اپنی ڈیسک پر جھکا ہوا کام میں مصروف ہوتا تھا۔ لالہ کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

"جی! لالہ جی! جی!......"

بڑے لالہ اپنا بڑا سا منہ پھیلا کر کہتے "کیوں بے! آج صبح میری میز کس نے صاف کی تھی؟"

وہ ہکلا کر کہتا۔ "لالہ جی! جی لالہ جی!"

لالہ جی اس پر کڑی نظریں گاڑ کر کہتے "ابے "جی لالہ جی" کے بچے! میری میز کو کس نے چھوا تھا؟"

"جی لالہ جی........ میں نے ــــ ذرا گرد جھاڑی تھی۔"

"میں پہلے ہی جانتا تھا۔ تو نہ گرد جھاڑے گا تو اور کون جھاڑے گا؟ ــــ ابے گرد جھاڑی یا سب چیزیں ہی جھاڑ ڈالیں؟"

مانک لعل کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ لالہ حلق سے آواز نکال کر کہتے۔ "ابے گدھے! تجھ سے کس نے کہا تھا۔ کہ میری میز کی گرد جھاڑا کر۔"

اس طرح مانک لعل کو سیوا کا میوہ ملتا۔ اس کے سپرد ایک قسم کا کام بھی تو نہ تھا۔ بلکہ اس سے دنیا بھر کے کام لئے جاتے تھے۔ لالہ کہتے "منکے! ابے ٹھیلے والوں کو کیا ہو گیا؟ پیٹیاں پڑی سڑتی ہیں۔"

مانک لعل کے ہاتھ اُٹھ کر جڑ جاتے "جی لالہ جی....... میں ...... میں۔"

"ابے میں میں کیا کرتا ہے۔ جا پتہ لگا! جا کر...... میں میں...... میں میں"

مانک لعل اسی وقت شو پہن کر ہاتھ میں چھتری لیتا اور گردن آگے کو بڑھائے ٹھیلے والوں کی طرف روانہ ہو جاتا۔ جب وہ ٹھیلے والوں کے قریب پہنچتا۔ تو دور ہی سے اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے۔

ٹھیلے والے سب کے سب مسلمان تھے۔ وہ لوگ بہت مضبوط اور اکھڑ تھے۔ سر اُستروں سے گھٹوائے ہوئے میلے تہبند باندھے ایک دوسرے کی رانوں پر ہاتھ مار مار کر ہنستے۔ ان کے منہ کے دہانے خونخوار درندوں سے مشابہ تھے۔ مانک لعل ان کے ہاں جانے سے بہت کتراتا تھا۔ وہ عموماً ان کے اڈے سے ادھر ہی پنواڑی کی دکان پر رک جاتا۔ پسینہ پونچھتا۔ اپنے جوتوں پر سے گرد جھاڑتا۔ پان کی گلوری کلے میں دبا کر پنواڑی سے بتیسی نکال کر ہنستے ہوئے پوچھتا "کہو بھائی! کوئی دنگا فساد تو نہیں ہوا نا!...... بھئی یہ ٹھیلے والے تم جانتے ہی ہو......"

جب پنواڑی سے اسے تسلی بخش جواب ملتا۔ تو وہ ایک لمبی اور گہری سانس لیتا۔ اور سپاری کے پانچ سات ٹکڑے دانتوں میں چباتے ہوئے آگے روانہ ہو جاتا۔ جب ٹھیلے والوں کی وحشی صورتیں دکھائی دیتیں تو دور ہی سے قدم لڑکھڑانے لگتے۔ چھتری کے پیچھے چھپا ہوا اس انداز سے آگے بڑھتا جیسے خطرے کی بو پاتے ہی سرپٹ بھاگ نکلے گا۔

لیکن وُہ بچارا اس قدر بے ضرر طبیعت کا مالک تھا۔ کہ کسی شخص کو اسے ایذا پہنچانے کا خیال تک نہ آسکتا تھا۔ جب وُہ ٹھیلے والوں کے چودھری عبداللہ کو دیکھتا تو خوب کھکھیا کر ہنستا اور اپنی چندھی آنکھوں سے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتا کہ جواب میں وُہ بھی ہنستا ہے یا نہیں ...... عموماً چودھری اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا تھا۔ وُہ بلند آواز میں پکار کر کہتا " آیئے بابو جی! ـــــ ارے بھائی بابو جی کے لئے کرسی لاؤ۔"

مانک لعل "بابو جی" کے الفاظ سن کر بہت خوش ہوتا۔ چھتری بند کرتے ہوئے بکری کی طرح ممیا کر کہتا " ارے بھائی کرسی کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہیں بیٹھ جاؤں گا۔"

لیکن جب تک ایک بازو والی ٹوٹی پھوٹی کرسی نہ آجاتی وُہ کھڑا رہتا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وُہ کہتا " اجی چودھری جی کہاں رہتے ہو۔ کبھی دکھائی نہیں دیتے۔"

اس کے بعد مانک لعل اصل مدعا بیان کرتا۔ تو ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ٹھیلے والے کہتے " بابو! تمہارے لالہ کا مجاج ٹھکانے نہیں رہا۔ جب جاؤ گالیاں بکنے لگتا ہے ......"

مانک لعل سہم جاتا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ وُہ سمجھتا تھا۔ کہ ان لوگوں سے یہ بھی بعید نہیں کہ چپکے سے چاقو نکال کر پیٹ میں بھونک دیں۔ جب وُہ تصور میں اپنی لاش دیکھتا تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔

پھر وُہ بڑے لالہ کی حمایت میں کچھ نہ کچھ کہتا " لالہ دل کے بُرے نہیں۔ ہاں زبان پر قابو نہیں ......" اس کے بعد وُہ تھنے پھُلا کر اپنی طرف اشارہ کر کے کہتا " اور تو اور وُہ مجھی کو سرد گرم کہنے سے نہیں چوکتے۔" اور پھر آنکھیں نکال کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا " ...... میں بھی اکڑ جاتا ہوں لعض دفعہ۔"

ٹھیلے والوں میں سے کوئی کھانس کر تھوکتے ہوئے کہتا " بابو جی! بڑے لالہ کا مجاج تو ہم ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیں۔ اجی بس تمہارے مجاج سے آنکھ نہیں اُٹھتی۔"

اس پر مانک لعل ریشہ خطمی ہو جاتا۔

اگر کبھی دکان میں بیٹھے بیٹھے بڑے لالہ کو کوئی بات یاد آجاتی مثلاً آج بچے روٹی کھائے بغیر ہی اسکول چلے گئے ہیں تو وُہ پھر مانک لعل کو آواز دیتے " مُنکے "۔

ان کی آواز کے ساتھ ہی مانک لعل بدک جاتا۔ جس ہاتھ میں قلم ہوتا اس کی اُنگلیاں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ فوراً اُٹھ کر دھوتی سنبھالتا ہوا لالہ کے قریب جا کھڑا ہوتا ...... ادھر لالہ آواز دے کر بھول جاتے کہ اُنہوں نے ہی اسے بلایا تھا۔ وُہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتے اور مانک لعل ان کی میز کے قریب چپ چاپ کھڑا رہتا کہ لالہ کام ختم کر کے خود ہی کچھ کہیں گے۔ چند لمحوں کے بعد لالہ سر اُٹھاتے اور تعجب سے پوچھتے " کہو کیسے کھڑے ہو۔"

مانک لعل دل کڑا کر کے کہتے " جی لالہ جی۔ آپ ہی نے تو آواز دی تھی مجھے۔"

پیشتر اس کے کہ اُن کے مُنہ سے کوئی مفرح گالی نکلے انہیں اصل بات یاد آجاتی۔ " ارے ہاں! پانشی اور ٹینو روٹی کھائے بغیر ہی اسکول چلے گئے ہیں۔ تم گھر سے روٹی لے جاؤ اور انہیں کھلا کر فوراً واپس آجاؤ۔"

مانک لعل حسب عادت لپک کر جاتا اور ان کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتا۔ پہلے تو گھر کی نوکرانی کالی کلوٹی بارہ سالہ لڑکی آن صورت دکھاتی۔ مانک لعل کو دیکھ کر نہ معلوم اس کی باچھیں چرکیوں جاتیں۔ وُہ اس چھوکری کے سامنے بڑی سنجیدگی اور وقار سے گفتگو کرتا اور اسے مرعوب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا لیکن وُہ مردود دیدے چمکاتے ہی جاتی۔ کالے بھجنگ چہرے میں بے طرح پھٹے ہوئے مُنہ کے دہانے میں سے سپید سپید دانت دکھائی دیتے۔ ایک تو کمبخت بات ہی نہ سمجھ پاتی تھی۔ اور دوسرے اس کا دھیان بھی اور ہی کسی طرف ہوتا تھا۔ کبھی اپنی چوٹی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کبھی دروازہ پکڑ کر ادھر اُدھر جھول رہی ہے۔ بڑی مشکل سے کہیں اندر جا کر اس کے آنے کی خبر دیتی۔ پلپلے ٹماٹر کی سی لالائین دروازے کے قریب آن کھڑی ہوتی۔ مانک لعل زیادہ سے زیادہ لالائین کے پھولے ہوئے گورے

گورے ہاتھ یا کہنیوں تک بازو ہی دیکھ پاتا تھا۔ لالائین پوچھتی "اجی روٹی لے جانے آپ کو بھیجا ہے انہوں نے؟"

مانک لعل اس میں اپنی تضحیک کا پہلو سمجھ جاتا۔ اور کھانس کر کہتا۔ "آخ ...... اخ ...... خ خود ہی چلا آیا۔ ہیں۔ میں نے لالہ سے کہا۔ میں ہی بچوں کو روٹی دے آتا ہوں۔ اور پھر انہیں دیکھ بھی آؤں گا۔ دھوپ میں نہ کھیلتے ہوں کہیں۔ آج کل دھوپ تیز ہے۔ موسم بھی اچھا نہیں۔"

لالائین، کالی چھوکری کو آواز دے کر کہتی "اری منیب جی کو مونڈھا لا کر دے"

مانک لعل دھوپ ہی میں چھتری تان کر مونڈھے پر بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھار لالائین بڑے اصرار سے اپنی دانست میں میٹھے سوڈے کا ادھیا بھی پلا دیتیں۔ لیکن وہ بیشتر کھاری ہوتا۔ غالباً چھوکری دو پیسے میں سے ایک پیسہ بچا کر ایک پیسہ کا کھاری سوڈا لے آتی۔

یہی نہیں مانک لعل اپنے سے کم درجے کے نوکروں کی خوشنودی کا بھی خیال رکھتا تھا۔ نوکر اس کی ذرہ بھر بھی عزت نہ کرتے تھے۔ کبھی لالہ چلا کر کہتے "ابے حرامزادو! ابھی تک پیٹی میں کیل بھی نہیں جڑے"

اور سب تو کان دبا کر ادھر اُدھر سرک جاتے۔ البتہ مانک لعل جھٹ اٹھ کر پیٹیوں میں کیل جڑنے لگتا۔ اور جس وقت وہ بیچارا کیل جڑ رہا ہوتا۔ تو دبی دبی نظروں سے دوسرے نوکروں کی طرف بھی دیکھتا جاتا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرتا کہ وہ لوگ بھی اس کی مدد کریں لیکن وہ سب ایسے منہ پھیر لیتے جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔ پھر اگر لالہ کی اس پر نظر جا پڑتی تو اپنی گرجدار آواز میں کہتے "منکے! اکیل جڑ رہے ہو کیا؟"

وہ مسکین آواز میں جواب دیتا "جی لالہ جی!"

پھر وہ تھوڑی دیر تک منتظر رہتا کہ شائد لالہ دوسرے نوکروں پر خفا ہوں کہ وہ اس کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ لیکن لالہ بس اتنی ہی بات پوچھ کر اپنے کام میں منہمک ہو جاتے۔

لیکن جب کبھی نوکروں کا اپنا کام آن پڑتا تو وہ ذرا سا خوشامدانہ لہجہ اختیار کر لیتے۔ ادھر مانک لعل فوراً ہتھیار ڈال دیتا۔ اپنے فرصت کے گھنٹے انہی کے کاموں میں صرف کر دیتا۔ کسی کی انجن مارکہ گھڑی مرمت طلب ہے۔ کسی کو نیا جوتا لے کر دینا ہے۔ کسی کی دھوتی پھٹ گئی ہے۔

تہوار کا دن ہوتا۔ تو سب ملازم مانک لعل کو آن گھیرتے مشورہ کرتے کہ دوسرے دن کی چھٹی منائی جائے۔ دوسری دکانوں پر بھی کام بند رہے گا۔ بڑا شاندار میلہ لگے گا۔ وہاں عورتیں خوب بن ٹھن کر آئیں گی۔ خوب مزے سے گذرے گی۔

ان سب میں خوب کھچڑی پکتی۔ مانک لعل کی تھوڑی بہت خوشامد کی جاتی۔ "اجی بابو جی! ---- لالہ آپ کا کہنا کہاں موڑیں گے۔ ہماری طرف سے کہدو ناکہ ڈولی مولی کا میلہ ہے۔ اور دکانیں بھی بند رہیں گی۔ آپ بھی چھٹی کر دیجئے نا!"

ادھر نوکروں کے خوشامدانہ کلمے۔ ادھر بڑے لالہ کا خوف۔ مانک لعل عجب مخمصے میں گرفتار ہو جاتا۔ بالآخر مانک لعل کہتا "بھئی! دیکھو اصل طریقہ یہ ہے کہ ایک عرضی اس مطلب کی لکھ دی جائے۔ اس پر سب لوگ دستخط کر دیں۔ اور میں وہ عرضی لالہ جی کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

چنانچہ عرضی لکھی جاتی۔ سب لوگ دستخط کر دیتے یا انگوٹھے لگا دیتے۔ لیکن مانک لعل کبھی دستخط نہ کرتا۔ وہ ڈرتا تھا مبادا بڑے لالہ سمجھیں کہ وہی سب نوکروں کو بہکاتا ہے۔

جب بڑے لالہ دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آتے تو میز پر عرضی پڑی دیکھ کر پکارتے "منکے!"

مانک لعل بھاگ کر ان کے قریب جاتا اور ہاتھ سہلاتے ہوئے نوکروں کا مطالبہ بیان کرتا۔ چنانچہ چھٹی منظور ہو جاتی۔

دوسرے روز سب لوگ تو مزے میں چھٹی مناتے۔ لیکن مانک لعل حسب معمول کپڑے پہنتا اور لالہ کے گھر پہنچ کر آواز دیتا۔

لالہ جی صحن میں بیٹھے بیٹھے پکارتے "منکے!"

مانک لعل باہر ہی زمین پر بچھا جاتا "جی لالہ جی"

لالہ جی فوراً اسی چھوکری کے ہاتھ دکان کی چابیاں باہر بھیج دیتے۔ اور آواز دے کر کہتے "جھاڑو واڑو لگا دو۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔"

اس دن بجائے نوکر کے دکان میں مانک لعل ہی جھاڑو دیتا۔ پھر لالہ آجاتے۔ کہتے "بھئی ان پیٹیوں میں سارسپریلا کی شیشیاں بند کردو۔" یا چٹھیوں کے انبار کی طرف دیکھ کر کہتے "منگلے یہ دو چار چٹھیاں پڑی ہیں ان کے جواب ہی لکھ ڈالو۔" اس کے بعد وی۔پی کرانے کے لئے ڈاکخانے بھیج دیتے یہ کام ختم ہوتا تو بنک سے بلٹیاں لانے کے لئے روانہ کردیتے۔ اس ہیرا پھیری میں چار بجنے کو ہوتے یعنی مکمل چھٹی سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دفعتاً چونک کر آواز دیتے "بابو مانک لعل جی"۔

کبھی کبھی بڑے لالہ اسے مانک لعل جی کہہ کر بھی پکارتے تھے۔ مانک لعل کو ان کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ بڑے لالہ اس کو اس قدر احترام سے بلاتے تو وہ نہال ہو جاتا۔ اس کے دل کی ساری کدورت اور جسم کی تکان دور ہوجاتی۔ وہ ادھر اُدھر جھانک کر دیکھتا کہ کسی اور نے بھی سنا یا نہیں۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر وہ خاص طور پر میٹھی آواز میں جواب دیتا "جی لالہ جی!"

یہ کہہ کر وہ لالہ جی کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ اس وقت اس کی ناک کی نوک پر خون کی سرخی جھلکتی ہوتی۔ بڑے لالہ بڑی فراخدلی سے کہتے "بھئی بابو مانک لعل جی! جاؤ تم بھی چھٹی مناؤ۔ ارے بھئی کام وام تو ہوتا ہی رہے گی۔ جاؤ موج کرو۔"

یوں تو مانک لعل میرے پڑوسی ہی تھے۔ لیکن ہمارے تعلقات استوار اس وقت ہوئے تھے جب مجھے اپنی بچی کے لئے اوولٹین کی ضرورت پڑی۔ جنگ کی وجہ سے کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ تو میں نے مانک لعل سے کہا اور اس نے بڑے لالہ سے کہہ کر مجھے ایک ڈبہ دلوا دیا۔

اس کے بعد ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ عموماً وہ کسی شخص سے راہ و رسم نہ رکھتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ البتہ مجھے اپنی بعض باتوں میں رازدان بنانے میں چنداں حرج نہ سمجھتا تھا۔

اُس کے گھر میں اس کی بیوی، دو بچے، بوڑھا باپ اور ایک بیوہ بہن تھی۔ باپ کی بینائی بہت کمزور تھی۔ بیٹھا رام نام جپتا اور ناریل کے دم لگاتا۔ بیوی غلیظ نتھنوں والی ایک باتونی عورت تھی۔ بچے چھچھوندروں کی طرح مارے مارے پھرتے۔ بہن کا کسی غیر مرد سے یارانہ تھا۔ وہ بڑی ہنسوڑ اور باذوق عورت تھی۔ شکل و صورت تو خیر غنیمت ہی تھی۔ البتہ ناز و ادا کی کمی نہ تھی۔ خوب چکنی چپڑی بنی ٹھنی رہتی۔ دن بھر مٹک مٹک کر ادھر ادھر گھوما کرتی۔ جب چلتی تو اس کی ایڑیاں زمین کو نہ چھوتی تھیں۔ اسے لذیذ کھانے پکانے میں بڑی مہارت تھی۔

مانک لعل بہن کے عشق سے ناواقف نہ تھا۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکتا تھا۔ وہ سب سے ڈرتا تھا۔ بیوی سے، باپ سے، بہن سے، بچوں سے، غرض ہر ایک سے دب کر رہتا۔

جب وہ شام کے وقت تھکا ماندہ گھر واپس آتا تو جوتے اُتار کر چارپائی پر بیٹھا پاؤں سہلایا کرتا۔ بچے ٹین بجاتے ہوئے باپ کی چارپائی کے چکر کاٹتے۔ جب نہا دھو کر وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کی بیوی اس کی بہن کی لگائی بجھائی کرتی۔ اور وہ ہوں ہاں کرتا ہوا جلدی جلدی کھانا ختم کر کے صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ جاتا۔

اس کی بہن اس کی برملا تعریف کرتی۔ کہتی "میرا بھیا تو ہیرا ہے ہیرا" بھاوج ناک سکوڑ کر کہتی "ہاں ہاں ہیرا نہ ہوتا تو اس طرح بغلیں بجاتی ہوئی محلہ بھر کا کونا کھدرا نہ سونگھتی پھرتی۔"

اس پر نند بگڑ جاتی۔ وہ بھی بڑی لڑاکا تھی۔ طعنہ زنی اور جلی کٹی سنانے میں وہ بھی بھاوج سے کم نہ تھی بلکہ دو جوتے آگے ہی تھی۔ اس نے بھاوج کا جھوٹ موٹ کا عاشق گھڑ لیا تھا۔ جب بھاوج اسے زیادہ دق کرتی تو وہ اسے اس کے فرضی عاشق کے طعنے دینے لگتی۔

اس بات پر بھاوج جل بھن کر کباب ہو جاتی۔ آخر اس دیدہ

دلیری کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ جب نند کی زبان لتر لتر چلنے لگتی تو بھاوج سے کچھ جواب ہی نہ بن پڑتا۔ یہاں تک کہ وہ رونے لگتی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتی ہائے میرے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ جو اس کے پلّے بندھی۔ اس سے بہتر تھا ماں باپ نے افیون ہی کھلادی ہوتی۔

یقیناً یہ بھی بڑی دکھ کی بات کہ پتی برتا عورت پر غیر مرد سے ربط و ضبط کا الزام لگایا جائے۔ بھاوج میں ہزار عیب سہی لیکن تھی وہ پاکباز۔ جب اس کا خاوند گھر آتا تو وہ رو رو کر اسے اپنا دکھڑا سناتی۔ مانک لعل بے توجہی سے سُنا کرتا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ اپنی بہن سے خوف کھاتا تھا۔ بہن سے زیادہ اسے اس کے عاشق سے ڈر لگتا تھا۔ اگر وہ آنکھوں میں کاجل لگائے گلے میں سونے کا تعویذ لٹکائے کہیں اینڈ اینڈ کر گھومتا ہوا نظر آجائے تو بجائے اس کے کہ اس کی رگِ حمیت پھڑکے وہ خود ہی نظر بچا کر ادھر ادھر کھسک جاتا۔ ساتھ والی ویران باغیچی کے اس گوشے سے بھی وہ واقف تھا۔ جہاں اس نے عاشق و معشوق کو بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کان لپیٹ کر چپکے سے اس طرح گذر جاتا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

اسی پر بس نہ تھی بلکہ وہ اپنی بیوی کی نظر بچا کر بہن کو جیب خرچ کے لیے روپیہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ چاہتا تھا کہ اسکی بہن اپنے آشنا سے تعلق نہ رکھے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ جیب خرچ دینے میں بھی یہی مصلحت تھی کہ اس کی بہن خوش رہے اور اپنے عاشق سے تعلق توڑ لے۔

چاندنی راتوں کو میں اپنی چھت پر سے جھانک کر دیکھتا تو مانک لعل چارپائی پر لیٹا نظر آتا۔ اس کا کدو کی طرح گول سر اور بالشت بھر کی ٹانگیں قینچی کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی باریک آواز میں چلّا کر کہتا "کہیئے"

وہ زیادہ باتیں نہ کرتا تھا۔ کبھی کہتا" اجی کھڑادیں بڑی مہنگی ہو گئی ہیں" یا "ارے صاحب کہیں سے تلسی جی کا پودا لادیجئے نا!" — اور اگر کہیں اس کی بیوی یہ بتانے کے لئے کہ ان کا پودا بالکل خشک ہو گیا ہے کچھ کہنے لگتی تو وہ اسے کم از کم اس بات پر سرزنش کرنے سے ہرگز نہ چوکتا" للّے کی ماتا! تجھے میں نے اتی دفے منع کیا ہے کہ تو مردوں کی بیچ میں مت بولا کر۔"

ایک مرتبہ میں صدر بازار سے گذر رہا تھا۔ دو تین روز سے مانک لعل سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سوچا چلو ملتا جاؤں —— دوکان پر پہنچا تو دیکھا کہ مانک لعل حسب معمول اپنے ڈسک پر جھکا ہوا ہے۔ چہرہ بھی کچھ اُترا ہوا ہے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور جھکے جھکے سرگوشی میں بولا" آپ بیٹھے رہیئے۔ لالہ روٹی کھانے کے لیے جانے والے ہیں۔ پھر ہم باتیں کریں گے"

لالہ کے چلے جانے کے بعد اس نے کہا کہ اس ملازمت سے بیزار ہو چکا ہوں۔ جلد از جلد خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی سول سپلائز کے محکمے میں میرا کچھ رسوخ ہے۔ کیا تعجب اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔ وہ اس پر رضامند ہو گیا۔ میں نے مزید تسلّی دی۔ اور جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو اس نے بار بار تاکید کی۔ کہ میں اسی دن ملازمت کی بابت پتہ لگاؤں۔ میں نے وعدہ کیا اور چلا آیا۔

لیکن اس دن میں اس قدر مصروف رہا کہ مانک لعل کا کام نہ کر سکا۔ سوچا دوسرے دن چلا جاؤں گا۔ شام کے وقت بازار سے گذر رہا تھا۔ کہ مانک لعل ایک دوکان کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ میں نے نظر بچا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اور آواز دے کر بلا لیا۔ بڑا خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔

چہک کر بولا" یہ ہمارے بڑے لالہ جی کے بچے ہیں۔ یہ پاشی اور یہ ٹینو۔ انہیں بنیائنیں خرید کر دے رہا ہوں۔"

بچے چیزیں خرید کر ہنستے کھیلتے ہوئے گھر کی جانب چل دیئے۔ ہم دونو باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ کہ کہیں ملازمت کی بابت نہ پوچھ بیٹھے۔ لیکن اس نے کہا۔" اگر آپ کسی کام سے جا رہے ہیں تو چلئے۔ مجھے ابھی کچھ دیر لگے گی۔ میں ان بچوں کو گھر تک چھوڑ آؤں۔"

جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو بولا" اور ہاں وہ ملازمت ...." میں گھبرا گیا۔ عذر کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا" ابھی رہنے دیجئے۔ میں نے موجودہ ملازمت چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔" پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔

" بڑے لالہ دل کے اتنے برے نہیں...... آج میری ان سے جھڑپ ہو گئی تھی...... میں نے کہا لالہ جی آپ مجھے بہت دق کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر مانک لعل نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ہنسی نکلی پڑتی تھی۔ جیسے کوئی بڑی ہی مسرت انگیز بات اس کے سینہ میں کروٹیں لے رہی ہو۔

بڑی محبت سے مانک لعل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" شام کے وقت جب میں پاشی کی سائیکل میں ہوا بھر رہا تھا۔ تو لالہ نے مجھے آواز دی " بابو مانک لعل جی!" جب میں ان کے قریب پہنچا تو بولے" آج بچوں کو جوتے اور بنیائنیں خرید دیجئے میں اور کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا بابو مانک لعل جی!"

شکنجہ

ابوالفضل صدیقی

جب اس کے دادا پر انیسویں صدی کے آخری حصے میں فوجداری کا مقدمہ پڑا تھا تو انہوں نے اپنی کل کی کل بیسوں بیگہ موروثی زمین گروی کر کے پچھتر روپے دروغ جی کی نذر کئے تھے۔ اس کے بعد دو پشتیں گذر گئیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ جیٹھ بیساکھ کی لوؤں اور دھوپوں نے زمین کی جان نکالی اور کتنی مرتبہ اساڑھ ساون کی بھرنوں نے نئی رُوح دوڑائی، ماہ پوس کے چلّے نے بارہا ساکن و جامد کیا اور برج حمل کے آفتاب کی کرنوں نے حیاتِ نو دوڑا کر گیہوں کے خوشوں میں زندگی کے جراثیم کی تولید کی اور ہرے ہرے گنوں کی بوتلیں ٹھنڈے ٹھنڈے، میٹھے میٹھے رس سے بھر بھر کر کام و دہن کو سکون و عیش دیتی ہوئی سفید سفید شکر میں تبدیل ہو ہو کر خالی ہوئیں، اور پھر بھریں اور خالی ہوئیں، کتنی مرتبہ وسیع و روشن کھلیان آباد ہو ہو کر سنسان ہوئے اور تنگ و تاریک کٹھیاں اور کھتیاں پُر ہو ہو کر خالی ہوئیں۔ انسان و حیوان نے داد و ستد کے فطری اصول کے تحت نہ جانے کتنی دفعہ غلّہ اور بھوسہ فضلے کی شکل میں کھیتوں کو واپس دیا اور کھیتوں سے قلبِ ماہیّت کر کے پھر واپس لیا۔ خدا جانے کتنی مرتبہ بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند کی مرطوب ہوائیں مانسون بن بن کر ہمالیہ کے پتھروں سے ٹکرائیں اور پلٹیں۔ اور سوکھی زمین کو پانی کی شفاف چادر سے ڈھانکتی اور موسم کی گرمی کی مدد سے ملک کو جنّت نشان بناتی چلی گئیں۔ کتنے ہی نقش صفحۂ قرطاس پر اُبھرے اور زمانے کے مطالبے کی ہوا کے جھکڑوں سے اُڑتے چلے گئے۔ پیداوار اور نرخ، نرخ اور پیداوار کے توازن و تناسب کی نہ معلوم کتنی کُشتیاں ہوئیں۔ مگر انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے وسط تک کوئی آئین بجز مبلغ پچھتّر روپے ساہوکار جی کے قرض کی نقد ادائیگی کے کامیاب نہ ہو سکا۔ جس کے سُود میں تیسری چوتھی پُشت میں ساہوکار جی بیس بیگہ موروثی دخیلکار کا منافع کھا رہے تھے۔ اور تین چار پشت سے برابر کوملا کے پیٹ کی روزی دوسروں کی زمین پر اُگ رہی تھی۔ سوا اس کے کہ اپنے باپ دادا کی طرح تیری میری مزدوری یا کبھی کبھی زمیندار یا ساہوکار کے یہاں کی بیگار، ورنہ گائے بکری کے لئے راستوں کے کناروں اور بنجروں پر سے باریک باریک "دوچھولا" ہری ہری دُوب کھودتے اور بن سے پتے لاتے ——— کبھی اپنی چپہ بھر زمین پر ہل یا درانتی چلاتے نہیں دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ کس مپرسی کی چوتھی پشت میں کوملا کے گھر میں بھوک اور پیاس کی عملی تشکیل بیٹا جوان ہو گیا۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل، ماں باپ کا بیٹا پریشان حال اور پریشان روزگار، دادا دادی کا پوتا بغیر دونوں وقت روٹی ملے بھی جوان ہو گیا۔ اور جنگلی گلاب کی طرح شاداب اور ڈھاک کی طرح مضبوط و بھڑکتا شباب گیندن پر بھی آیا۔ جیسا سنسان صحرائی وسعتوں کے پروردہ شبان زادوں پر بالعموم آتا ہے اور اٹھارہ ہی سال کی عمر میں بھوک اور فاقے کی آغوش میں سے لوہے کی لاٹ، کوروں کا لٹھا بن کر نکلا۔

یوں تو کہنے کو عام مزدوری ۳ ر یومیہ اور دو روٹی کا ریٹ گاؤں میں تھا۔ مگر عام کاشتکاروں کے یہاں بالعموم مزدور چلتا بھی کم تھا۔ اور اگر اس زمانے میں جس زمانے میں زمیندار کے ہاں کام ہوتا ہو اگر کوئی کاشتکار کے یہاں مزدوری پر جاتا تو زمیندار کے مقدم اور مختار بالجبر پکڑ کر زمیندار کے کام پر لگا دیتے اور شام کو ۱؎ ر ہاتھ میں تھما دیئے جاتے۔ ساہوجی البتہ ان مخصوص مزدوروں کو اپنے کام پر بلاتے جن کی گویا "رزّاقی" ان کے ذمّے ہوتی اور وہ بدنصیب مزدور شام کو رقم سود میں ۱؎ ر وصولی ڈلوا کر اور ہاتھ جھاڑ کر گھر جا پڑتا۔ سوا سیر آٹا کھانے والا گیندن بہت جلد اس بھوک، جبر اور روایات کے نظام سے بیزار ہو کر گاؤں سے چل دیا۔ پہلے تو شہر میں ملازم ہوا اور پھر وہیں سے دو تین مہینے بعد فوج کی ملازمت کا نقشہ تصدیق ہونے آ گیا۔ اور دوسرے ہی مہینے بارہ روپیہ ماہوار باپ کے نام

کٹوا دیئے۔ اور ہر ماہ بارہ روپیہ کوملا کے ہاتھ میں گھر بیٹھے چٹھی رساں دے جایا کرتا —— چھ ہی مہینے بارہ روپے ماہوار آنے پائے تھے کہ کوملا گاؤں کے اندر گنتی کے آدمیوں میں شمار ہونے لگا۔

”آدمی کے تین پن ہوت ہیں مالُم (معلوم) دیت ہے کوملا کا تیسرو پن سنبھل گیا“۔

”پن کیوں نا ہے سنبھلے — بارہ روپیہ مہینہ چلے آوت ہیں بلیا کے سے کھرچ“

”ہاں جی کا ہو کسان کو ایک ہل گھوڑا سا چلے گو نو سال بھر ہیں۔ چار اوپہ سات بیسی (ایک سو چوالیس) ناہیں بچائے ملیں گے“!

”ارے پشتن سے (پشتوں سے) اسے روٹی پہ دھر کے روٹی نائے ملی۔ اب دیکھو کیسو مجا (مزہ) مار رہو ہے“۔

اور کوملا کا خرچ بھی کیا تھا۔ گیندن کی روزی سرکاری گوداموں میں سے درۂ خیبر تک پر لگا کر اڑتی تھی۔ ایک بڑھیا ایک خود اور ایک پانچسالہ بچی۔ ان تین پیٹوں کے لئے کوملا دوڑ دھوپ کرکے صبح سے شام تک دو وقت نہیں تو ڈیڑھ وقت کا سامان اپنی قوتِ بازو سے کر ہی لیا کرتا۔ اور بارہ کے بارہ روپے دیوار کے کونے میں گڑی ہوئی مٹی کی کلھیا میں ڈال کر بدستور بند کرکے اور مٹی لگا کر اوپر سے پنڈول سے پوت کر یکساں کر دیتا اس نے حساب لگا لیا تھا۔ کہ ۸ ماہوار مزدوری میں سے بچا کر اور چھ مہینے کی تنخواہ جمع کرکے پچہتر روپے ساہو جی کے ہاتھ پہ رکھ دے گا۔ اور اپنی آبائی زمین چھڑا کر آئندہ سال سے ”کھیتی کسنئی کا ڈول“ ڈالے گا۔ اگرچہ ابھی تک سرکاری خزانے کا ایک پیسہ بھی کوملا کے پیٹ میں نہ پہنچا تھا اور وہ سب کا سب جیوں کا تیوں ڈاکخانے سے چل کر براہ راست کچی دیوار کی مٹی کی تاریکی میں جا چھپتا تھا۔ مگر اقبال مند حکومت کے پیسے میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے ان دنوں کوملا کی گائے نے بھی دودھ خوب دیا اور بکری بھی تین بچوں سے بیائی اور محنت مزدوری بھی اچھی لگتی رہی اور آنیوالے سال کی زریں امیدوں، سب نے مل کر اس کے ہمہ وقت ”سوال“ دجود اور ”بھوک“ چہرے اور ”انتشار“ بشرے پر سکون اور اطمینان کے آثار پیدا کر دیئے۔ ساتویں مہینے کے تین ہی چار روز گذرے تھے خلاف اُمید اور اپنی باری سے مختلف دن، کوملا نے چٹھی رساں کی آواز صبح تڑکے دروازے پر سُنی۔ کوملا خوش اور متعجب سا باہر آیا۔ مگر بجائے منی آرڈر کے ملیے ٹیالے موٹے کاغذ والے فارم کے اس کے ہاتھ میں آج ایک بادامی لفافہ تھا۔

”تار ہے بھیّا —— تار ——“ دیلیج پوسٹ مین نے نیچے کو سر جھکا کر مری ہوئی سی آواز میں کہا۔

”ایں تار!؟ بھیّا کا دار تار!؟ کوملا نے مخصوص تار Recive کرنے والے ہندوستانی اور پھر دیہاتی ہندوستانی ذالے انداز میں کہا۔

”ہاں بھیا —— تار ہے آج —— آج بد خبر ہے —— تمہارے گیندن گذر گئے۔“ چٹھی رساں نے تار کا بادامی لفافہ کوملا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

تار کا نام سُنتے ہی کوملا کے ایک گھونسا سا لگا تھا۔ وہ اپنی عمر میں کئی تار سُن چکا تھا۔ جب زمیندار کی بہو جی کا مرض گاؤں کے دیدجی اور پھر اس کے بعد قصبے کے حکیم جی اور شہر کے پرانے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر صاحب کسی کے قبضے میں نہ آیا اور آس پاس کے بھگت، سیانے اور نوتے سب اپنے اپنے منتر پڑھ پھونک کر پٹ گئے تو پھر وہ اس کو لکھنؤ لے گئے۔ علاج معالجہ کرانے اور دوا گولی کھلانے —— جہاں سے بس اُس کے مرنے کا تار آیا۔ اور نومٹر نگر کے کنور جی کا بیٹا کھانسی بخار کے علاج میں پہاڑوں کی ہوا کھانے گیا تھا تو بھی اس کا تار آیا تھا۔ اور دیہات میں تو مرنے کا ہی تار آتا ہے۔ کوملا جانتا تھا کہ اس کا بیٹا ”لام“ پر ہے جہاں مزدوری پر ”مارنے“ جایا جاتا ہے۔ دو بڑے بڑے غول ”قتل کرنے“ کو کرایہ پہ جمع ہوتے ہیں —— اور دونوں غول ”مارنے“ کو آمنے سامنے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ ”مرنے“ کو۔ یہ بات تو شاید ساہو جی، کنور جی بھی نہیں، اور صوبہ دار، جمعدار، کپتان، کرنیل، جرنیل صاحب بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ کوملا بیچارہ کیا سمجھتا۔ کوملا اور اس کی بڑھیا اس وقت تک دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر اپنے سینے اور حلق سے پرسوز و گداز آوازیں نکالتے اور آنکھوں سے دھاریں بہاتے رہے۔ جب تک کہ آتش شکم کی بھڑکتی ہوئی آنچ ان کی رنج و غم کی حرقت پر غالب نہ آگئی اور ہفتہ ہی عشرہ کے

اندر کسب روزی کے افکار نے انہیں اپنی جانب کچھ ایسا متوجہ کیا۔ کہ وہ "نصف العیش" کے اس باب کے ہر جزکو حرف غلط کی طرح فراموش کر بیٹھے۔ کیونکہ جو روپیہ چھ مہینے کی تنخواہ کا جوڑ رکھا تھا۔ اس سے بجائے زمین رہن سے چھوٹنے کے کوملا برادری کے بار سے سبک دوش ہوا اور ایک لمبی چوڑی دعوت کے بعد کنوئیں کی مٹی کنوئیں کو لگاکر اور بڑی دھوم دھام سے اپنے نوجوان بیٹے کی تیرھویں کرکے منڈ منڈا کر بیک بینی دوگوش جیسے کا تھا، مزدور کا مزدور کا کاشتکار بننے کی اُمیدوں کا خواب دیکھنے کے بعد کھڑا رہ گیا۔ اپنے اب وجد کی طرح جس طرح اُس نے عمر کے ساٹھ سال گذارے تھے، اسی طرح "روز کا کنواں کھودنے اور روز کا پانی پینے" کے معیار پر اپنی باقیماندہ زندگی کا یہ صحرائے غیر ذی فدع طے کرنے کے لئے اس وقت کے انتظار میں رہا۔ جب سینے کی ہڈیوں کے نیچے کی سب حرکتیں ساکت ہوکر "موت" کا نام پاتی ہیں۔ مگر دو ہی مہینے بعد گاؤں کے مکھیا کے پاس گیندن متوفی کے ورثا کی تصدیق کے کاغذات آئے گاؤں میں مختلف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کوئی بولا "ہزاروں آرہے ہیں"۔

"نہیں جی ہجاروں ناہیں عمرپیلسن (عمرپنشن) ہوئے گی سمجھ لیو"

"جی ناہیں جی —— اکلوتا پہلوٹی کا پوُت تھا اس کا —— سو پچاس بیگہ جاگیر ملے گی جاگیر!" مگر چار پانچ مہینے برابر تصدیق کے متعلق فوجی دفتروں سے تھانے کے ذریعہ کاغذات چلتے رہے۔ نہ معلوم کتنی سپورٹیں آئیں اور گئیں —— اور پھر کہیں چھٹے مہینے گیندن کی سنگین نوجوانی کی قیمت، اور کوملا کی ساری عمر کیا پشتوں کی کمائی کے دام مبلغ چھ سو روپے فوجی دفتروں سے تشخیص ہوئے۔ جو بعد وضع اخراجات پولیس مبلغ پانسو روپے اور ایک تھیلا جس میں ایک جوڑا جوتا ایک جوڑہ جرابیں، دو تین خاکی قمیص ایک گرم پتلون وغیرہ غرض تصویر بتاں اور حسینوں کے خطوط وغیرہ قسم کی چند چیزیں جو متوفی کا غیر سرکاری اثاث البیت تھا کوملا کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ جن میں سے جرابیں تو ہیڈ محرر نے قمیص کانسٹبلوں نے اور پتلون نائک نے تھانے میں ہی جھپٹ لیا اور تھیلے میں دو جوتے اور انٹی میں پانسو روپے لگائے۔ کوملا تھانے سے گھر آیا۔

پانسیر چاندی! چاندی تو چاندی کبھی پانچ سیر جوار پر بھی کوملا نے اپنی ملکیت محسوس نہ کی تھی۔ وہ نقد پانسو روپے سکہ چہرہ شاہی لیکر اپنے خس پوش مکان میں گھُسا۔ بڑھیا روپے کی پوٹلی کو ہاتھوں میں دباکر اور سینے سے لگاکر لپٹ لپٹ کر خوب روئی —— بین کیئے۔ —— گیندن کو زور زور سے پکارا —— بڈھے نے بھی چند ڈاڑھیں ماریں —— پڑوسی جمع ہوگئے۔ رسمی تسکین دی۔ جب گھر کی بھیڑ چھٹی تو بڑھیا کو اس روپے کی حفاظت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ پہلے تو پچہتر روپیہ موروثی زمین کے چھڑانے کے لئے علیحدہ کئے۔ اور گرد کے چور اچکوں کے علم میں کھُلم کھلا یہ رقم گھر کے اندر آئی تھی پچہتر روپے تو تیسرے پہر کے وقت ہی لے کر کوملا سیدھا ساہوجی کے پاس پہنچا۔ اور اپنے دادا کا اقراری رہن نامہ وصول کرکے واپس لے آیا۔ اب شام ہوئی تمام رات دونوں بڈھا بڈھی جاگتے رہے اور روپے کی حفاظت زیر بحث رہی۔ صبح تڑکے کوملا نے ادھر کی موٹی موٹی مضبوط قسم کی لکڑیاں چھانٹیں اور اپنے بے در و دیوار سے گھر کے کواڑ دچر کھٹ سے بے نیاز دروازے پر ایک مضبوط سی ٹٹی لگائی۔ اب گھر کے اندر روپے کے رکھنے کا سوال درپیش تھا۔ جہاں چور ڈاکو، نقب زن ہر ایک کی دست بُرد سے محفوظ رہے، بڑھیا نے کہا "باکونا میں گاڑھو روپیا" (اس کونے میں گاڑ دو روپیہ) اور بڑھیا نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

"ناہے —— ہواں ناہے —— کاؤ نے آڑا پھوڑ دو تو جھٹ سے لے جائیگو نکال کے" (نہیں وہاں نہیں کسی نے نقب پھوڑ دیا تو جھٹ سے لے جائے گا نکال کے) کوملا نے کہا اور پھر ذرا دیر توقف کرنے کے بعد اور اپنی آبائی کوٹھیا جس کے بیچوں بیچ ایک کھڑکی لگی تھی۔ غور سے دیکھی اور پھر اس کی چوبی کی جانب دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "یا او گاڑھنگو کہ چوٹٹا سارے کے وسواسس میں نہ آبے —— چوبی کے بھیتر —— گج بھر گہرے پر ڈابونگا" —— اور کوملا نے گھڑے میں روپیہ بھرا اور کٹھیا کی تلی پر ایک گز گہرا کھود کر گھڑا اس میں دفن کرکے اوپر سے ایک پتھر رکھا اور پھر بھوسہ کالی مٹی میں ملاکر گڑھا بند کرکے زمین برابر کردی اور بڑھیا سے داد طلب انداز میں کہا "ایسی تیسی

سارے چور اُچکے کی جو مل جائے کوئی سارا ڈکیت تو پتہ پائیے۔"

(۲)

اور کومّلا یکدم چونک سا پڑا جیوں ہی چودھری کرم سنگھ زمیندار کے مختار نے اسے "کومل" کہہ کر آواز دی۔ وہ تو تین چار پشت سے بل جتیا، موہنا اور کومّلا اور "گیندنا" رہا تھا۔

"ہاں مختار جی کیا ہے؟" — کومّلا نے سر پر رکھی ہوئی گھاس کی گٹھڑی کے لٹکتے ہوئے ہرے ہرے تنکوں میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ذرا تم سے کچھ بات کرنا ہے۔" اور کومّلا نے عمر میں پہلی مرتبہ مختار کو ایسے سلونے تیوروں سے اپنی جانب مخاطب ہوتے دیکھ کر کہا "ابھی آیا — ابھی گھاس ڈالی آؤں" اور دو تین منٹ کے اندر کومّلا گھاس کا گٹھڑ ڈال کر انگلی سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہوا مختار کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں جی کومل — کہو اب کیا کیا ارادے ہیں؟" مختار نے چلم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کچھ کھیتی باڑی کا کاروبار چھیڑو گے۔ کہ ایسے ہی پھرو گے" "نہ پئے کی دھریا نہ سسرے کی بھریا" دھوبی کے سے کتے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے"۔

"ہاں ایسر پوری کرے تو ابکی ہے تو گیان — دھرتی بیسو بیگھہ میروثی چھٹ ای آئی ہے"

"تو بردھا تو مول لیو گے ہی' لیو گے نوں'!

ہاں جی۔ بیل بردھا تو ہلکے بھاری لینا پڑیں گے ہی۔ چار بگھہ جوت جوگے"

اتنے میں مقدم جو سامنے کی چوپال پر بیٹھا چند کاشتکاروں پر اپنے ابتدائے آفرینش والے وقار اور فوقیت کی تجدید کر رہا تھا۔ مع ان سب کاشتکاروں کے اٹھا چلا آیا۔ اور کومّلا کے منہ سے بات لے کر کہا۔ "کاہے کے لئیں بیل لیئے گا بھیا" "ڈیڑھ پاؤ کدئی اور متھرا ہیں بھنڈار بیس بیگھہ دھرتی پہ پورا ایک ہل — کاہے پہ گھمایا کرے گا؟!"

"ہاں جی او چھی پونجی کھسم (خصم) کو کھائے جائے — سو آں۔

"بس جی کومل! — تمہارے باپ دادا کی جے' بیسو بیگھہ تو بیلوں کے پیٹ ہوئے گی اور تم سال بھر جوت جوت مرو گے۔ اور دو برس میں سب جمع جوڑ برابر ہو جائے گی — ان مختار جی کی ٹہل کر جئیے چودھری سے پورے بیگھہ کی کھرچ کی دھرتی دلائے دیں گے۔"

"ہاں ان کے کان میں کہدے کون کون سے کھیت لیئے گا" "چاؤ" (مالدار) آسامی ہے — چودھری مان جائیں گے — دسہرہ کی بھرن پہ اپنے ٹھور ٹھیک جائے لاگیہ"

"ہاں رے نہیں تو بیس بگہ میروتی (موروثی) پہ تو دو بیل دو ہاتھی بن جائیں گے —" اور "چاؤ" کے لفظ پر کومّلا پھر اچھل سا پڑا۔

اے مایا تیرے تین تین نام — پرسا' پرسی' پرس رام' — کومّلا گاؤں میں اب "کومل" تھے' بات والے تھے' اونچے اونچے بیلوں والے تھے' کھیتی باڑی والے تھے' اور پورے پورے گنتی میں تھے' مقدم اور مختار دونوں سے کان میں بات کرنے کا فخر انہیں حاصل تھا۔ پٹوار اور ٹھکیات سے ان کا ہنسی مذاق ہوتا تھا' زمیندار کے مکان کی باریابی اور زمیندار کی توجہ دونوں چیزیں انہیں حاصل تھیں اور گاؤں کے دونوں ساہو جی بھی بجائے لکھو ہیسی دیئے کے اب تو کومل کا سلام زبان اور ہاتھ دونوں سے لیتے تھے اور خیر سلا بھی پوچھتے تھے — موسم کی حرکت اور بوست اپنی انتہائی بلندی تک پہنچنے کے بعد جیٹھ کے دسہرے کی پہلی بھرن میں تبدیل ہو گئی۔ جنگل کل ہی جل ہو گیا۔ خوابیدہ قوتیں بیدار اور مردہ صورتیں زندہ ہو گئیں — برسات "کل شیئ حی من الماء" کہتی ہوئی شروع ہوئی۔ دھرتی ماتا نے سنگار کیا اور چاروں طرف سے فرزندانِ زمین پروانہ وار اپنی ماں کی شفیق آغوش میں جانے کے لئے زمینداروں کے دروازوں پر جبّہ سا دکھائی دیئے کومل ساہٹا' بتیسا' اور بیسا' تین کھیت اکیس بارہ بیگھہ تمام رقبہ تین سو روپیہ سالانہ لگان پر حیثیت ذیلی سیر عطا ہوئے۔ اور پٹہ تین سالہ کومل کے حق میں لکھا گیا۔ اور فی کھیت ایک ایک روپیہ مقدم اور مختار اور پٹوار کو کومل نے دیا۔ اور کومل ذخیلکار' پیداوار ہر قسم کے کاشتکار اور گاؤں میں کھیت

پیروائے ہوئے۔ بڑے بڑے رقبے کے کھیت لو دو دن کومل اور
وہ کم بخت برسات! بیچ کھیت دانت دکھا گئی۔ پیداوار جو کچھ ہوئی سو
ہوئی۔ سو روپے کا پورا لگان کھڑا رہ گیا۔ خیر سال بھر کی بقایا......
کومل جیسے "چمکتے" "چاؤ" آدمی کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ موروثی زمین
سے واقعی بمشکل بیلوں ہی کے پیٹ کو "پور" پڑتی۔ سو روس پانچ پانچ
مقدم اور مختار کو چٹا دیئے اور زمیندار کی توجہ ان کی بقایات ہٹ گئی۔
اور نیا سال شروع ہوتے ہی لیا "بہ" زمیندار کو بقایا کا سال آئندہ تک
کیلئے صبر اور کاشتکار کو بے فکری۔ اللہ تعالیٰ دیدیتا ہے۔ آئندہ سال
میں سمت بڑا اچھا ہوا۔ مگر سالوں بھر گانٹھ ت کھانے کے باوجود رتیے میں
سے پیٹ سے زیادہ چاندی نہ نکل سکی۔ اور بھلا کیا کومل اور کیا چودھری
اور کیا کوئی، بھلا سبھاؤ کو کوئی کیا کرسکتا تھا۔ اور چودھری نے ۸ عرفی
من بھاؤ بازار سے جنس گرا کر اپنی بقایا میں لی تو کونسا غضب کیا جبکہ
ہر بقایا لگان پر تین آنہ فی روپیہ ماہوار سود نہ لینے والا زمیندار قرب وجوار
میں اپنے بقایا دار کاشتکاروں سے طیاری فصل پر بھاؤ بازار سے
نصف داموں پر زرِ بقایا میں جنس لیتا تھا۔ اور عام رواج تھا۔ اور
پرانی رسم چلی آتی تھی جو گاؤں کی "دستور دیہی" "واجب الارض" میں
۱۸۶۲ء کے بعد زمیندار اور کاشتکار کے باہمی سمجھوتے کے مطابق
لکھی ہوئی تھی۔ کھیتوں کی سب پیداوار بقایا لگان میں دینے کے بعد بھی
کومل ایک سال کا پھر بقایا دار رہ گیا۔ اور سال بھر جو کچا پکا، ہرا سوکھا
اروِن دھروِل چودھری کے نوکروں کی آنکھ بچا کر کھڑے کھیت نوچ
کھسوٹ کر کومل کھا بھاگے وہ اُن کی تقدیر!۔ کومل کے لئے کاشتکاری
اب کچھ گرم ورد ہی بن چکی تھی اگر کھیت چھوڑے دیتے ہیں تو زمیندار
کا پیسہ پیسہ بے باق کر دیں۔ ورنہ کھیت پاس رکھنے میں آئندہ پیداوار
ہونے پر بقایا کی ادائیگی کی اُمید بھی تھی۔ اور چودھری کا تقاضا شدید تر
ہوتا گیا۔ مختار اور مقدم اس کی توجہ ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور
زبانی مطالبہ عملی شکل اختیار کر گیا۔ چودھری کے مکان میں متواتر دو ڈھائی
گھنٹے مردہ اور زندہ چمڑے کے تصادم میں پھٹا پھٹ ہوئی۔ اگرچہ
ہندوستان میں کاشتکاری اور جوتے کا روز کا ساتھ ہے۔ مگر کومل تو
تین چار پشت سے کاشتکار ہی نہ تھا اور وہ بڑی حد تک عملی طور پر
کاشتکاری کے جملہ لوازم بھول گیا تھا اگرچہ آئے دن وہ کبھی آنکھوں
سے اس قسم کے زمینداری اور کاشتکاری کے مظاہرے دیکھتا رہتا تھا مگر
اس وقت اپنے اوپر عملی طور پر زمینداری کے ان اختیارات کا نفاذ
اسے اتنا معمولی نہ معلوم ہوا جتنا کہ عام پشتینی کاشتکاروں کو معلوم ہوتا
ہے۔ وہ تو صبح سے شام تک اپنے ہاتھ پاؤں دو چار آنے میں بیچ کر اگر
مل گئی تو روزی نہیں تو روزہ" کا عادی تھا۔ اسے آج پتہ چلا کہ کاشتکاری
میں تو دائمی غلامی ہے جسم کی ضمیر کی، روح کی۔ گاؤں کے چند خوشامدی
قسم کے قائدین نے گھنٹہ بھر کی ضمانت پر کومل کو چھڑایا۔ اور جس قدر مشکل کے
ہم شاہ شجاع اور اس کی بیگم نے راکھ کی تھیلی میں سے کوہ نور نکال کر راجہ
رنجیت سنگھ کے حوالے کیا تھا اسی قدر آسانی کے ساتھ مگر شاید اس سے
کہیں زیادہ رنج والم کے ساتھ مجبور کومل نے ضامنوں کی موجودگی میں کٹھیا
کی چُھتی کھود کر کل روپیہ پنچوں کے سامنے رکھ دیا۔ تین سو روپے برآمد ہوئے
اور ساڑھے تین سو مطالبہ تھا۔ تین سو روپے کی رقم اپنے مکان کی مٹی میں
سے برآمد کر کے ضامنوں کے پیچھے پیچھے کومل زمیندار کے مکان کی جانب
پلٹا۔ پچاس روپے کی کمی تھی۔ پہلے تو کومل نے یہ تجویز پیش کی ان پچاس
روپے کے بالعوض اُس کے بیل لے لئے جائیں جو اس نے دو سال پیشتر
سو روپے میں خریدے تھے۔ اور وہ اپنی موروثی زمین بٹائی پر دے
دیگا۔ اور کچھ نہیں تو زمین کا لگان اور چھ مہینے کے قابل کھانے کو غلہ تو
مل ہی جائے گا۔ مگر پنچوں نے اس جنتر کو روکا اور رائے دی کہ ابھی
کومل ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کریں اور زمین بدستور اپنے قبضے میں
رہنے دیں۔ چودھری نے جب یہ رنگ دیکھا تو صاف کہا کہ کومل اب
ننگے ہو چکے ہیں۔ اگر سال آئندہ بقایا ٹوٹی تو کون ذمہ دار ہوگا۔ گاؤں
کے چند رحم دل پنچوں نے چودھری کے لگان کی ذمہ داری اپنے
سر لے لی۔ اور پچاس روپے بقایا ذمہ کومل قائم کر کے سال آئندہ کے
لئے کومل کے بیل اور سیر کی زمین واپس دلا لائے۔ نیا سال شروع ہوا۔
اور اس اساڑھ کی ابتدا باوجود انتہائی تر ہونے کے بھی کومل کو بہت
خشک معلوم ہو رہی تھی۔ کھیتی کی لاگت کا سوال تھا۔ پھر کم سے کم نئی
مکئی اور ساٹھی اسما، کنگنی چلنے تک کے لئے اپنے اپنی بڑھیا کے اور اپنی
چھوٹی رام کلی کے پیٹ بھرنے کا سوال تھا۔ نام بڑا درشن تھوڑے کتنے

کو لمبے چوڑے وخلیکار سیردار سب ہی کچھ۔ اور گھر میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ بیلوں کے پیٹ کا تو یہ تھا۔ کہ خیر چودھری نے بھوسہ چھوڑ دیا تھا۔ اور کھلیان میں سے صرف ناج ہی ناج لیا تھا۔ بیلوں کے دانے کا بدل کومل نے یہ کیا کہ اچھی قسم کی تھوڑی بہت گھاس نیا چارہ چلنے تک سہ پہر کے وقت جب انہیں ہل جوت کر فرصت ہو جاتی چھیل لاتے اور گھاس چھیلنے کے تو کومل پُرانے ماہر تھے اور وہ گھاس کتّی کر کے بھوسے میں ملا دیتے مگر نیا اناج چلنے تک کے لئے اپنے پیٹ کا سوال حل نہ کر سکتے تھے۔ خیر وہ بھی گاؤں کے پنچوں نے اپنی ضمانت پر حل کرا دیا۔ اگرچہ ساہو جی نے کومل کے دیوالیہ ہو جانے کا عذر پیش کر کے ہر چند انکار کیا۔ مگر اساڑھ سے کنوار تک کے خرچ کے لئے انہیں چھ من جو اس شرط پر ساہو جی سے اصرار کر کے دلوا ہی دیئے کہ یہ کاتک میں نو من ماش ان کے بدلے میں دیں گے اور اگر نو من ماش نہ دے سکے اور قرضہ بیساکھ کو ملتوی ہوا تو ساڑھے تیرہ من گندم دیں گے مثل مشہور ہے بھوکے کا کیا بھاؤ" اللہ عزیز کر کے کومل چھ من جو گھر کو لے آئے اور وہ ذہنی انتشار جو ہر کاشتکار کو فصل کی تیاری کے دوران میں تہی دستی کی وجہ سے ہوتا ہے دور ہو گیا۔

تیسرا سال کو ملا کو کومل بنے شروع ہوا تو وہ گڑھا جو کٹھیا کی چلی کے نیچے "چور، اچکے، اور ڈکیت، ہر ایک کی دسترس سے باہر خیال کیا گیا تھا خالی ہو چکا تھا۔ اور اس کا حساب آنہ پائی سے تمام موضع کی مردم شماری کو فرداً فرداً" بر زبان یاد تھا۔ بالکل اتنا ہی صحیح جتنا کہ خود کومل کے علم میں تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہی نقشہ جما جو بحرِ ہند اور کوہ ہمالیہ کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد سے سرزمینِ ہند پر جمتا رہا تھا۔ مرطوب ہوائیں خلیج بنگال کی پستیوں سے ہٹ کر گوری شنکر کی بلندیوں سے جا ٹکرائیں۔ سرزمین ہند نے پھر زمرّدیں کانوں کے خزانے اگل دیئے۔ کاتک کی فصل اچھی ہوئی جوار، باجرہ اور ماش کی پیداوار اچھی رہی۔ مگر کومل نے اس خیال سے زمیندار کو دینے کے لئے کہ نقد روپے کی ضرورت ہوگی گنے کی فصل زیادہ رقبے پر کاشت کی تھی۔ اور قریب کی شوگر فیکٹری بند ہو جانے کی وجہ سے گنے کی خرید نہ ہوئی اور عام طور پر کاشتکاروں کو گڑ بنانا پڑا اور ریلوے پر گڑ کے لدان کی ممانعت ہونے کی وجہ سے اِدھر اُدھر گڑ کا نرخ بہت ارزاں رہا اور زیادہ ذخیرے کے نکاس کی کوئی شکل ہی پیدا نہ ہو سکی۔ اور بہت تھوڑی رقم کوہ کندن وکاہ برآوردن ایکہ کی فصل سے کومل نکال سکا۔ اور بقایا بر بقایا قائم ہو گئی۔ اور جب پیداوار اور نرخ میں توازن وتناسب نہ ہو اور جب لگان، ٹیکس، محصول تناؤ کی اخیر منزل پر ہو ——— جب وہ تنتے تنتے ٹوٹ جایا کرتا ہے۔

اور اگرچہ کہتے ہیں کہ دُنیا میں قلبِ ماہیت محال ہے اور اگر لاکھوں میں ایک مہوس ہزاروں روپیہ خرچ کر کے صرف ایک ہی دفعہ مسی فلوس کو طلائی دینار میں تبدیل کر بھی دے تو وہ کیمیا گر کا فقید المثال لقب پا کر عمر بھر دیوتاؤں کی طرح اپنے قدموں کی پرستش کراتا ہے مگر یہ نظریہ بدستور پھر بھی جہاں کا تہاں رہتا ہے کہ دنیا میں کسی چیز کی ماہیت نہیں بدلی جا سکتی اور دُنیا کے حکماء وعقلاء، فلسفی، ماہرینِ طبیعات اور الکیمیا جمع ہو کر اپنی عمروں کی مسلسل اور پیہم کوششوں سے جَو کو ماش، اور ماش کو گندم میں، یا چیونٹی کو مکھی اور مکھی کو مچھر میں تبدیل نہیں کر سکتے مگر سرتاپا معجزہ، ناخن پا سے موئے سر تک مجسّم سحر، فارون الدولہ بہادر ہمارے ہندوستانی ساہو جی جو سے ماش، ماش سے گندم، تانبے سے سونا، چاندی سے ہیرا بنانے اور گول گول سکوں میں سے دودھ دوہنے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہندی دیہاتی کشتی کا پندارِ خداوندی کے نشے میں سرشار ناخدا ہمیشہ بادِ مخالف کی رَو کے خلاف اپنی ناؤ چلانے کا عادی، طوفانی موجوں کے تھپیڑوں سے کھیلنے کا خوگر ہمارا "زمیندار بچہ" ہمہ وقت اپنے آہنی ہاتھ میں وہ جادو کا ڈنڈا رکھتا ہے کہ اللہ میاں کے دستِ خاص کے بنائے ہوئے سچ مچ کے انسانوں کو بیلوں اور گھوڑوں اور کتّوں بندروں میں تبدیل کر کے ملک کے ایک ایک قریہ کو کام روپ بنائے ہوئے ہے۔ اور ڈارون کی تھیوری پر رجعت قہقہری کر کے دکھاتا ہے ——— کومل کاتک کی فصل کا ماش ساہو جی کے جو من کے ہم پلّہ نہ کر سکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی چھ مہینے کی محنت میں سے بغیر ایک ہانڈی دال بھی کھائے ہوئے ساہو جی کا وزن پورا نہ کر سکا اور بلا تصرّف خارجی جو نوعیت اور وزن کی تدریجی ترقیاں کرتے ہوئے جو سے ماش، ماش سے گندم اور چھ من سے نو من، نو من سے ساڑھے تیرہ ہوتے چلے گئے۔

بیساکھ میں چھینا جھپٹی شروع ہوئی فصل اچھی خاصی تھی۔ مگر زمیندار کو ساہوکار، اور ساہوکار کو زمیندار کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ گو کہ دیہات میں یہ قدیم رواج ہے کہ پہلے ساہوکار کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے جس سے اُس نے اپنے ہل جوتنے کی مدت میں اپنا پیٹ پالا تھا۔ اپنی زمین طیار کرلینے کے بعد قرض لے کر تخم ڈالا تھا۔ مگر کومل کا دیوالیہ پن اور ان کا مستقبل ساہوکار زمیندار دونوں کے سامنے تھا۔ ایسے موقعوں پر ساہوکار ہمیشہ زمیندار کے رحم وکرم پر ہوتا ہے اور زمیندار باوجود زمیندار ہونے کے آئندہ اپنے کاشتکار کی ساکھ قائم رکھنے کے لئے ساہوکار کا قرضہ کل ادا ہونے کے بعد پھر اپنے مطالبات رکھتا ہے مگر کومل کا دیوالیہ مستقبل زمیندار ساہوکار دونوں کے سامنے تھا۔ چودھری کھلم کھلا ساہوکار سے آنکھ پھوڑ کر بے مروتی کرکے اپنا مطالبہ پورا نہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ چودھری کو خوف تھا کہ اگر ساہوجی نے آئندہ اس کے کاشت کاروں کے درمیان لین دین بند کردیا تو اس کو کتنی دقتوں کا سامنا ہو جائے گا۔ اور اس کے کتنے کاشتکار بھوکے مرجائیں گے۔ مگر اس موقع پر چودھری نے تھوڑی سی جرأت سے کام لیا اور تخم سے زیادہ اور باقی کل غلہ اپنے مطالبے میں کھلیان سے کھڑی ڈنڈی تلوا لایا اور چٹ پٹ اپنے بقیہ مطالبے میں کومل کے بیلوں کی چھٹی اپنے نام کراکر دام وام بیباق رسید لکھ دی اور آئندہ سال کے لئے کھیتوں سے استعفیٰ لے لیا۔

تمام گاؤں میں بلکہ اردگرد کے ہمسایہ مواضعات میں کومل کی بے ایمانیوں کے چرچے ہو رہے تھے۔ اور ساہوجی کی مظلومیت پر کفِ افسوس ملے جارہے تھے ـــ کومل ایک بری مثال قائم کر رہے تھے ـــ وہ ابتدائے آفرینش کے بنے ہوئے بغیر لکھی کچے بیوپار کی ادائیگی میں کوتاہی کرکے ایک غیر فطری حرکت کے مرتکب ہو رہے تھے۔ جس سے عام کاشتکاروں کی ساکھ کو صدمہ پہنچ رہا تھا۔ اور ایسی بری مثال قائم کرنے پر کومل کے خلاف سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

"بھے ہے بڑی بے ایمانی - بھیا - پرایا آتا مت دیو - بھلا بولو تو! نہ من نہ دو سے من اکٹھے تیرہ چودہ من پکے - ساہوجی کے سنا ہے گیہوں ہجم (ہضم) کر گئے کومل اور دوٹ کے ڈکار نائے لیت"

بیچ کی چوپال کی چکڑی میں سے ایک آواز بلند ہوئی جیسوں ہی کومل چبوترے کے نیچے سے گھاس کی گٹھڑی لئے ہوئے نکلنے - چورواے پاؤں تیز تیز پڑنے لگے اور مقروض آنکھیں باوجود چہرہ گھاس کے لمبے لمبے تنکوں میں چھپا ہونے کے اندر ہی اندر نیچے کو جھک گئیں - اور کومل - قرض دار کومل ـــ بے مر کومل بے ایمان چور کومل سن سے نکلا چلا گیا -

بیس قدم چلنے کے بعد دیہاتی مزدوروں کا ایک گروہ گلی میں بیٹھا چلم چوس رہا تھا - اس گروہ میں کسی زمانے میں کومل بھی کام کیا کرتے تھے اور اس وقت اگر وہ پچھلے تازیانے سے بھڑکے ہوئے نہ ہوتے تو ضرور گٹھڑ رکھ کر دو دم چلم پر لگاتے - مگر آنکھ بچا کر نکل جانا ان کے ہاتھ میں نہ تھا - لہٰذا کچھ ایسا انداز بنا کر کہ گویا وہ چہرہ گھاس میں چھپے ہونے کی وجہ سے پاؤں تلے سے آگے کی دیکھ ہی نہیں سکتے بغیر سلام دعا کئے نکلے چلے گئے - مزدوروں میں آپس میں اشارے ہوئے - سکھا اور کلوا تو خیر مٹھار کر ہی رہ گئے - مگر چترا بول ہی پڑا "کوا چلا ہنس کی چال اپنی اوبھول گیو ـــ"

"بھول کاہے کو گیو ـــ چودہ من پکے گیہوں کھائے بیٹھا ہے سالا ـــ"

سب کی ساکھ میٹ دی ..... نے ـــ ساہوجی اڑی میں کام نکال دیت ہے سو جے بے ایمنا مار بیٹھے رکم -

"ارے اب کھیت بیچ کو پڑے راہیا کریں گے ؟"

"ارے کھیت! کھیت تو کھیت! ـــ مردہ پڑے راہنگے اور کپھن (کفن) پیدا نائے ہوئے گو"

"ہاں جی ساہوجی تو اب کاؤ بیج کو نہ مٹھی بھر ناج دئیں نہ چھوٹی پو ـــ"

اور کومل کی حالت گلی میں سے گذرتے ہوئے اپنے ہم جنسوں میں گھرے اجنبی کتے کی سی ہوگئی - اس نے جلدی سے ان کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش کی - اور گلی میں سے گذرتے ہوئے عورتوں اور بچوں کے تیروں کو چھاتی پر کھاتا گذر گیا -

(۳)

ھ رسول ہمیر جان بیٹھ - یار دوست بولی جب اٹھ - خالق

باری کا لفظ بسیٹھ کا مکتب کے میاں جی کا بچوں کے دماغ میں جمایا ہوا تخیل جتنا بلند ہوتا ہے اس سے کم کچھ دیہات کے نوجوان کے دماغ میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ دیہات میں صرف بسیٹھ ہی کی یگانۂ روزگار ہستی وہ چیز ہے جو اپنے متبرک پیشے کے دم قدم سے دیہاتی زندگی میں مدنیت اور حرکت کی ضامن ہے۔ اور ہماری دیہاتی مردم شماری کی پوری پوری کفیل۔ کیونکہ ہندوستانی نیستی اور برخورداری کے غیر اختیاری عطیے اور غلام گری کی طیاری کے لئے ہمارے ملک میں لڑکے لڑکی کے سن بلوغ کو پہنچنے سے پیشتر ہی شادی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اور فاقے، بھوک اور بے روزگاری کی گاڑی کھینچنے کے لئے بخوشی دو شریک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ازدواج و مناکحت کے اہم ترین مسئلے کے درمیانی مراحل طے کرانے کا کام جس گرگِ باراں دیدہ، زمانے کا گرم و سرد دیکھے ہونے کے علاوہ کھٹا، میٹھا بھی چکھے ہوئے انسانی خصائل اور رجحانات کی تجربہ کار و ماہر شخصیت کے ذریعہ عملی صورت اختیار کرتا ہے ہماری دیہاتی اصطلاح میں بس اسی کو "بسیٹھ" کہتے ہیں۔ یوں تو دیہات میں لفظ "بسیٹھ" کی فنی اہمیت اپنی جگہ پر مسلمہ ہوتی ہے۔ کیونکہ پیشے کے لوازم کے تقاضے کے مطابق دراصل ہر بسیٹھ کو علاوہ اپنے مخصوص فن کے ہر فن مولا ہونا پڑتا ہے اور اپنے خاص فن کی تکنیک میں تو اس قدر ید طولیٰ حاصل کرنا ہوتا ہے کہ بعض اوقات فن بسیٹھی کے کرتب اور کمالات کے ڈانڈے بازی گری کے شعبدوں سے جا ملتے ہیں اور جس طرح مغربی کتابوں میں کوئی جاسوسی ناول یا فسانہ بغیر شرلاک ہومز کے مشہور روزگار اور عنقا صفت کردار کے درجہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح باوجود قسمتوں کے خشت اور چونے کے ازلی وصل کے دیہاتی دنیا کا کوئی گھر اس معمار کے دستِ تعمیر اثر کے بغیر منصۂ شہود پر نہیں آ سکتا۔ اور اس خصوص میں علاوہ بسیٹھ کے اور ہر کوشش طلبِ مجہول خیال کی جاتی ہے اور بسیٹھ جی کے قدوم میمنت لزوم کے آتے ہی "کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا" اپنی اپنی جگہ سے ایک کہربائی قوت کے ساتھ بھاگ کر بھان متی کا کنبہ جوڑ لیتا ہے اور ماں باپ، اور ہونے والے دولہا دولہن کے ارمانوں بھرے دلوں کے رومانی اور ہوائی قلعے اس فنکار انجینئر کی نظر تعمیر اثر سے چشم زدن میں الہ دین کا سا محل بن جاتے ہیں۔ مگر خدا پنج انگشت یکساں نکرد بسیٹھوں میں بھی بسیٹھ بسیٹھ بھانت ہوتا ہے بلدیو بسیٹھ تو بسیٹھوں کے پنجے کی انگشتِ شہادت تھے اور اسی گاؤں میں کیا دور دور تک کے بسیٹھ بلدیو بسیٹھ کا نام سن کر کان کی لو پکڑتے تھے۔ بلدیو بسیٹھ کے اس ممتاز درجے پر پہنچنے کی وجوہات کچھ خداداد سے زیادہ تر اپنے زور بازو اور داخلی صلاحیتوں پر مبنی تھیں۔ مشہور بات ہے "میاں بی بی راضی تو کیا کرے گا قاضی" مگر یہاں اگر میاں بی بی کے علاوہ میاں بی بی کے باپ ماں، دادا دادی، نانا نانی سب ہی کا رونگٹا رونگٹا راضی اور بلدیو بسیٹھ راضی نہیں تو مجال کیا جو بیاہ ہو جائے۔ سینکڑوں براتیں آئیں اور گئیں۔ سمدھی سمدھن دولہا ساری بستی گئی اور آئی۔ خوب دھوم دھڑکا ہوا، باجا گاجا نوٹنکی رنڈی پنیریا سب ہی کچھ آیا اور گیا! اگر بلدیو بسیٹھ نہیں آئے اور گئے تو برات بے نیل و مرام ہی واپس آتے اور جاتے دیکھی — کوئی آمادہ نہ ہوا صرف لڑکا آمادہ تھا ادھر سے بلدیو بسیٹھ اور لڑکا خالی ریلو پر بیٹھ گئے اور ادھر سے پیچھے رب چھلنی اور اندر دلہن بھرا بھرایا ریلو "بنا جیت لایا رے سسرال گلیاں۔ چلا آیا۔ سارا کنبہ مانع و مزاحم ہوا، کوئی حامی و مددگار نہ ہوا۔ صرف اکیلی لڑکی ہی راضی ہوئی اور بلدیو بسیٹھ کہیں نہ کہیں سے چرکن (آٹا) کا دولہا بنا کر رخصت کرانے لے آئے — ایک سمدھیانہ ناراض اور ایک راضی ہوا تو بلدیو بسیٹھ کو ایک فنکار بڑھئی کی طرح بسولے کے صرف دو ہاتھ چلانا پڑے اور چول بیٹھ کر ایسی سن ملی کہ کہیں پر جوڑ کا نشان دکھائی نہ دیا۔

بلدیو بسیٹھ کے حقوق دولہا دولہن دونوں پر یکساں مسلمہ سمجھے جاتے تھے اور جب رام کلی دسویں گیارہویں سال میں پہنچ گئی تھی۔ تو یوں بھی کومل کو بلدیو بسیٹھ کے در پر جبہ سائی کرنا لازمی تھی۔ اور جب ساہوکار جی کی آنکھیں بھی رام کلی پر لگی ہوئی تھیں اور پھر جب بلدیو بسیٹھ کو دو چار مرتبہ وہ توجہ بھی دلا چکے تھے مگر بلدیو بسیٹھ تجارتی اصول کے مطابق خود اپنی جانب سے تحریک نہ کرنا چاہتے تھے اور کومل کے منتظر تھے اور کومل بھی سب دروں سے مکمل طور پر ناامید ہو چکے تھے اور انہیں بھی اس وقت رام کلی کی شادی کی بیحد ضرورت

محسوس ہو رہی تھی۔ ساہو جی کے گیہوں اب چھوٹے بھاؤ کی کسوٹی پر ایک سو تینتیس روپے کی صورت میں بہی کھاتے کے زریں صفحات میں متحرک تھے۔ اور روز بروز گویا کومل کا خون پی پی کر موٹے ہو رہے تھے۔

کومل غریب نہ تو خود ہی چار چھ مہینے تک بلدیو سیٹھ کو دو چار دن پیچھے پوریاں کچوریاں کھلانے کی سکت رکھتے تھے اور ادھر نہ معلوم کیوں رقم پر ادھنی روپے کا سود چلنے کے باوجود ساہو جی کو اپنا حساب چکانے کی جلدی تھی لہذا "التعجیل کار شیاطین بود" ان تمام عجلتوں میں کومل بلدیو سیٹھ کے اس ایک سوا روپے کا بھی انتظام نہ کر سکا جو بات بیچاتے وقت ہر سیٹھ کو دری دکھیاری تک دیتی ہے۔ پھر تیل بوتلوں میں سے ہی نکلتا ہے۔ بلدیو سیٹھ نے اپنا سیٹھی کا خرچ دونوں جانب کا دھانند مراؤ ہی سے نکالا۔ اگرچہ "بردکھوا" میں بلدیو سیٹھ اپنے "میک اپ" (Make up) کے فن کا تمام کمال کام میں لا کر ان کی مونچھیں کٹوا کر اور بالوں کو بھلا دے کی سیاہی سے سیاہ نہ سہی تو لوہیا سا رنگوا کر لائے تھے۔ مگر بھلا اس حقیقت سے نہ تو پتلے دبلے صفراوی مزاج بلدیو سیٹھ ہی کو انکار ہو سکتا تھا اور نہ بھاری بھرکم بلغم کی پوٹ دھانند مراؤ ہی بیچارہ کچھ کہہ سکتا تھا کہ اس کی چوتھی بی بی کو مرے ہوئے ڈھائی سال ہو چکے ہیں اور وہ چار پانچ بیٹوں کا باپ ہے اور پوتے پوتوں اور نواسے نواسیوں کی تو شمار اس کو خود ہی معلوم نہ تھی۔ مگر وہ غریب کیا کرتا لڑکوں کی بہوؤں سے جب نہیں پٹی تو انہوں نے میکا پاٹنا شروع کیا تو مجبور ہو کر بڑے پوتے کی سگائی کر لایا۔ مگر سال ہی بھر میں وہ کم بخت بھی ساس کے رنگ میں رنگ گئی اور گھر کاٹنا شروع کیا تو سال بھر تک تو بڈھ[illegible] سِٹم پیٹم بار بار گھسیٹتا رہا۔ مگر اندر سے لے کر باہر تک اتنا بڑا کارخانہ تنہ[illegible] [illegible] کے بس کا روگ معلوم نہ ہوا۔ اور اسے بلدیو سیٹھ کے کان میں اپنی بات ڈالنی ہی پڑی۔

نام بڑا درشن تھوڑے چڑھاوے میں تو چار بیویوں کا زیور اٹھا لایا۔ اور ڈھائی سو من چنا، چار سو من گیہوں، سو من آلو، پچاس من تمباکو اور بارہ دھڑی انیون کی پیداوار کی شہرت تھی اور نئے میں پرانا اور پرانے میں نیا ملتا ہی چلا جاتا تھا۔ مگر ایک ہاتھ کی تالی تو ایسی ہی بجتی ہے۔ باوجود بلدیو سیٹھ کی انتہائی کوشش کے، بہی کھاتے کی مندرجہ رقم کے عین مطابق ہی کومل کو رام کلی کی قیمت مل سکی۔

اور جب رخصت کے وقت بلدیو سیٹھ نے دھانندو کی جانب آنکھ مار کر دیکھتے ہوئے کومل کی وکالت میں کہا "بھیا لمبردار جاوے ناہیں پچاس روپیہ کو ہم اور کہت ہیں چالیس تو اس کی گانٹھ سے لاگ گئے ہیں۔ پچاس روپیا دے جاؤ گے تو مہینا دو جے او کھائے ٹپے گو ___" ساتھ ہی کومل نے دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کھکھیا کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر دانت نکال کر مجسم سوال بن کر رہ گئے۔

"سیٹھ جی کیا کہت ہو ___ کیڑا نئے جات کیڑا ___ ابھے تو بھیڑیے رکھا ناہیں تین چار برس بھر کے ___ دو تین بھینسوں کا پورے بیانت کا دودھ مٹھا کھلائے دونگو تو ٹاکرم کی ہو یگی۔"

اور دھانند و مراؤ نے ایک سو ساٹھ روپے کی رقم بلدیو کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور سسکیاں لیتی رام کلی رنگین پانوں میں پڑے ہوئے بچھوؤں سے چھن چھن چھن کا الوداعی ساز بجاتی بجاتی سوار ہو گئی۔ اونچے اونچے بیلوں والا رتھ چل پڑا۔ جھن جھن جھنا جھن ___ بلدیو سیٹھ نے مڑ کر دیکھا تو ساہو جی بارہ گزی ببول کی چھال میں رنگی پگیا باندھے مجسم تقاضا بنا کھڑے تھے۔ کومل، ساہو جی اور بلدیو میں نگاہوں ہی نگاہوں میں سب معاملات طے ہو گئے اور بلدیو نے جیبوں کی تیرل رقم ساہو جی کی جانب بڑھا دی۔ اور جیسے کومل کے کندھوں سے ہمالیہ اور بندھیاچل کا بوجھ اتر گیا۔ اور کومل ہلکے پھلکے کھڑے تھے۔ رتھ کی جھن جھن آہستہ آہستہ ٹن ٹن میں تبدیل ہو کر فضا میں گم ہو گئی۔

افضل پرویز

وکٹوریہ کراس

سہاگ رات ہے کیا قصہ چھیڑ بیٹھی ہو
وہ جس کے واسطے ٹھکرا دیا تھا تم نے مجھے
بس ایک بم نے اڑا ڈالیں دھجیاں اُس کی
کڑکتے گولوں نے اتنی بھی تو نہ دی مہلت

تمہارے گیتوں کا ماہیا - مرا رقیب - نواز
وہ شہ سوار - وہ شہ زور وہ حبیب نواز
لہو میں لتھڑی ہوئی ایک ٹانگ دیکھ سکا
کہ اُس کے منتشر اعضا کو ڈھونڈھ ہی سکتا

مشین گنیں بصد غیظ تڑتڑانے لگیں!
جوابی حملہ تھا - اس زور کا کیا ہم نے
گرجتے گونجتے فائٹر اِدھر اُدھر جھپٹے
فلک شگاف اک اک گنوں نے ہر جانب

معاً برسنے لگیں گولیوں کی بوچھاڑیں
سُنائی دینے لگیں دشمنوں کی چنگھاڑیں
دہاڑتی ہوئی گن سے اُبل پڑے گولے
اچھالے آگ کے بھبکے دھوئیں کے مرغولے

ہمارے ٹینک - بھیانک پہاڑ - چلتے ہوئے
سیاہ جبڑوں تلے ہڈیاں کچلتے ہوئے
پھلانگتے ہوئے پست و بلند آگے بڑھے
سروں پہ پھٹنے لگے مغز پاش دستی بم

اندھیری آنکھوں سے بدبادیاں اُگلتے ہوئے
کراہتے ہوئے جاپانیوں کو دلتے ہوئے
اور ان کی آڑ میں دشمن پہ بھڑ گئیں فوجیں
دلوں میں گڑنے لگیں کچکپاتی سنگینیں

مری طرف ذرا نظریں اُٹھاؤ — روتی ہو؟
میں اُس دہکتے جہنم سے بچ کے آیا ہوں
مرے ڈراؤنے پیکر پہ ٹمٹماتا ہُوا
یہ ماحصل مرے زخموں کا میری خدمت کا

ہلاکت آفریں منظر سے ڈر گئی ہو کیا؟
یہ جھلملاتا ہُوا تمغہ دیکھتی ہو کیا؟
یہ جھٹپٹے میں درخشاں - نصیب کا انجم
خدا گواہ کہ اس ماحصل کا حاصل تم

پلنگ کے پاس سے بیساکھیاں ہٹا دو اُدھر
ذرا یہ دانتوں کا سیٹ اس گلاس میں رکھ دو

مری طرف ذرا دیکھو تو - روئے جاتی ہو؟
سہاگ رات ہے للہ سسکیاں نہ بھرو

وقار عظیم

منٹو کے افسانے

منٹو اُردو کے سب سے بدنام افسانہ نگار ہیں۔ اور اُنہیں میرے نزدیک "طوائف اور فرائڈ" کے قرب نے بدنام کیا ہے۔ اُردو کے کسی افسانہ نگار نے اِن دونوں شہرۂ آفاق ہستیوں سے جان بوجھ کر اتنا قرب بھی حاصل نہیں کیا۔ جب منٹو طوائف کی زندگی اور فرائڈ کے نفسیاتی نظریوں کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتے ہیں۔ تو اُن کے بیان میں جتنی آمد اور روانی ہوتی ہے کسی اور وقت نہیں ہوتی اور اسی لئے منٹو کے افسانوں کی دنیا کھوکھلی اور بے رنگ رہ جاتی ہے۔ گو اس کھوکھلی اور بے رنگ دُنیا میں رہ کر منٹو نے جتنا زیادہ لکھا ہے، اپنی "مخصوص دُنیا" میں رہ کر اتنا ہی لکھا۔

"کھوکھلی اور بے رنگ" اس لحاظ سے نہیں کہ جس دنیا کے متعلق وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ زندگی کی گہما گہمی سے خالی ہے۔ کھوکھلی اور بے رنگ، صرف فنی نقطۂ نظر سے۔ ورنہ طوائف اور فرائڈ کے دائرے سے باہر نکل کر منٹو نے ہماری زندگی کی بے شمار باتیں کہی ہیں۔ ان بے شمار باتوں میں پہلا نمبر اُن باتوں کا ہے جو ہندوستان کی سیاسی زندگی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ افسانہ نگار کی سیاسی حس نے چند مؤثر باتوں کو پھیلی ہوئی سیاسی فضا میں سے چُن کر اُنھیں اپنے افسانہ میں جگہ دی ہے اور ایک خاص دور کے سیاسی حالات، اور اِن حالات کے پیدا کئے ہوئے احساسات کی مصوری کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں سے 'نیا قانون'، 'شرابی' اور 'تماشا' کی بنیاد اسی سیاسی حس پر ہے۔ اور ان افسانوں میں آنے والی تصویروں میں ہمیں بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں —— ہندوستانیوں کا جذبۂ آزادی، آزادی کے حصول کے لئے، سیاسی تحریکوں کا زور شور، لوگوں کی تقریریں، ان تقریروں کے بدلے میں جیل، مارشل لا اور سینوں کو چھیدنے والی گولیاں، سیاسی جلسے، ان جلسوں پر گولیوں کی بوچھاڑ اور گلیوں اور بازاروں میں مسلح فوجیوں کا راج —— پھر اس سارے ماحول سے اُکتا کر ایک نئے قانون کی خواہش اور اس خواہش کو بیڑیاں پہنا دینے والی غلامی اور اس سے آگے بڑھ کر انقلاب اور لہو کی شاعری۔ یہ سارے حالات ہم میں سے بہت سوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، اگر دیکھے نہیں تو ان کا اثر ضرور محسوس کیا ہے۔ لیکن اُردو کے افسانہ نگاروں میں (ایک آدھ افسانہ نگار کے علاوہ) کسی نے بھی ان خونیں مناظر کی تصویریں اپنے افسانوں میں نہیں کھینچیں۔ بڑھتی ہوئی سیاسی حس کی ترجمانی تقریباً ہر جگہ ہے لیکن اس حس کے عملی مظاہروں کے نقوش ہمیں منٹو کے افسانوں میں جتنے اُبھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، کسی اور کے یہاں نہیں دکھائی دیتے۔

ان سیاسی افسانوں کے ساتھ ساتھ اور کبھی کبھی ان میں گھلا ملا ایک اور جذبہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں نسبتاً زیادہ شوخ ہے وُہ رومان کا جذبہ ہے۔ منٹو کے بہت سے افسانے زندگی کے ہلکے پھلکے، بے ضرر اور بے نتیجہ رومانوں کی کہانیاں ہیں۔ کبھی یہ رومان کے اس جذبہ کی حالت بالکل ایک گدگدی کی سی ہے جو کسی کو نقصان پہنچائے بغیر جسم کی فضا میں ایک ہلکی سی لرزش اور آس پاس تبسم اور قہقہے بکھیر کر آن کی آن میں ختم ہو جاتی ہے۔ ان رومانوں میں کسی کا جوان اور شوخ جذبہ خیالات میں ایک گدگدی پیدا کرتا ہے، یہ خیالات کبھی کبھی چھوٹی موٹی حرکتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ فضا میں تھوڑی سی سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کوئی معنی خیز نتیجہ پیدا کئے بغیر فوراً ہنسی مذاق کی ہلکی پھلکی فضا بن کر ختم ہو جاتی ہے۔ ان رومانوں میں جذبات کی گہرائی کے بجائے، شوخی اور شرارت زیادہ ہے۔ یا اگر کہیں شوخی اور شرارت سے کچھ زیادہ ہے تو ہمت کی کمی رومان کو ادھورا بنا دیتی ہے۔ چونکہ ان رومانوں میں جذبہ کی توانائی سرے سے مفقود ہے اس لئے افسانہ نگار جب کبھی اپنے

وہ کرداروں میں محبت کی باتیں کرواتا ہے تو یہ ساری باتیں محبت کے اُلجھے ہوئے لکچر بن کر رہ جاتے ہیں۔ محبت کے جس فلسفہ کو مکالموں کا موضوع بنایا جاتا ہے، صحت، صفائی اور فکر کی کمی ان مکالموں کو غیر دلچسپ، بے نتیجہ اور بوجھل بنادیتی ہے۔

منٹو نے اپنے گرد و پیش کی دنیا کے اَن گنت پہلوؤں کو دیکھا ہے۔ اور جو کچھ دیکھا ہے اُسے ایک اہم فرض کی طرح افسانہ کا موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کے افسانوں میں سیاست ہے، رومان ہے، جنسی نفسیات ہے وہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ —— مزدور، اُس کی پیشانی کا پسینہ، غریبی اور امیری اور ان دونوں میں یکطرفہ اور خود غرضانہ جنسی تعلق، غریبی کی مایوس کن فضا اور اس فضا میں رہنے بسنے والے ایسے لوگ جو کسی انقلاب سے غریبی اور اُس کی پیدا کی ہوئی مصیبتوں کو ختم کردینے کے لئے بے چین ہیں۔ ان افسانوں میں دو مختلف اور متضاد زندگیوں کا معاشرتی اور ذہنی ماحول ہے، وُہ سیٹھ جن کے دل میں دیا نہیں اور وہ بیکار جو دیا کی بھیک مانگتے مانگتے مرجاتے ہیں، نوکر ایک طرف اور آقا دوسری طرف۔ پھر منٹو کی دیکھی ہوئی دُنیا میں مذہب اور اُس کا پیدا کیا ہوا زہریلا ماحول ہے اور فلم کمپنیوں کی بظاہر چمکیلی بھڑکیلی اور رنگین دنیا ہے اور اس کے علاوہ ہر طرح کے انسان۔ یہ ساری باتیں ہر شخص دیکھتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی زندگی میں طرح طرح کے آدمیوں سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن ہر انسان ہر دیکھی ہوئی بات اور ہر آدمی کو افسانہ کا موضوع بنا لینے کے لئے بے قرار نہیں ہوجاتا۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وُہ ہر واقعہ، ہر خیال اور ہر شخص کو افسانہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ بہت سی باتیں آدمی صرف جذبات کی رو میں بہ کر کہہ جاتا ہے۔ لیکن منٹو ان جذباتی اور ہنگامی چیزوں میں سے ہر ایک کو چھپوا دینے کے قائل ہیں۔ ہر مضحکہ خیز اور اضطراب انگیز حالت، خواہ اس میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو، منٹو کا زور قلم اُسے افسانہ بنا دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ منٹو کے بہت سے افسانے پڑھ کر اُن کے بے معنی اور بے مقصد ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے۔

یہ بات عموماً منٹو کے اُن افسانوں کے متعلق کہی جاتی ہے۔ جن میں جنس یا طوائف ہے۔ لیکن میرے نزدیک فن کی حیثیت سے منٹو کے سب سے کامیاب افسانے وہی ہیں جہاں وہ ہمیں جنسی جذبہ کے رینگتے اور مچلتے ہوئے احساس کی تصویریں بناتے یا طوائف کے ماحول میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس فضا اور اس ماحول میں پہنچ کر منٹو کا ذہن اور اُن کے قلم میں بلا تیزی، روانی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے —— یہاں آکر اُن کی طنز میں لطافت بھی آجاتی ہے اور تندی اور شوخی بھی۔ یہاں کے مناظر میں صداقت کی رنگینی، یہاں کے کرداروں میں زندگی کے مکمّل نقوش اور یہاں کے جذبات میں کھرا پن ہے۔ منٹو نے جن افسانوں میں طوائف کی زندگی کو اپنے پلاٹ کا محور بنایا ہے۔ وہاں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ نہ سچّے جذبات کی، نہ ان سچّے جذبات میں ڈوبے ہوئے کرداروں کی اور نہ ان کرداروں کے گرد و پیش کی زندگی کے پُر حقیقت مناظر کی۔ ان سب باتوں کے اظہار کے لئے نہ منٹو کے پاس لفظوں کی کمی ہے، نہ کہنے کے طریقوں کی۔ تشبیہیں، استعارے اور کنایے اس جگہ آکر اپنا پورا پورا کام کرتے ہیں۔ اُن کی مدد سے مکروہ مناظر کی تصویریں بھی کھنچ جاتی ہیں اور انہیں کے وسیلے سے دلوں کی گوناگوں کیفیتوں کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ انہیں سے نفرت اور حقارت پیدا ہوتی ہے اور انہیں سے ہمدردی اور محبت کے جذبات اُبھرتے ہیں —— منٹو کی ادبیت اور فن کی پرکھ یہیں آکر ہوتی ہے۔ یہاں آکر یا پھر وہاں جہاں وہ فرائڈ کو اپنا رہنما بنا کر چلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ منٹو نے شائد اُس خاص عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو (لڑکوں کو بہت کم اور لڑکیوں کو بہت زیادہ) جب اُن میں جنسی احساس پیدا ہوتا ہے، پردے کے پیچھے یا دیواروں کے سوراخوں میں چھُپ کر دیکھا ہے۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی تحریک تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جنسی جذبہ کے ساتھ جہاں ایک طرف کچھ جذباتی کشمکش، سی پیدا ہوتی ہے وہاں اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاص طرح کی جسمانی بیداری کا احساس بھی رفتہ رفتہ قوی ہوتا رہتا ہے۔ منٹو نے اُس جذباتی کشمکش، اور

جسمانی بیداری کو ایک دوسرے کے لازم و ملزوم جان کر ہمیشہ ان کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے، اور عموماً جسمانی بیداری کے پلّے کو بھاری رکھا ہے۔ یہی جسمانی بیداری کسی نہاں لذت کا احساس پیدا کرتی ہے اور اسی احساس کے پیچھے پیچھے ایک زبردست خواہش کچھ کر لینے کی تمنا خود بخود جیسے رینگتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے —— لیکن اس خواہش کے آس پاس، آگے پیچھے انسان کی اپنی زندگی اور اُس کی طرح طرح کی اخلاقی پابندیاں ہیں۔ اس نے عموماً اس جذبہ اور خواہش کو دبانا ضروری ہو جاتا ہے اور اس فطری خواہش کے دبنے سے اور بہت سی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ منٹو نے ان ساری چیزوں کا ذکر بڑی چابک دستی سے کیا ہے۔ پھر بھی اُن کے اُس طرح کے افسانوں میں ایک بڑی خرابی ہے —— اُنہیں پڑھ کر عموماً یہ محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار ہر معمولی بات پر نفسیات کا غلاف چڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور نفسیات کا جو رنگ صرف مطالعہ کی گہرائی اور مشاہدہ کی باریک بینی ہی سے پیدا کرنا ممکن ہے، وہ منٹو نقطوں اور فقروں کے ابہام سے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ نفسیات اگر زندگی میں گھل مل کر رہنے کے بجائے، صرف فن بن کر زندہ رہنا چاہتی ہے تو اُسے افسانہ کے علاوہ کہیں اور پناہ لینی پڑے گی۔ منٹو کو بھی اگر اپنے نفسیاتی افسانوں میں صداقت پیدا کرنی ہے تو اُنہیں نفسیات کو فن کی حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کے ایک اہم اور ضروری ہمسفر اور شریک کار کی حیثیت سے اپنانا پڑے گا۔

منٹو نے نفسیات اور فلسفہ کے رموز کو نہیں، بلکہ اُن کی پیچیدگیوں کو افسانہ کا موضوع بنانا چاہا ہے۔ اور ان پیچیدگیوں کو عموماً مکالموں کی شکل دے کر اُنہیں زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔

منٹو کو افسانوں میں مکالموں سے کام لینے کا بے حد شوق ہے اور اُن کے بہت سے افسانوں میں، فضا کے پیدا کرنے یا موضوع کی گہرائی کے اظہار کے لئے مکالموں سے مدد لی گئی ہے، لیکن اکثر موقعوں پر ان مکالموں کا پڑھنے والا تھک کر یا اُکتا کر اس فضا سے باہر نکلنے کے لئے بے چین سا ہو جاتا ہے۔ اور اس تھکاوٹ اور گھبراہٹ کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ افسانہ نگار مکالموں پر خود ساختہ (یا بعض صورتوں میں کتابوں سے حاصل کئے ہوئے) فلسفہ کی تہیں چڑھاتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اصل بات اسطرح کھوئی جاتی ہے کہ اسکا تلاش کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ یہ بوجھل اور پُر تصنع مکالمے افسانہ کو مجذوب کی بڑ بنا دیتے ہیں۔ یا پھر یہی مکالمے کبھی کبھی زندگی کی اُس نچلی سطح پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں کا ماحول افسانہ کے فن کو راس نہیں آتا۔ افسانوی مکالمہ کے لئے یہ دونوں راہیں خطرناک ہیں۔ ایک سے ذہن زندگی سے بہت دور ہو جاتا ہے اور دوسرے سے زندگی سے بہت قریب۔ افسانہ میں زندگی کو ایک درمیانی راہ چلنی پڑتی ہے اور منٹو کے مکالمے یہ درمیانی راہ چلنا نہیں جانتے اور اسلئے پڑھنے والے کے ذہن کو اونچے نیچے ٹیلوں اور خندقوں اور کھائیوں میں چلنا پسند نہیں۔ اسی لئے منٹو کے جن افسانوں کی بنیاد مکالموں پر ہے وہ اُن کے اچھے افسانے نہیں۔

صرف مکالموں ہی پر منحصر نہیں، منٹو کے فن کے ہر پہلو پر اُن کی انتہا پسندی کا اثر پڑا ہے۔ زبان و بیان کے معاملہ میں، تشبیہوں اور استعاروں کے انتخاب میں، مزاح اور طنز میں —— ان میں سے ہر چیز میں منٹو نے اپنے لئے ایک راستہ نکالا ہے جو دوسروں سے الگ ہو اور اس حد تک الگ ہو کہ لوگ جب کسی راہی کو اُس پر چلتے دیکھیں تو اُنہیں دھچکا سا لگے۔ منٹو کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت عام مذاق میں دھچکا لگانا ہے۔ اور اس فن میں اُردو کے افسانہ نگاروں میں سے کوئی اُن کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ وہ مذاق کرتے ہیں تو اُس میں لطیف کنائے کی جگہ مذاق اُڑانے کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ اُن کی پھبتیوں میں بے ساختگی اور جدت کے باوجود لطافت بہت کم اور عامیانہ پن بہت زیادہ ہے۔ منٹو اسّی فیصدی یا اس سے بھی کچھ زیادہ صحیح زبان لکھ سکتے ہیں، لیکن ضروری نہیں۔ کہ اُس میں ہر جگہ لطافت بھی ہو —— محض لطافت کے شاید وہ قائل بھی نہیں، اسی لئے اُنکے فکر اور ذکر دونوں میں ایسی باتوں کی کثرت ہے جنہیں ترقی پسندی کا جذبہ بھی جائز نہیں بتا سکتا۔ منٹو میں اچھے افسانہ نگار کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ نئی سے نئی بات سوچ سکنے والا دماغ، نئی بات کو نئے انداز میں کہہ سکنے کا سلیقہ، زبان و بیان پر قدرت، اپنے ماحول کو غور سے دیکھ کر اُس میں سے کام کی باتیں چُن لینے والی نظر اور ہر چیز میں طنز یا مزاح کا پہلو تلاش کر سکنے کی صلاحیت لیکن وہ ان چیزوں سے صحیح کام لینا نہیں جانتے۔ اور وہ قریب کی چیز کو بھی دور کھڑے ہو کر اور اکثر اوقات کسی بہت اونچی جگہ کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ یہ بھی شاید کوئی نفسیاتی بیماری ہے۔

سومناتھ لہری

(ہندی سے ترجمہ)

۱۹۴۳ء

ٹاٹ کے کارخانے کا بیچنگ اور سائینگ ڈیپارٹمنٹ ہے۔ مزدور لوگ اسے عورتوں کا کارخانہ کہتے ہیں۔کیونکہ اس میں کام کرنے والی زیادہ تر عورتیں ہیں۔

بڑا سا مکان ہے۔ فرش سے چھت تک مکان کے سارے ماحول میں جوٹ کے ریشے اور جوٹ سے نکلی ہوئی دھول یوں دکھائی دیتی ہے جیسے خوب پتلا، سپید کہرا ہو۔ایسا کہرا نہیں، جس میں کچھ نظر ہی نہ آتا ہو۔مزدور عورتوں کی ہر سانس کے ساتھ تھوڑی دھول اور تھوڑے ریشے تو جائیں گے ہی، پہلے پہل تو دم گھٹنے لگتا ہے۔پھر دھیرے دھیرے سب گوارا ہو جاتا ہے۔

جہاں رانی کام کرتی ہے۔ وہاں سے آس پاس کی عورتوں کو خوب پہچانا جا سکتا ہے۔بہت دور سے دیکھنے پر اس کہرے میں اتنا صاف پہچانا نہیں جاتا۔ درمیان میں بجلی کی تیز روشنی ہے۔ وہاں پر کہرا پھٹا پھٹا سا ہے۔ دھول کے ذرے روشنی میں چمکتے ہیں۔ تو ان کے بیچ میں سفید سفید ریشے صاف چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

دور کہرے میں ایک سایہ سا داخل ہوا۔ تھوڑا اندر آنے پر معلوم ہوا کہ وہ مرد ہے۔ رفتہ رفتہ سمجھ میں آیا کہ عورتوں کے کارخانے کا سردار امیدی ہے۔ رانی ہی کی طرف آرہا ہے۔

رانی کا کلیجہ دھڑک اٹھا۔مردوا آج کہیں پھر وہی بات تو نہیں اٹھائے گا؟ سردار سے بے مروت ہو کر مزدوری کیسے کی جا سکتی ہے لیکن اس کا گھر ہے، شوہر ہے، چھ برس کا بچہ ہے۔ نموا سردار کیا دھرم کی دہائی بھی نہیں مانے گا۔ہائے بھگوان!

امیدی سردار، رانی کے پاس آکر رک گیا۔سینہ تان کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ہنسا۔آگے کے دو دانتوں میں سونا مڑھا تھا۔پان اور "کھینی" کے داغوں کے درمیان، سونا چمک اٹھا۔

"کہو جی رانی بی بی! اب کیا کرنا ہوگا؟ اس کارخانے سے تو اب دانہ پانی اٹھ گیا ——— ؟"

رانی کی چھاتی گویا کارخانے کی آواز کے ساتھ تال دیتی ہوئی دھک دھک کرنے لگی۔کیا سچ مچ سردار کام چھڑا دے گا؟ تب کھو کا کیا کھائے گا؟ پتی سے کیا کہوں گی؟ کیا یہ بات پتی سے کہی جا سکتی ہے۔کہ سردار دھرم بگاڑنا چاہتا ہے؟ اور پھر کہنے سے کیا ہوگا۔وہ وشواس بھی کرے گا؟ ..... نہیں، جا کر چھوٹے صاحب کے پیر پکڑ لوں گی۔شام کو جب وہ میم کو لے کر گنگا گھومنے جاتے ہیں۔میم صاحب عورت ذات ہیں کیا انہیں بھی دیا نہ آئے گی؟ کون جانے؟ ——— سردار کی باتوں کے آگے معمولی مزدورن کی بات کا کیا وشواس ہوگا؟ ——"

ایک سانس میں کتنے وچار، پھیلنے اور بھٹکنے لگتے ہیں۔سردار کیا کہہ رہا ہے۔وہ انہیں بھی نہیں سن پاتی۔سردار نے جب چاروں طرف چور کی طرح دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔تو اس نے یکایک چونک کر سنا سردار کہہ رہا تھا ——— "ملٹری نے یہ کارخانہ لے لیا ہے۔ ان کا لڑائی کا سامان تیار ہوگا۔اب یہاں بورے نہیں بنیں گے سب مزدور مزدورنوں کو کام سے جواب ہے۔تیرے مرد کا بھی کام ختم۔مل سے سستا چاول، آٹا بھی بند ہوگیا۔اب کیا کھائے گی؟"

بپتا بھری خبر ——! پر آگے کیا ہوگا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔سارے خیالات دبا کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔چلو جان بچی، اب سردار کام چھڑانے کی دھمکی تو نہ دے سکے گا۔نوکری کیوں چھوٹ گئی۔اس کا کارن بھی شوہر سے نہ کہنا ہوگا۔سب کا ہی تو کام چھوٹے گا۔سبھی تو ایک چھپّر کے نیچے ہیں۔

دور ——— چھوٹے صاحب داخل ہو رہے تھے۔یہ دیکھ کر سردار آگے بڑھ گیا۔

*

رانی اور اس کا شوہر بدھو ——— کسی وقت گاؤں میں رہتے تھے

بیسُو کا ایک چھوٹا بھائی کِسُن بھی تھا۔ تین چار بیگھے دھان کی کھیتی، ایک ٹوٹا پھوٹا گھر ---- اور بس۔

تین چار بیگھے زمین سے کیا بنتا ہے۔ سال بھر کی خوراک بھی نہیں اُگتی۔ مہاجن کا قرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ زمین تو رہن تھی ہی، گھر کی زمین بھی گروی ہو گئی۔ فصل کا بیشتر حصّہ مہاجن کو چلا جاتا تھا۔ تین چھوڑ ایک آدمی کا بھی گذارا نہیں ہوتا۔ اسلئے انہوں نے سوچا۔ کہ زمین سے جو وصول ہو گا۔ اس کی دیکھ بھال کِسُن کرے گا ---- بیسُو اور اس کی بیوی شہر چلے آئے۔ بہت کھوجنے پر گاؤں کی پہچان کے ایک مستری کی معرفت بڑے سردار کو رشوت دے کر بیسُو نے ٹاٹ کے کارخانے میں کام حاصل کیا۔ وہ بھی پکا نہیں عارضی کا ---- بیچ بیچ میں بیکار بیٹھنا پڑتا تھا۔ کچھ بھی ہو، ہفتے میں تین چار روپے تو گھر آتے ہی ہیں۔ بالکل تو فاقہ نہیں کرنا پڑتا۔ مگر رانی نے ایک اور مصیبت کھڑی کر دی ---- ڈائن نے پھر ایک بچہ جنا۔ دو مُنہ تو کسی طرح بھرے جا رہے تھے اب ایک اور بڑھ گیا۔ بچے کتّے خالی رینگنے کو ہی پیدا ہوتے ہیں۔

پھر بھی عورت مضبوط ہے۔

اس کے جسم میں جان ہے۔ ٹاٹ کے کارخانے میں کام پر لگا دیا جائے۔ تو اسے دیکھ کر سردار کام بھی دے سکتا ہے۔ عورت کی مزدوری سے دو چار روپے اور مل جائیں گے۔ "عورت مزدوری کرتی ہے" یہ سُن کر گاؤں کے لوگ باتیں بنائیں گے۔ لیکن انہیں معلوم ہو تب نا؟ اتنے بڑے شہر میں کون کس کی خبر رکھتا ہے۔ اور پھر جان بھی جائیں تو کونسی بھاگوت اپوتر ہو جائے گی۔ کتنی ہی تو عورتیں اس کارخانے میں کام کرتی ہیں۔ رانی بھی ٹاٹ کے کارخانے میں بھرتی ہو گئی۔ ہفتے میں دو تین روپے لے مرتی ہے۔ شوہر بیوی کی ملی جُلی آمدنی سے پانچ روپے گھر کا کرایہ اور خرچ چل جاتا ہے۔ جب کارخانے سے سستے داموں دال، چاول مل جاتا ہے تو چلے گا بھی کیوں نہیں۔ مہینے میں دو ایک روپے بچ بھی رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ مستری کے ہاتھ بارہ روپے گاؤں بھیجے گئے۔ کھیت نہ سہی گھر کی زمین کا سُود تو نہیں بڑھے گا۔ دھیرے دھیرے ساری زمین چھڑائی جا سکتی ہے۔ یہی سوچ کر بیسُو شہر آیا تھا۔ کارخانہ بند ہونے سے سب اُلٹ پلٹ ہو گیا۔

کارخانے کے پھاٹک پر نوٹس لگ گیا۔ "ہمارے اس ایک نمبر کے کارخانے کو سرکار نے اپنے کام کے لئے لے لیا ہے، اس لئے ہم کل مزدور مزدورنوں کو جواب دینے پر مجبور ہیں۔ ہمارے کارخانے کی آمدنی بند ہو گئی۔ اس لئے سستے بھاؤ آٹا دال دینا مالکوں کے لئے ممکن نہیں۔ پھر بھی یہاں کے کچھ لوگوں کو ہمارے دو نمبر کے کارخانے میں عارضی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ عارضی طور پر کام کرنا چاہیں وہ اسی ہفتے دو نمبر کی مِل میں جا کر نام لکھوا لیں" ----

بیسُو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ بیشتر مزدور نہیں جانتے۔ لیکن اسی دوران میں یہ خبر کارخانے بھر میں پھیل گئی، جیسے ضروری تار ہو۔ بیسُو جب کام ختم کر کے شام کو کارخانے سے چلا اس وقت تک وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ پھر بھی پھاٹک پر لگے ہوئے نوٹس میں لکھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے حرفوں کی طرف وہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس میں سے حسبِ خواہش نئے معنی پیدا کرتا رہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا ---- نہیں ہو سکتا۔ ڈیڑھ بات کی بات! یہ کبھی نہیں ہو سکتا"۔

پھاٹک سے تھوڑی دور پر کوئی ڈھول بجا رہا تھا۔ "میٹنگ ہو گی۔ ---- گول تالاب کے میدان میں، آج ہی، ابھی۔ ٹاٹ کا کارخانہ بند ہونے کے بارے میں، بڑے بڑے لیڈر آئے ہیں۔ ابھی چلو ---- سب مزدور ---- ابھی چلو........"

بیسُو نے سروار لوگوں میں ایک مربّی سے چلتے چلتے پوچھا ---- "کس کی میٹنگ ہے جی؟ لال جھنڈے کی تو نہیں؟"

"ارے تھُو ----!" تمباکو تھوکتے ہوئے مربّی نے کہا ---- "کیا لال جھنڈا اب یہاں مُنہ دکھا سکتا ہے؟ سالا لوگ کہتا ہے کہ دو نمبر مل ہی میں بدلی کا کام کرو ---- لڑائی کے لئے زیادہ ٹاٹ بناؤ ---- اُس سے کیا ہمیں روٹی بھی ملے گی ---- لڑائی کے لئے ہماری روٹی بھی گئی۔ لال جھنڈے والوں کو ادھر آنے پر مار بھگائیں گے"۔

بیسُو کارخانے میں تھوڑے ہی دنوں سے کام کرنے لگا تھا۔ زیادہ سمجھتا نہ تھا۔ پُوچھنے لگا "تب یہ کس کی میٹنگ ہے۔ کوئی لیڈر آئیں گے؟"

" ---- بڑے بھاری لیڈر آئیں گے۔ صداقت حسین کا نام سُنا ہے؟ وہ آئیں گے۔ بڑا بھاری آدمی ہے۔ لاٹ کی کونسل کا ممبر ہے بہت

زبردست - ہمارے لئے ایک قلم لکھ دیں گے تو لاٹ صاحب کو بھی ماننا ہوگا۔ سمجھا؟"

باتیں کرتے کرتے میٹنگ میں پہنچے - اس وقت تک میٹنگ شروع ہو چکی تھی - صداقت حسین بول رہے تھے ___

"خبردار! کوئی لال جھنڈے والوں کی چال میں نہ پھنسنا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ دو نمبر کی مل میں عوضی کا کام کرو - اور سبھی مل کر کام کے ہرجانے کی مانگ کرو - ارے ایک بار عوضی کے کام پر چلے جانے سے کیا پھر سرکار ہرجانہ دے گی؟ کہے گی، کام تو مل گیا - اب اور کیا؟"

مرتی مزدور نے بیٹو کو کہنی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ___ "سنا عوضی کے کام پر چلے جانے سے ہرجانہ نہ مل سکے گا - کام بند کرنے سے ___ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھو - گھر بیٹھے سرکار روپیہ دے گی۔"

صداقت حسین آنکھیں نکال کر کہہ رہے تھے ___ "لال جھنڈے والے سرکار کے دلال ہیں - اسی لئے کہتے ہیں کہ عوضی کا کام کرو - جس سے سرکار کا پیسہ بچ جائے، کہتے ہیں - کہ جو لڑائی چل رہی ہے - وہ ہمیں بھی لڑنی ہو گی - ارے آج جو ایک نمبر کی مل سے ہماری روٹی گئی - وہ کس کے کارن؟ اسی لڑائی کی وجہ سے ___ اسی لئے سرکار نے مل لے لی ہے - ہماری روٹی چھن گئی - اس لڑائی نے ہی ہمارا ستیاناس کر دیا۔"

لیڈر کی کرسی کے پاس بہت سے لوگوں نے تالیاں پیٹیں - بیٹو نے لڑائی وڑائی اتنی نہ سمجھی - اس کے ذہن میں صرف ایک بات تھی - اس نے تالیوں کے شور میں پاس کھڑے ہوئے مرتی سے پوچھا - "ہرجانے کا روپیہ کتنے دنوں میں ملتا ہے؟ اگر سرکار نہ دے تو!"

مرتی اس وقت دھیان سے تقریر سن رہا تھا - بولا ___ "سنو نا حسین صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

صداقت حسین نے کہا ___ "ہرجانہ نہ دے کر سرکار کہاں جائے گی - قانون ہے ___ پکا قانون ___ کارخانہ بند ہونے پر سرکار کو پورے ایک برس کی تنخواہ ہرجانہ میں دینا ہو گی - لاٹ صاحب کو بھی یہ قانون ماننا پڑے گا - پچھلی لڑائی میں نہیں دینا پڑا تھا؟ کوئلہ نہ ملنے پر، جب کارخانہ بند ہوا تھا تو بھتہ اور رسد نہیں دینا پڑا تھا؟ اس دفعہ نہ دینے سے کس طرح پار لگے گا؟ گھر بیٹھ کر ہم روپیہ کمائیں گے۔"

اس بار چاروں طرف زور زور سے تالی بجی - گرم ہو کر صداقت حسین نے کہا "سات دن کے اندر اندر سرکار سے روپیہ لے کر رہیں گے - ضرورت پڑنے پر لاٹ کونسل تک معاملہ جائے گا - تم سب صرف ایکا کئے رہو - کوئی بدلی کے کام پر نہ جانا - اور سب چندہ ڈال کر فنڈ جمع کرو - معاملہ بڑا نازک ہے ___ بہت روپیہ لگے گا - اکٹھے ہو کر رہو - قانون ہے - روپیہ لے کر ہی چھوڑیں گے" ایک بار پھر زور زور سے تالیاں بجیں - جلسہ ختم ہو گیا - اٹھتے اٹھتے مرتی نے بیٹو سے کہا "سنا؟ آئین ہے ___ قانون! لاٹ صاحب کے باپ بھی نہیں روک سکتے - چلو چلو چندہ جمع کرا دیں۔"

حسین صاحب کے ساتھیوں کی جھولی میں جھنڈ مزدور آ کر اکنی چونی اور کئی لوگ روپیہ تک ڈال جاتے ہیں - بیٹو نے بھی بھگوان کا نام لے کر سر سے چھو کر ایک دوانی جھولی میں ڈال دی۔

راستے میں چلتے چلتے سوچتا جاتا ہے - "قانون ہے قانون، راستے میں پیشاب کرنے کے لئے نکلنے کا راستہ نہیں - قانون پکڑ لیتا ہے - سنا ہے عورت کا خون کرنے پر ایک جج صاحب کو پھانسی ہو گئی تھی - ایسا قانون ہے! وہائی رام! ذرا جلدی کرو - جس سے سات آٹھ دن میں ہی فیصلہ ہو جائے"

" ___ ادھرم ہوتا ہے ادھرم! پرائے مرد کے ساتھ دھرم نشٹ کرنے سے نرک میں بھی جگہ نہیں ملتی - پتی کے لئے ستی نے جان دے دی - پرائے مرد سے نہ بولی ___ رام رام وہ بات منہ تک لانا بھی پاپ ہے۔"

رانی من ہی من میں غصہ سے جل رہی تھی - سویرے سویرے وہ کلموا امیدی پھر آیا تھا - پندرہ دن تو بنا کام کے ہو گئے - رسد بند ہے - سرکار نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا - چاول کب کا ختم ہو گیا - اب کب تک بھوکی رہے گی ___ مرکلموہے! ___ ہم بھوکے رہتے ہیں تو تیرا کیا - کتنے ہی لوگ تو سوکھ رہے ہیں ...... پر وہ کب دھیان دیتا ہے؟ کہتا ہے ___ میرے ساتھ چل، بچ بچ، سچ سچ میں دور کہیں چل کر کام تلاش کریں گے - میں سردار ہوں مجھے کام کی کیا فکر؟ اور ہاتھ

میں بھی تو کچھ ہے! ـــــ دُور ہو ابھاگے!"

پھر بھی دل ڈانواڈول ہے۔ رانی پھر زور لگا کر سوچتی ہے "اوہ! آدمی کی کیا مجال ہے۔ کہتا ہے، کھوکا کو گھر پر ہی چھوڑ کر میرے ساتھ چل، بھاگ چل۔ اپنے کھوکا کو چھوڑ کر میں اس دُشٹ کے ساتھ جاؤں گی؟ دُور ہو بدذات، حرامی پِلّہ کہیں کا!" ـــــ

پھٹی چٹائی پر اُٹھ کر بیٹھے ہوئے کھوکا کو وہ سینے سے لپٹا لیتی ہے "میرا بھیّا ـــــ میرا لاڈلا، راجہ بیٹا!" پھر سوچتی ہے۔ کہ چاول تو پانچ دن پہلے ہی ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ایک روپیہ دے کر ایک سیر چاول خریدا گیا۔ وہ بھی کب آسانی سے ملتا ہے۔ "باپ رے! ایک سیر چاول کا دام ایک روپیہ تو کبھی نہیں سُنا تھا۔ ایک وقت آدھا پیٹ کھا کر ہی وہ چاول پرسوں ختم ہوگیا۔ کل ہرے مٹروں پر کٹی۔ مٹھی بھر باسی بھات کھوکا کو ملا تھا۔ آج وہ بھی نہ ملا۔ ہائے رام کیا بیتنے والی ہے؟

سات دن کے فاقے اور آدھ پیٹ کھانے سے بچے کے منہ پر چھائیں سی لگ گئی تھیں۔ پیٹ سوکھ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ٹھن ٹھنا کر روتے روتے بولا "بھوک لگی ہے ماں! بھات دے!"

"ـــــ میرے راجہ، میرے لال، نہ رو، ذرا صبر کر، باپ ابھی چاول لے کر آ رہا ہے۔ گرم بھات کھانا بیٹا!"

"ـــــ درم بھات نہیں۔ منہ دل دائے دا۔ تھندا بھات تھاں دے"

ـــــ "اچھا، اچھا، ٹھنڈا بھات دیں گے۔ ذرا ٹھہرو۔ ابھی باپ آیا۔" ٹھنڈا بھات پانے کی اُمید میں نہ جانے کیا سوچ کر بچہ چپ ہوگیا۔

بیسُو گھر میں گھسا۔ سُوکھا مُنہ دیکھ کر پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے رانی نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کچھ ہو سکا؟" غصّہ سے بیسُو نے چلا کر کہا ـــ "ہو گا کیا، ہمارا سر؟ کیا کوئی کام لے کر بیٹھا ہے؟"

رانی کچھ کہنے ہی والی تھی۔ کہ اسے روک کر بیسُو بولا "میری ہی نہیں سب کی یہی حالت ہے۔ جتنے لوگ گھر بیٹھ کر ہرجانہ لینے کی سوچ رہے تھے سبھی دو نمبر کی مل کے دروازے پر چکّر لگا رہے ہیں۔"

اور لوگ بھی اسی کی طرح بے وقوف بنے ہیں۔ یہ سوچ کر دُکھ میں بھی اسے اطمینان سا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی آنے والا خشک سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ مینجر صاحب اور اس کے باپ کو بڑی بُری گالیاں دے کر بولا۔

ـــــ "اوہ سالا کیسا نخچر ہے۔ کسی کو بھی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ سات دن میں جو آیا اُسے کام دے دیا۔ اب اور ضرورت نہیں ہے۔"

رانی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ـــ "چاول بھی نہیں لائے؟ پرسوں رات سے فاقہ چل رہا ہے۔ ہم نے تو کسی نہ کسی طرح سہہ لیا۔ پر بچہ بچارا کیا سہہ سکے گا؟" "بچہ ـــ بچہ ـــ بچہ تیرے لئے بس کھوکا ہی ہے"۔ بیسُو یکبارگی پھُوٹ پڑا ـــــ "اُسے کیوں جنا تھا چڑیل؟ نمک دے کر مار نہ سکی؟ جتنی بھی آفت ہے سب ٹھونسنے کے لئے ہے"۔ اور انگوچھے میں بندھی کنگنی کی پوٹلی زمین پر پھینک کر بولا ـــ "یہ ہے پیڑا بنا بس!"

رانی چُپ ہو رہی۔ تھوڑی دیر بعد غصّہ کم ہونے پر بیسُو نے کہا۔ ـــــ "یہ آدھ سیر چاول ہیں۔ بہت کھوج کھاج کر ساڑھے چھ آنے میں ملے ہیں۔ کتنا ہی کہا۔ پر اس پنساری کے بچے نے کسی طرح بھی آدھ سیر سے زیادہ نہ دیا۔ خوب ہوشیاری سے روک روک کر خرچ کرنا۔ سمجھی؟ پونجی تو چُک گئی۔ اسی سے اتنے دن چلانا ہے، چاروں طرف پریشانی ہے۔ گنگا کے دونوں کناروں پر دس دس کوس کے اندر ٹاٹ کے جتنے کارخانے ہیں ان سب میں گھومتے گھومتے پیروں کی چمڑی گھِس گئی۔ کون کام دے گا؟ ویسے ہی آدمی نہیں لیتے اور پھر کوئلہ نہ ہونے کے کارن بہت سے کارخانے بند پڑے ہیں۔ مالکوں کو تو آج کل مزدور چھڑانے ہی سے لابھ ہے۔ سستے چاول اور آٹے میں روپیہ خرچ نہیں ہوتا۔"

بیسُو پریشان ہو جاتا ہے۔ ایک پاؤ چاول میں دو کھانے والے ہیں۔ اور اس پر بچہ بھی ـــــ پیٹ کا کونا بھی نہیں بھرتا۔ بیسُو بولا "یہ بھات دو آدمیوں کے لئے؟ ہنڈیا دیکھیں؟ ہنڈیا میں ایک مٹھی اور بھی تو ہے۔ اسے لے آ، وہ کس کے لئے رکھا ہے چڑیل؟"

رانی گھبرا کر بولی ـ "ہائے ہائے وہ نہ لینا، کل بچہ کھائے گا۔ بچارے کی ہڈی پسلی تو نکل آئی ہے۔ سویرے ایک مٹھی نہ ملنے سے بچے گا نہیں۔"

ـــــ اوہ ہو، بڑا نواب زادہ ہے معلوم ہوتا ہے۔ سب پیڑے لونڈے کے گڑھے میں ہی جھونکتی ہے۔ اور ہمارے بدن سے تو کاتک کی شوبھا نکل رہی ہے نا؟ بھات نہیں۔ مانڈ[1] کھلا، مانڈ، سمجھی!

[1] چاولوں کا پیچ۔

بچے پر اب بھات خرچ نہیں ہوگا۔"

یہ کہکر ہنڈیا پتر پر اُلٹ لیتا ہے۔

اپنے ڈیڑھ مٹھی بھات میں سے آدھ مٹھی بھات رانی نے بچے کے لئے پانی ڈال کر ہنڈیا میں چپکے سے رکھ دیا۔

پھر صبح ہوئی۔ بچہ ابھی تک سو رہا تھا۔ بیسُو باہر سے آکر بولا — آج آخری جتن کر دیکھیں۔ پانچ اسٹیشنوں کے پار جو کارخانہ ہے، وہ کھُلے گا۔ دیکھیں اگر کچھ ہو سکے۔"

اچانک لڑکا اُٹھ بیٹھا — "ماں بھوک!" کہکر ٹھنٹھنانے لگا۔ بیسُو نے زور سے ایک چانٹا لگا کر کہا — "سُسرے کے پیٹ میں جیسے راون کی چتا جل رہی ہے!"

لڑکا سسک سسک کر رونے لگا۔ رانی اسے کلیجے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

بیسُو گھر سے باہر نہ نکلا۔ اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے بولا — اوہ بہت راستہ چلنا پڑے گا۔ اس پر یہ تیز دھوپ، لوٹتے لوٹتے شام ہو جائے گی۔ پیٹ میں ابھی سے آگ جل رہی ہے۔ خالی پیٹ اتنا راستہ کیسے چلا جائے گا؟ — ارے کچھ گھر میں ہے؟

یہ کہہ کر وہ چوکے کی طرف چلا۔ گودسے گرتے گرتے، بچے کو سنبھال کر رانی دوڑی "— وہ ذرا سا بھات ہے۔ اُسے نہ لو۔ چھوڑ دو۔ بچہ مر ہی جائے گا۔"

بچے سمیت رانی کو دھکیلتے ہوئے بیسُو بولا — "ٹھہر حرام زادی!" ہنڈیا کا ڈھکنا اُٹھا کر اُس نے کل بھات نکال لیا۔ اور چباتے چباتے بولا — "لونڈے کے لئے بھات چُرا کر رکھا ہے بدذات۔ نمک تو دے نہیں سکی۔ اب بھات کا پانی کھلا دے۔ اب بھات نہ کھلا پائے گی، سمجھی!"

لیکن مٹھی بھر بھات سے ہوتا کیا تھا؟ اس پر غٹ غٹ ایک لوٹا پانی چڑھا گیا۔ باپ کو بھات کھاتے دیکھ کر لڑکا چپ چاپ تاک رہا تھا۔ جب دیکھا کہ سارا بھات ختم ہوگیا ہے۔ تو پھوٹ کر رو پڑا۔ رانی کی آنکھوں میں بھی پانی آگیا۔

دن چڑھنے پر لڑکا روتے روتے جانے کب سو گیا۔ نیند میں کبھی کبھی اس کی سسکیوں کی آواز سُنائی دینے لگتی۔

اُس دن رسوئی بنانے کو کچھ نہیں تھا، مالک مکان کہہ گیا تھا، کہ آج کرایہ نہ دو گے تو کل گھر سے نکال دوں گا۔ رانی بیٹھے بیٹھے سوچتی ہے امیدی کل پھر آیا تھا۔ آخری بار کہتا تھا — دکھن کے کارخانے میں کام ملا ہے، کل وہاں چلا جاؤں گا، رانی چل میرے ساتھ چل مردار بیٹھے کو لے کر کیا کرے گی؟ وہ کیا کھانا دینگے؟ ہم بچے رہے تو سب کچھ ہے، لونڈے کو چھوڑ کر میرے ساتھ چل۔

کل رانی اس کے مُنہ سے وہ کڑوی بات نہ سہہ سکی۔ من میں جیسے بل ہی نہ رہا ہو، جاتے جاتے امیدی کہہ گیا تھا آنا ہو تو کل ہمارے گھر چلی آنا، اسی ٹیم سے جاؤں گا۔

وہی "کل" آج آگیا —

بیٹھے بیٹھے رانی سوتے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ "پنجر کی ہڈیاں نکل کر جیسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہوں۔ چھاتی کی ہڈیاں بھی جلدی ہی نکل آئیں گی —"

سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے من ہی من میں رانی کہہ رہی ہے — "میرے کلیجے! میرے لال! چندا بیٹا —"

باہر سے آواز سُنائی دی "رام نام ست ہے" دھیرے دھیرے اُٹھ کر رانی نے دیکھا۔ سڑک پر کسی بھاگوان کی ارتھی جا رہی ہے۔ مردنگ اور کھڑتال بج رہے ہیں۔ ارتھی کے آگے آگے کھیلیں پھینکی جا رہی ہیں رانی نے جھانک کر دیکھا کھیلیں ہی نہیں پیسے بھی ہیں۔

رانی تیزی سے آگے بڑھی۔ پیسے ڈبل پیسے، اور اکنّی، ہاں وہی تو، پیسے آج کل کہاں ملیں گے؟

لیکن یہ بھیڑ کیسی ہے؟ اور پیسے بٹورنے کے لئے کیسی چھینا جھپٹی ہے۔ رانی تھوڑی دُور تک ارتھی کے ساتھ ساتھ چلی پر اس بھیڑ میں سے پیسے اُٹھانا عورتوں کے بس کی بات ہے؟

رانی ذرا رکی اور پھر پیسے بکھیرنے والے بابو کی طرف بڑھ گئی — بولی "بابو ایک پیسہ دینا!"

بابو نے سر اُٹھائے بغیر کہا — "دُور ہو ڈائن! وہ سب لوگ جہاں سے اُٹھا رہے ہیں وہیں سے اُٹھا لے نا" اس کے بعد مُنہ اُٹھا

کر دیکھا۔ رانی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ آنکھوں سے نظر، چہرے کی طرف بڑھی۔ پھر سارے جسم پر۔ کچھ تھوک نگل کر بابو نے کہا —— "اچھا یہ" اور اس کے ہاتھ پر اکنی پھینک دی۔

وہ پیسے والے کھیلوں کے دو چھوٹے ڈونے خرید کر رانی گھر لوٹی اس وقت لڑکا جاگ کر رو رہا تھا۔ رانی ایک ڈونا لائی اور ایک لٹیا بھر کر بچے کے سامنے رکھ دی۔

اور دوسرا ڈونا رکھ کر رانی پھر سوچنے لگی۔

"امیدی ...... دکھن کا کارخانہ .... بچہ ....
شوہر .... فاقہ۔ دھرم ...... ادھرم ...... بھات نہیں ہے۔ مانڈ[1] بھی نہیں ہے۔ گاؤں کے کھیت میں کتنی پیداوار ہوتی ہے۔ گاؤں کے مندر میں کتنا دھرم ہوتا ہے ...... گاؤں میں دھرم ہے گاؤں میں بھات بھی ضرور ہی ہوگا ......"

شام کو بیسو لوٹا۔ سوکھا سا منہ لئے فرش پر ہی چت لیٹ گیا۔ اُسے کام نہیں ملا تھا۔

کچھ دیر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ذرا دیر بعد کھیلوں کا ڈونا اور پانی کا لوٹا بیسو کے سامنے رکھ کر رانی بولی "اٹھو! ذرا پانی پی لو!"

کھیلیں؟ کھیلیں خریدنے کو پیسہ کہاں سے ملا؟ شبہ سے بیسو چینچل ہو اُٹھا، چڑیل لکڑی کے صندوق کی معمولی پونجی تو کہیں ختم نہیں کر رہی ہے! کھیلوں کا قصہ رانی سناتی ہے تو بھی یقین نہیں آتا۔ مگر ٹٹول کر تالی دیکھی، ٹھیک ہے ہاتھ بڑھا کر صندوق کا تالا چھو کر دیکھا۔ —— ٹھیک ہے۔ عجیب ہے، اُٹھ کر کھیلیں چباتا ہے من کچھ بیٹھا جا رہا ہے —— "تو نہیں کھائے گی؟"

"میں کھا چکی ——" یہ کہہ کر رانی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے بولی —— "سنو ہم لوگ گاؤں لوٹ چلیں"۔

—— "گاؤں؟ سنا ہے وہاں بھی تو بھات کا کال ہے جانے کون اُس دن کہہ رہا تھا۔"

"—— ہوگا۔ پر یہاں کی طرح روپے سیر چاول کبھی نہیں ہوگا۔ ہماری زمین میں دو آڑھ من دھان، نہ ہوا ہو پر سنا ہے اور لوگوں کے یہاں اچھی فصل ہوئی ہے۔ گھر گھر محنت کر کے کیا دو مٹھی بھات نہیں ملے گا؟"

"—— وہ تو ٹھیک ہے پان مات جینے سے کرشن کی بھی کوئی خبر نہیں ملی۔ آمن کی فصل کیسی ہوئی؟ مہاجن کے ساتھ کیا ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔"

"—— دیور تو لکھنا پڑھنا جانتے نہیں کہ چٹھی لکھتے۔ سب ٹھیک ہوگا۔ کچھ گڑبڑ ہوتی تو ضرور خبر ملتی۔ بدشگونی کی خبر ہوا سے تیز چلتی ہے"۔

بیسو ہچکچاتے ہوئے بولا "اس سے تو یہی اچھا ہے کہ کلکتے جا کر کام تلاش کیا جائے سنا ہے وہاں کنٹرول کی دکان پر چھ آنے سیر چاول ملتا ہے۔ اور تھوڑی بھیک بھی تو مل سکتی ہے ——"

"—— چل ہٹ ہم کیا بھکاری ہیں اور پھر کلکتے میں چاول کے کنٹرول کی بات نہ کہو —— رام پریت کی لڑکا ایک دن گئی تھی ساری رات اور سارا دن بیٹھے رہنے پر بھی (اگر تقدیر اچھی ہو) تو ایک آدھ سیر چاول ملتا ہے اور اسی کے لئے بیٹھے رہ گئے تو کام کب ڈھونڈو گے؟ کہاں رہیں گے؟ اس ذرا سی پونجی سے کتنے دن چلے گا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے ——" کچھ سوچ کر بیسو پھر بولا ——

"ہاں تو یہ اسوج ختم ہو رہا ہے، اگہن تک کسی طرح قریب ڈیڑھ مہینہ کاٹ سکیں تو اس کے بعد ہماری ہی زمین میں دھان ہو جائے گا۔ تب کیا مہاجن ان تھوڑے سے دنوں کے لئے دھان ادھار نہ دے دیگا؟"

"—— ہاں نہ ہو تو کچھ کام ہی دے گا آدھ پیٹ ہی رہ جائیں گے۔ جیسے رہتے ہیں اس سے تو کہیں اچھا ہوگا"۔

بیسو من ہی من میں حساب لگاتا ہے لکڑی کے صندوق میں رکھی ہوئی تھیلی میں مصیبت سے جمع کئے ہوئے نو روپے ساڑھے چھ آنے ہیں۔ دو ٹکٹوں کا دام بارہ بارہ آنے کے حساب سے ڈیڑھ روپیہ ہوگا۔ ارے نہیں بہو کا ٹکٹ خریدے بغیر ہی کام چل سکتا ہے۔ زنانہ ڈبے میں بٹھانے سے کام چل جائے گا۔

"—— اچھا چلو چلیں یہ گھر تو کل ویسے ہی چھوڑنا پڑے گا"۔

جب وہ گاڑی سے اُترے تو گیارہ کا عمل ہوگا۔

---

[1] پیچھ۔

سٹیشن سے آگے سات کوس کا راستہ تھا۔ بیچ میں چار پانچ گاؤں تھے، اور پیران کا گاؤں باجی پور تھا۔

بیسو جوان ہے، مرد ہے، تیزی سے بڑھا چلا جاتا ہے لیکن رانی بچے کو گود میں لے کر نہیں چل سکتی۔ بچھڑ جاتی ہے بیسو دور سے غرّاتا ہے — "کیوں ری! چلا نہیں جاتا؟"

رانی جواب دیتی ہے — "بچہ گود میں لے کر جلدی چلا جاتا ہے کیا۔ دھیرے دھیرے چلو —"

"اس بچے کو لے کر ہی سستی ہوتا" یہ کہہ کر بیسو اور آگے بڑھ جاتا ہے ہانپتے ہانپتے رانی کسی طرح چلی جا رہی ہے۔ سورج ٹھیک سر پر تھا۔ اسورج کی تیز گرمی آسمان صاف۔ دھوپ سیدھے آکر جیسے جکڑنے لگتی سارے بدن سے چنگاریاں سی چھوٹنے لگتیں۔ خشک راستہ اور دنیا بھر کی دھول — پیاس سے گلا سوکھ رہا تھا۔

سٹیشن سے نکل کر وہ اکیلے ہی چل پڑے تھے۔ کبھی کبھی دوسری طرف سے لوگ آتے دکھائی دیتے۔ پر مرد کوئی نہیں — عورتیں ہی عورتیں —، کسی کی گود میں بچہ ہوتا اور کوئی بچوں کا ہاتھ پکڑے گھسیٹتے گھسیٹتے، پاس سے نکل جاتی۔ اکیلی کوئی نہیں۔ دو دو تین تین کی ٹولی میں —

وہ لوگ ڈھیلے پیروں سے چلتے۔ جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہ ہو۔ یا جیسے کہیں بہت دور جانا ہو۔ دیکھنے سے یہی نظر آتا تھا۔ جیسے بہت تھک گئے ہوں۔ اگر وہ ذرا رک کر سوچتے تو سمجھ سکتے کہ ان کی یہ تھکن بہت دنوں کی ہے۔ جو دور چلنے سے نہیں، بلکہ فاقے کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ گھسٹتے آتے ہیں، پر رکتے نہیں۔ جیسے رکتے ہی آگے نہ چل سکیں گے۔

بیسو تھوڑا آگے ہے اور رانی ذرا پیچھے، کچھ دیر بعد صرف دو عورتوں کو تنہا آتے دیکھ کر بیسو نے ذرا رک کر پوچھا — "بوا کہاں جاؤ گی؟"

کسی قدر بے تاب سی ہو کر دونوں عورتیں پہلے رکیں اور پھر بولیں — "کلکتہ جائیں گے، کلکتہ۔!"

بیسو نے کہا — "کلکتہ؟ معلوم ہوتا ہے وہاں تمہارے کوئی سمبندھی ہیں۔"

بیسو کی پھٹے حال صورت اور روکھے چہرے نے ان عورتوں کی بھیک مانگنے کی امید توڑ دی۔ مایوس ہو کر پاؤں بڑھاتے ہوئے بولیں "نہیں! کلکتہ میں کھچڑی کا لنگر کھلا ہے نا، وہیں جا رہے ہیں۔"

بیسو کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ آگے بڑھ گئیں۔

رانی نے دھان کے کھیت دیکھے تھے۔ راستے میں کتنے ہی سن کے پودے تھے۔ جن کے سروں پر سفید سفید پھول تھے۔ ان کے بعد ہی کھیت تھے۔ ایک کے بعد دوسرا کھیت، یہاں سے آسمان تک اس بھاگا دوڑی میں سب گھل مل گئے تھے۔

"آمن فصل کا دھان ہے۔ چارہ کتنا اونچا ہو گا؟ گھٹنوں تک، نا، کمر — اونچا ہو گا۔ دو ایک پودوں میں دھان کی بالیاں بھی نکل آئی ہیں پھر بھی ہری ہیں۔ کھانے لگیں تو ختم نہ ہو۔"

اتنا دھان، باپ رے باپ! کتنا کتنا چاول ہوتا ہو گا سن کے بعد دن، مہینے کے بعد مہینا۔ کھاتے ہی رہیں پھر بھی ختم نہ ہو۔ اوہ کیسی بھوک لگی ہے۔ پرسوں رات سے تو پیٹ میں کچھ گیا ہی نہیں، اس پر یہاں لڑکے کو پکڑے پکڑے بایاں ہاتھ سن ہو گیا ہے، کیا دھوپ کی تیزی آج کم نہ ہو گی؟ اگر ذرا سا پانی مل جاتا۔ تو ہاتھ ہی سیدھا کر لیتے۔

اچانک بیسو کا دھیان ٹوٹا۔ پوچھا — "ارے ہاں، لنگر کیا ہوتا ہے۔ معلوم ہے؟"

"— کھچڑی کا لنگر نا؟ لنگر، ناؤ کا لنگر تو نہیں۔"

بیسو سوچتے سوچتے کہتا ہے "اری ہٹ! وہ ہوتا۔ تب تو سمجھ ہی جاتا۔ موت پڑے۔ اچھا اب پیر بڑھائے چل!"

— "ذرا سا پانی نہیں مل سکتا؟ بڑی پیاس لگی ہے"

— "مر گئی! عورتوں کے ساتھ راستہ چلنا حرام ہے۔ ذرا سا چلیں اور پانی۔ اس کے بعد کہے گی بھات چاہیے۔ سونے کے لئے بچھونا چاہیئے۔ واہ رے شوق، چل چل سیدھے گھر پہنچ کر پانی پینا"

تھوڑی تھوڑی دور پر گلا سوکھنے لگتا۔ بار بار ٹال نہ سکنے پر بیسو بولا — "اچھا اس سامنے کے گاؤں سے ہو کر چلیں۔ وہاں پانی ملے گا!"

تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ پورا گاؤں دکھائی نہ دیتا تھا۔ نیچے اترنے پر کھیت کے بائیں طرف بانسوں کے جھرمٹ کے

پاس تھوڑے سے گھر دکھائی پڑے۔

—— اور بھی نزدیک، ایک احاطہ کے بیچ میں تین چار جھونپڑے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بانس باندھ کر الگ کئے گئے ہوں۔ اس وقت صرف دو چار بلیاں کھڑی رہ گئی تھیں۔

احاطہ کے سامنے بانس کے پیڑ کے نیچے آکر بیسو بولا "تو ذرا یہاں ٹھہر، میں پکار کر دیکھوں"

کھو کا کو زمین پر اُتار کر رانی ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی، بیسو نے بڑھ کر آواز دی —— "کوئی ہے ...... ذرا سنو!"

کوئی جواب نہ ملا شاید سو رہے ہوں یہ سوچ کر بیسو کھانستا کھانستا پہلے جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ کر بیٹھ گیا

ڈیوڑھی سے کوٹھڑی اور آنگن وغیرہ گھر کی سب چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بہت دنوں سے اس گھر میں کوئی آدمی نہیں رہتا۔ دروازے کے ٹھیک اوپر چھپر میں چھید ہو رہا تھا۔ چھید میں سے برسات کے پانی نے ٹپک ٹپک کر ایک گڑھا سا بنا دیا تھا، کئی دنوں سے پانی تو نہ برسا تھا۔ لیکن یہ گڑھا پانی سے بھرا ہوا تھا چھید میں سے دھوپ کی ایک کرن پانی پر تھرک رہی تھی۔ بیسو نے غور سے دیکھا کہ مکان خالی ہے۔ فرش پر دھول کی موٹی تہ جمی ہوئی ہے۔ ایک طرف گھڑا اُلٹا پڑا ہے۔

"اس گھر میں آدمی نہیں رہتے"۔ بڑبڑا کر بیسو نے پڑوس کے جھونپڑے پر جا کر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پہلے جھونپڑے کی طرح یہ بھی اُجاڑ پڑا تھا۔

بیسو اور آگے بڑھا، ڈھلتی دوپہر کی دھوپ میں سارا احاطہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں، عجب گھٹا گھٹا سا ماحول ہے۔

بیسو کا دل دھڑکنے لگا "کیا بات ہے؟ اس گاؤں کے سب لوگ مر گئے کیا؟" وہ ذرا اور آگے بڑھا۔ تو اُسے ایک اور گھر نظر پڑا۔ دوسرے گھروں سے بہت بڑا، ڈیوڑھی پر گھر کے دو دروازے ہیں، چھت بھی پھوس کی نہیں، خالی کنستروں کے ٹین جوڑ جوڑ کر تیار کی گئی ہے۔ وہاں آدمی ضرور ہے، بیسو آگے بڑھ گیا۔

ٹین میں زنگ لگ گیا تھا۔ اُس پر ہاتھی مارکہ نشان نظر آ رہا تھا۔ ڈیوڑھی کی چھت میں ایک جگہ ٹین کی کمی کو پھوس سے پورا کیا گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے آکر بیسو سوچنے لگا کہ یہاں ٹھیرے یا نہ؟ وہ ایک بار زور سے کھانسا۔ گھر کے دروازے میں سے کوئی پھرتی سے نکل بھاگا۔ کتا ہے کیا؟ نہیں گیدڑ ہے!

بیسو ذرا سہم گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے ڈیوڑھی پر چڑھ کر اندر جھانکا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اندر بانس کی کھاٹ کے اوپر میلی گدڑی میں ایک آدمی پڑا تھا۔

کیسی بدبو آئی تھی بھک سے۔ ناک پھٹنے لگی۔ سر نکال کر سانس بند کرتے ہوئے بیسو نے پھر دیکھا۔

"مر گیا ہے، مر گیا ہے ...... زندہ آدمی نہیں۔ لاش —— منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ایک پیر کھاٹ سے نیچے جھول رہا ہے۔ جیسے کسی نے چبا ڈالا ہو ....

زور کی ہوا سے دُور کوئی دروازہ یا کھڑکی کھٹ سے بند ہوئی۔ ہوا کے تھپیڑے سے بانس کا پیڑ کڑ کڑانے لگا۔

بیسو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رام رام۔ ہائے رام، اُلٹے پاؤں بھاگا۔

"—— چل چل اُٹھ جلدی چل!"

"—— کتنا وقت ہو گیا۔ پانی کیا ہوا جی؟"

"—— چل چل بھاگ! اس گاؤں میں موت کا راج ہے آدم ذات نظر نہیں آتے رام! رام! رام!! اُٹھ چٹ پٹ چل! اب گھر پہنچ کر ہی پی لینا ——

—— اور دونوں پھر چلنے لگے۔

(۲)

باجی پور پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔ بھوک پیاس سے وہ کہیں نہ ٹکے۔ گاؤں میں گھس کر اور کسی کی تلاش نہ کی۔

گاؤں کے سرے پر ہی گھر تھا سیدھے چلے آئے۔

شام کا وقت ہے پر کہیں سنکھ نہیں بجتا۔

کرشن کرشن پکارتے ہوئے، بیسُو جھونپڑے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ باپ رے! چبوترے کا کیا حال ہے۔ اِدھر اُدھر گھاس ہی گھاس۔ پودے! ڈیوڑھی میں بھی دُوب اُگ رہی ہے

رانی بولی —— "ہائے میرے بھاگیہ! سہجن کے دونوں پیڑ اس طرح کس نے سونت لیے؟ ایک پتا بھی نہیں!"

کرشن کا کوئی پتہ نہیں بیسُو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جیسے سب گاؤں خالی ہو گیا ہو۔ آدمی نہیں لاشیں۔ ڈیوڑھی پر رُک کر وہ رانی کا انتظار کرنے لگا۔ اکیلے اندر جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ اندر اندھیرا تھا، دیا سلائی جلا کر اچھی طرح دیکھا یکایک روشنی دیکھ کر ایک چمگادڑ خوف سے اُڑ گئی —— گھر کے اندر وہی پہلے کا سا حال جو پچھلے گاؤں میں دیکھ آئے تھے۔ دھول، کوڑا، اور ٹوٹے پھوٹے برتن —آدمی کا نام نہیں۔

رانی بولی "کیوں جی دیور ابھی تک گھر نہیں آئے؟۔ لیکن گھر کی یہ حالت کس نے کی؟ کچھ بھی نہیں یہاں —— جیسے کوئی رہتا ہی نہ ہو۔"

ڈرا ہوا سا بیسُو بولا۔ "موت چھا رہی ہے رے —— یہاں بھی موت .... گاؤں بالکل خالی ہو گیا۔ اس طرح کی غریب بستی میں ڈھونڈنے سے دو ایک آدمی ہی مل جاتے۔ ابھی موت نے اُن کو چُنا نہیں تھا۔ یا شاید ان کے پاس زیادہ پونجی تھی۔"

بہت تلاش کرنے پر موکشدا بوا ملیں، تھوڑا تھوڑا بخار تھا بدن پر ایک چیتھڑا لپٹا ہوا تھا۔

بوا سے سب حال معلوم ہوا۔ کرشن؟ اس نے تو مہینہ ہوا گھر چھوڑ دیا۔ اس بستی کے سبھی لوگ بھاگ گئے۔ موت؟ نہیں ...... ہاں موت ہی تو ہے بھوک —گاؤں میں اور کتنے دن رہ کر لوگ سوکھیں گے۔ بھات کے بدلے گھوئیاں کے پتے سہجن کے پتے! وہ بھی ختم ہو گئے۔ جوان مرد، بیٹا، بچے سبھی تو ایک ایک کر کے کھسک گئے کہاں گئے؟ کسے پتہ؟ شاید شہر میں بھیک مانگتے ہوں، نہیں تو کسی دور دیش میں کسی ڈگر پر پڑے، مر رہے ہوں گے اب سب عورتیں بھی کلکتے جا رہی ہیں وہاں شاید کھچڑی کا لنگر کھلا ہے۔

یہ کیا سچ بات ہے۔ پتہ ہے تمہیں؟"

تمہارا کرشن؟ ہاں اچھی طرح معلوم ہوا۔ ٹھہرو ہاں یاد کرتی ہوں۔ اچھا ہاں —— وہ تو بعد ہی میں گیا۔ جو مہاجن شاہ جی ہیں —— کل آمن فصل اسے لکھ کر کچھ چاول ادھار لیا تھا اسی سے کچھ دن گزارے پر اس سے کتنے دن نکلتے؟ اور پھر شاہ بھی کیسا ہے کہ ایک بار لکھا پڑھی ہو گئی تو اس کے بعد مٹھی بھر بھیک بھی نہ دی آمن فصل تیار ہو گی۔ تو سب اسی کی ہو گی۔ اس نے کچھ نہ دیا۔ سات دن میں کرشن بالکل سُوکھ گیا۔ مگر شاہ کو دَیا نہ آئی۔ سات دن بعد دیکھا کہ کرشن بھی روانہ ہو گیا ہے کون جانے کدھر گیا۔ شاید تمہاری ہی کھوج میں گیا ہو۔

شاہ جی؟ رام رام وہ کیوں جانے لگیں ان کے تو پو بارہ ہیں۔ گھر میں دھان بھرا پڑا ہے۔ اب پولیس تلاشی لینے آئی —— تو سب کچھ سمبندھیوں کے گھروں میں چھپا دیا، دونوں ہاتھوں سے روپے بٹور رہے ہیں۔ میرے پاس سونے کی چوڑی رہ گئی ہے، سہاگ کی نشانی سمجھ کر اسے نہ چھوا تھا۔ پھوٹا بھاگ، کہ یہ چوڑی بھی شاہ جی کو دے کر دھان لے آئی اب اس کے بعد کیا ہو گا؟"

ہاتھ پیر پیٹ میں گھسے جا رہے ہیں بیسُو کا پاؤں تھرتھرانے لگا۔ رانی کھوئی کھوئی یوں دیکھ رہی ہے۔ جیسے گھر بار سب اس پر ڈھے پڑا ہو۔ بچہ رو رہا ہے لیکن اسے اس کا کوئی دھیان نہیں۔

دونوں گھر کی ڈیوڑھی پر بڑی دیر تک چُپ چاپ بیٹھے رہے من میں کتنی ہی باتیں اتھل پتھل کر رہی تھیں پر ان کا انت کہیں نہ تھا — کہیں پہنچتی ہی نہ تھیں صرف چکّر کھا کھا کر پاگل کیے دیتی تھیں۔ من کہتا تھا نہیں، نہیں، نہیں! جیسے کسی کا اکیلا کماؤ بیٹا اچانک مر گیا ہو۔

اندھیرے میں لمبی سانس لے کر بیسُو بولا —— "اچھا تم ٹھہرو، میں ایک بار شاہ جی کے یہاں دھرنا مار کر دیکھتا ہوں، کچھ ڈر نہیں کہیں کچھ ہوتا ہے؟"

رانی کے من میں اچانک ایک ڈر پیدا ہو گیا۔ کیسا ڈر؟ یہ وہ اس وقت ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ سکی۔ لیکن اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اکیلی ہے، بالکل اکیلی! جھٹ منہ سے یہ آواز نکلی —— "ہمیں اکیلے چھوڑ کر مت جاؤ! ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

کھوکا پھر ٹھنٹھنانے لگا۔

بیسُو کے من میں بھی ڈر پیدا ہُوا۔ بالکل رانی کے ڈر کی طرح ۔ جیسے چھاتی پر بڑا بھاری بوجھ ہو اور بغیر ہٹائے سانس لینا بھی مشکل ہو۔ ایکا ایکی چیخ کر بولا ۔ مرچڑیل! تو کہاں جائے گی!! الگ بیٹھ میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں۔"

لیکن رانی کب چھوڑنے والی تھی، اُٹھ کر ساتھ چلنے لگی۔ ......
مہاجن کی بیوی نہ تھی اس لئے اُس کے دل کی بھگتی جاگ اُٹھی تھی۔ وہ "مودرا" کا پاٹھ کر رہا تھا ـــــ "کے[1] تو مارا استری آر کے وا پُتر مارے ای سنسار ہائے بڑو اای وچتر۔"

ان لوگوں کے پکارنے پہ وہ باہر آیا "کون ہے؟ اوہ بیسُو! اس وقت مرتے گاؤں میں کیوں آیا؟ کام چھوٹ گیا ہے؟ ارے گدھے وہیں رہ کر کسی دوسرے کام کا جتن کیا ہوتا۔"

"سُنا ہے ٹاٹے کے کارخانے میں بڑا روزگار ہے وہاں سے کچھ لائے بھی ہو؟ کئی مہینے ہوئے تم نے تھوڑے سے روپے بھیجے تھے۔ اس کے بعد تو ایک پیسہ بھی نہیں دیا اس مہنگائی کے۔ بازار میں ہمیں بھی تو رہنا ہے ...."

پاگل تو نہیں ہے۔ کہتا ہے، چاول دو! کوئی چاول رکھنے کا زمانہ ہے؟ ـــــ پولیس نے آکر گھر گھر سے چھین لیا ہے یا نہیں، دُور دیکھتے ہوئے شاہ جی نے پھر کہا ـــــ تیرے ساتھ اور کون ہے رے؟ اوہ تیری گھروالی ہے، پورے کُنبے کے ساتھ آیا ہے۔ اس بار گاؤں میں کوٹھا بنائے گا یا نہیں؟

اپنی رنگیلی طبیعت پر خوش ہو کر مہاجن نے ایک بار پھر رانی کی طرف دیکھا۔

ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا ـــ روشنی کی دو ایک کرنیں جھروکے سے نکل کر اس اندھیرے پر پڑ رہی تھیں۔ چھوٹے دوپٹے کا گھونگٹ نکالنے سے چھاتی سے کپڑا اُٹھ گیا۔ اس پر کم روشنی اور زیادہ اندھیرے کی وجہ سے چھاتی کا اُبھار اور بھی اونچا اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ خوب بھری ہوئی ہیں۔ فاقے سے گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے لیکن اندھیرا ان گڑھوں کو پُر کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا گال خوب گول مٹول ہیں۔ شاہ، بے صبری سے بولا "اچھا کل آنا تب دیکھیں گے کیا کر سکتے ہیں۔"

دوسرے دن سویرے پھر شاہ جی کے ہاں۔ اب کے بیسُو اکیلا تھا شاہ اکھڑ آدمی تھا "دھان وان تو دے نہ سکیں گے بھائی! آں ہاں! ایک مٹھی بھی نہیں۔ زمین میں آمن دھان ہُوا ہے پر اس میں تمہارا کیا؟ اس کی تو کرشن کے ساتھ لکھا پڑھی ہو گئی ہے نہیں تو کھاتا کیا؟ گھر میں جو کچھ تھا۔ وہ تو پہلے ہی گڑھے میں ڈال چکا تھا۔ اب اس کے بعد پورے دو مہینے کھلایا۔ بازار میں بیچنے سے کتنا روپیہ ملتا۔ وہ لونڈا ایسا نمک حرام ہے جاتے وقت پرنام کر کے بھی نہیں گیا۔ اس کے بعد منت، سماجت، پاؤں پکڑ کر رونا دھونا۔ پر کسی سے کچھ لابھ نہیں۔ کچھ سوچ کر، جیسے محبت سے اسے ممنون کرنے کے لئے شاہ جی بولے ـــــ "دھان تو دے نہ سکوں گا بھائی صاف بات ہے پر تم پرانی آسامی ہو۔ ایک راستہ بتائے دیتا ہوں زمین تو تم اگلے جنم تک بھی نہ چھڑا پاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ زمین کی کُل لکھا پڑھی میرے نام کر دو۔ دس روپے نقد دے دوں گا۔"

ـــــ "روپے لے کر کیا کروں گا؟ کھیتی ہی کا ایک سہارا ہے۔"

ـــــ "ارے تو مرد بچہ ہے جوان! روپے لے کر کلکتے چلے جاؤ۔ بڑا شہر ہے وہاں بہت سے کام ہیں، اخبار میں لکھا ہے۔ کہ وہاں لنگر بھی کھلا ہے بنا پیسے کے کھچڑی کھانے کو دیتے ہیں۔ کچھ پلے نہ رہا۔ تو کھچڑی تو مل ہی جائے گی۔"

بیسُو کی بیوی بچے کے خیال سے ڈانواڈول ہو رہی تھی۔ اسے اُٹھا کر تو کلکتے جایا نہیں جا سکتا۔ کہاں رکھے گی؟ کیا کھلائے گی؟"

شاہ جی اور جوش سے بولے "عورت کی چنتا کیا کرتے ہو۔ زندہ رہنے پر عورتوں کی کمی ہے؟ گاؤں کے سب مرد تو بھاگ گئے اپنی بستی میں ایک بھی مرد بچے کو دیکھا ہے جب انہیں کچھ چنتا نہیں ہوئی تو تمہیں ہی ایسی کیا فکر پڑی ہے؟"

بیسُو کا من بھرا جا رہا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر شاہ جی جھٹ پٹ بولے ـــــ

ـــــ "چل چل اُٹھ! کام جتنی جلدی کیا جائے اتنا ہی شُبھ ہے۔ آج ہی لکھا پڑھی ـــــ رجسٹری کر لی جائے پانچ گاؤں کے اس پار۔

---

[1] کون تمہاری بیوی ہے اور کون تمہارا بیٹا یہ سنسار بڑا عجیب ہے۔

رجسٹری آفیسر کے پاس ’اٹھو، ابھی چلو!‘

دونوں مل کر چل دیئے۔

رات کو بھی بیسُو گھر نہ لوٹا، رانی کو نیند نہ آئی۔ ایک بار باہر آ کر دیکھا۔ کہ بیسُو لوٹا یا نہیں پھر کھوکا کے پاس بیٹھے بیٹھے رتجگے ہی میں رات گذار دی۔ اِدھر کئی دنوں سے کچھ کھایا نہیں۔ ادھر چنتا اور ڈر۔ کیا سچ مچ بیسُو مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا؟

سویرا ہوتے ہوتے وہ شاہ جی کے گھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں آدمی آتے ہیں تو دور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیسُو ہے۔ جھپٹ کر آگے بڑھتی ہے اور پاس آنے پر بھوت معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ جی بولے —— میں کیا کروں، میں نے تو منع کیا تھا۔ کہ عورت اور بچے کو چھوڑ کر کہاں جائے گا؟ پر وہ ابھاگا کچھ سُنتا بھی ہے؟۔ جانے کِدھر چلا گیا؟ کہتا تھا کہ اب گاؤں نہیں لوٹوں گا۔ پھر ذرا رک کر بولے —— ”اس کا سبھاؤ ہی ایسا ہے۔“

اندھیرا —— چاروں طرف اندھیرا، رانی کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اچانک کسی چیز سے زور کے ساتھ ٹکر لگی۔ پورا سر چکرا گیا۔ دونوں پیروں اور جسم کا بوجھ سنبھالا نہ جاتا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں، کہ وہ کب اور کیسے شاہ جی کے گھر سے راستے پر آ پہنچی۔

اندھیرا —— چاروں طرف اندھیرا، کہیں بھی کوئی آس نہیں، کوئی سہارا نہیں۔ موکشدا بوا سن کر بولیں —— میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔ ایک بھی لڑکا گھر میں نہ رہا۔ دیکھ لینا اب بیسُو نہیں لوٹے گا۔ یہ کہتے کہتے بوا نے جھٹ دروازہ لگا دیا۔ رانی وہ دانے چاول کی اُمید پر باہر بیٹھی رہی۔

کوئی آس نہ رہنے پر بھی رانی دوبارہ سارا گاؤں گھوم آئی۔ کہ بیسُو کہیں اِدھر اُدھر نہ بیٹھا ہو؟

دن بیتتا ہے۔ پھر سویرا ہوتا ہے۔ فِکر تو ہے ہی، پر اسے پیٹ کی جوالا بھون رہی ہے۔ فاقہ کرتے کرتے کتنے دن بیت گئے۔ لڑکے کی چھاتی اور پنجر کی ہڈیاں سب باہر کو نکل آئیں۔ اپنے پیٹ میں بھی جانے کیسا درد سا ہے جیسے پیٹ اور پیٹھ ایک ہو گئے ہوں۔ منہ کڑوا کڑوا سا لگتا ہے گیلا گیلا سا۔ برابر رال بہتی رہتی ہے۔

ایک دن شاہ جی کے ہاں مٹھی بھر چاول کے لئے گئی۔ انہوں نے بھگا دیا۔ بولے —— ”خبردار، اس گھر کی طرف نہ آنا۔ یہاں کیا مچھر کی طرح بھنبھنا رہی ہے۔ بیسُو حرامزادہ ذرا سی زمین کے لئے کھرے کھرے اتنے روپے لے گیا۔ پالاگن کے نام پر بھی ایک روپیہ واپس نہ کیا۔ اور اب ان کی رانی جی آئی ہیں، چاول دو! چل ہٹ چڑیل، کہیں اور جا کر مانگ!“

بھیک ہی کے لئے کیا کم گھومی پھری۔ اپنے گاؤں ہی میں نہیں، آس پاس کے دیہات میں بھی —— دروازے دروازے پر ہات پھیلاتی رہی۔ ہائے رام! ہڈیوں کے ڈھیر بچے کو دیکھ کر بھی کسی نے مٹھی بھر بھات نہ دیا۔

چھاتی میں ذرا بھی دودھ نہیں۔ پھر بھی وہ اُنہیں بار بار بچے کے مُنہ میں ٹھونستی جاتی۔ بچّہ چپ نہ رہتا۔ زور سے رونے کی طاقت اب اس میں نہ رہی تھی۔ ہلکے ہلکے روتا تھا۔ چھاتی دانت سے کاٹ لیتا۔ بڑا بھیانک لگتا۔

کچھ دیر چُپ کرانے کے لئے خالی پانی زبردستی پلا دیا تھا۔ خالی پیٹ اسے کیسے پچتا؟ جھٹ سے قے ہو گئی۔

پھر بھی بھیک کے لئے راستے راستے گھومتی ہے۔ اور سوچتی ہے، کہ بیسُو تو چلا گیا۔ . . . . اگر امیدی ہوتا تو کیا وہ بھی ایسی مصیبت میں بھاگ جاتا؟ شائد نہ بھاگتا۔ کہاں گیا؟ دکن کی کس مِل میں؟ اگر معلوم ہوتا —— تو ذرا سے بھات کے لئے سوچنا نہ پڑتا۔

راستے راستے بھیک مانگتی ہے۔ اکثر کچھ نہیں ملتا۔ بیشتر لوگ تو گھوم کر دیکھتے بھی نہیں۔ کہیں ایک آدھ آدمی ایک ادھنی پھینک دیتا ہے۔ بھات کوئی نہیں دیتا۔ ہائے رام! ادھنی سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے تو کوئی ایک مٹھی چاول بھی نہیں دے گا۔

کبھی کبھی دو ایک آدمی جانے کس طرح چاروں طرف دیکھ کر کھسر پھسر کرتے —— ہمارے ساتھ چل، بہت سا بھات ملے گا۔ پر وشواس نہ آتا۔ حوصلہ بھی نہ پڑتا۔

—— تھک ہار کر رانی گھر واپس آ گئی۔ بھوک کی شدت سے روتے روتے لڑکا سو گیا تھا۔ اسے گھر میں سلا کر بے بسی کی حالت میں وہ چوکھٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

آسمان میں کئی رنگ گُھلے ہوئے ہیں۔ لال اور بینگنی، اور نہ جانے

کتنے ملے جلے رنگوں میں دن ڈوب رہا تھا۔ اس کا من بھی تو ڈوب رہا تھا۔

من کہتا۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ کچھ نہیں، کوئی نہیں، آس نہیں بھروسہ نہیں ——— کیسے بچے گا؟

نہیں، نہیں، گاؤں میں بھات نہیں ہے اور دھرم نہیں ہے دھرم کا بندھن تڑوا کر وہ بھی بھاگ گیا۔

بھوک رہ رہ کر پیٹ میں اینٹھن پیدا کرتی۔ اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ڈر لگتا ہے۔ آگے کی بات سوچی نہیں جا سکتی۔ من کانپ اٹھتا۔ ... خلا، سب خالی۔ ٹھیک جیسے پیٹ کا اندرونی حصہ ہو، اسی کا ... ہوا ہے۔

اندھیرا گھنا ہوتا ہے۔ ہر جانب ایک خلش سی تیرنے لگتی ہے مگر کے اندر کھوکھلا رہتا ہے۔ اُٹھ کر دیکھنے کی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ جسم نڈھال، من بے بس، آگ جلتی ہے، پیٹ میں، سر میں، ... ہے، جلتی ہے، اور بجھتی ہے۔ بھرا پیٹ، اور خالی پیٹ، کتنا فرق ہے۔

دھیرے دھیرے شاہ جی آئے ——— "کون ہے جی! بسیو کی بہو ہے نا؟"

رانی کے دل میں کوئی جذبہ بیدار نہ ہوا۔ شاہ جی آئے ہیں۔ اُٹھ کر بیٹھے، آسن دے، گھونگھٹ نکال لے۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ من ہی من میں بے بس ہو کر بڑبڑاتی ہے ——— بھات۔ بچہ کیا کھائے گا؟ کیسے بچے گا؟

شاہ جی نے ڈیوڑھی کے پاس کھڑے کھڑے ہی دکھ ظاہر کیا۔ "——— بسیو سچ مچ بھاگ گیا۔ بچے کا بھی خیال نہیں کیا۔ ابھاگا، بدمعاش!"

رانی سوچتی ہے ——— بھات، تھالی کے اوپر گول ڈھیر کی شکل میں اونچا پروسا ہوا بھات، جھٹ چنتا کو ہٹاتی ہے۔ ننھی سی آشا کی چنگاری اُبھرتی ہے۔

بولی ——— "شاہ جی! بڑی بھوک لگی ہے۔ بچہ بھوک سے کل ہی مر جائے گا۔ کیا ذرا سا چاول نہیں دیں گے۔ آپ کے گھر میں داسی کا کام کروں گی۔ تھوڑا سا چاول دے دو نا شاہ جی!

شاہ جی ——— ہی ہی ہی ہنس کر بولے۔ "چاول کیا اتنا سستا ہے ری! ایسا ہوتا تو گاؤں بھر کی عورتوں کو داسی رکھ لیا جاتا۔"

رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ یکایک ڈیوڑھی سے چکر کھا کر شاہ جی کے پیر پکڑ لیتی ہے۔ پیٹھ بالکل ننگی تھی۔ دائیں طرف چھاتی کا کپڑا ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ اس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں گیا۔ پیروں پر بار بار سر رگڑ کر کہتی ہے ——— "تھوڑا سا چاول دے دو نا شاہ جی!"

عورت کا جسم، گھٹنا ٹیک کر، سر رگڑتے رگڑتے کمان کی طرح لچکی جاتی ہے۔ اندھیرے کے جھٹپٹے میں شاہ جی کا لوبھ اور بھی جاگ اٹھتا ہے۔

"اری! کیا کر رہی ہے ——— کیا کر رہی ہے ——— یہ کہتے کہتے شاہ جی نے اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر منہ اٹھایا۔ اس کے بعد ذرا ملائم آواز میں بولے ——— چھوڑو، چھوڑو، اُٹھ کر بیٹھ۔ اس کی بغل کے نیچے ہاتھ دے کر انہوں نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

رانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنا سر جھکائے ہوئے دھیمی آواز میں شاہ جی بولے ——— "چاول تو دے گی۔ پر اس کا دام بھی دے سکے گی؟ داسی پن سے چاول کا دام نہیں چکتا، سمجھی!"

اس کے بعد اس کے کان کے پاس گھمبیر گھمبیر کے انداز میں بولے ——— چاول چاہیے۔ تو رات کے دس بجے ہمارے گھر آنا۔ اُدھر، پیچھے کی طرف، ہماری بیٹھک کے پچھلے دروازے پر دھیرے سے تھپتھپانا بڑی ہوشیاری سے کسی کو پتہ نہ لگے، سمجھی؟ ——— اور اس کا گال دبا کر شاہ جی جلدی سے نکل جاتے ہیں۔ دور جا کر پھر ایک بار کہتے ہیں۔ ——— سمجھ گئی نا؟

ہاں، رانی سمجھتی ہے۔ سر میں جیسے جگنوؤں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ چمکتے ہیں اور بجھتے ہیں۔ ذرا دیر بعد بچے کو تھپک کر کاٹھ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔

رانی، شاہ جی کے ہاں سے لوٹی۔ تو گہری رات تھی۔ شاہ نے کہا تھا ——— بالکل سویرے ہی چلی جانا۔ گاؤں میں آدمی تو ہیں نہیں۔

کون دیکھے گا؟ —

گھر میں ہلکی ہلکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ بچہ سکڑا ہوا پڑا سو رہا تھا۔ شائد کئی بار چلّایا تھا، کتنا ہی رویا تھا۔ گال پر سے ہو کر آنکھ کا پانی بہا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا داغ ابھی تک نہیں سوکھا تھا۔

رانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے رام اگر کہیں گیدڑ گھس آتا۔ بچے کو سینہ سے چمٹا کر سوکھی سی چھاتی منہ میں ٹھونس دیتی ہے۔ دھیرے دھیرے کہتی جاتی ہے —— میرے دھن —— ! بیٹا، لال ! "

(۳)

چاول جب سونا ہو اور اسی چاول کے بدلے عورت ملے تو ایک سے جی کیونکر بہلے۔

شاہ جی کا شوق بھی تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گیا رانی سے کہہ دیا اب میں چاول نہ دے سکوں گا۔

پھر بھی رانی رات کو جاتی ہے دروازہ تھپتھپاتی ہے اور آخر میں دھکا دے دیتی ہے۔ شاہ جی کوئی جواب نہیں دیتے۔

اور چاول ہی کتنا ملتا! اس کا اور اس کے بچے کا پیٹ ایک وقت بھی بھر نہ پاتا پھر بھی یہی سورگ تھا اس کے لئے سب کچھ کھو سکتی ہے۔

رانی شاہ جی کی تلاش میں رہتی ہے۔ ایک دن راستے میں ہی پکڑ لیا۔

—— " دہائی ہے شاہ جی! تھوڑا چاول دے دو۔ ایک دم مت دھتکارو "

بہت دنوں تک آدھے پیٹ بھوجن سے جسم کی خوبصورتی جاتی رہی تھی۔ شاہ جی نفرت سے من ہی من میں سوچتے ہیں۔ یہ کوڑا کرکٹ مجھے کیسے اچھا لگا تھا۔

چیخ کر سارے گاؤں کو سر پر اٹھاتے ہوئے بولے " دور ہو بھتنی! کہیں کی، تیرے جیسی کمینی کے لئے لوگ چاول لے کر بیٹھے ہیں! نکل ڈائن! نکل جا! نہیں تو پولیس سے پکڑوا دوں گا "

.... اس کے بعد؟ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کہیں ایک رات کے بدلے ایک مٹھی چاول ملا اور پھر سات دن کچھ نہیں۔

اب وہ مریل سی گائے معلوم ہوتی ہے۔ دماغ میں اور کوئی خیال آتا ہی نہیں صرف بھات .... مانڈ ....

کھانے کو کیا ہے؟

اب گھر نہیں، راستے راستے۔ دن میں، رات میں پاگل کتے کی طرح ہر طرف کا چکر لگا آتی ہے۔ کہیں کوئی دو دانے چاول ڈال دیتا ہے۔ کہیں کوئی تھوڑی سی مانڈ۔ مٹھائی کی دکان کے سامنے لیٹے لیٹے مچ مچاتی آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مانگنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

بچہ ہانپتا ہے باپ رے! ذرا سے بچے کے جسم میں اتنی ہڈیاں ہوں گی۔ یہ کون جانتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ کئی دن کا مرا ہوا ہے۔ اور کسی نے قبر سے نکال کر رکھ دیا ہے۔ پر وہ کھانا کھاتا ہے۔ اب کھڑا نہیں رہ سکتا پھر بھی، بیٹھے بیٹھے، لیٹے لیٹے، ہاتھ کے پاس جو کچھ پاتا ہے۔ منہ میں ڈال لیتا ہے۔

ایسے بھوک کے مارے بچّے کو لادے لادے گھومتی ہے، سوچتی ہے ...... کیسی بے شرم جان ہے مرتی بھی نہیں!

...... اس دن سویرے سویرے موکشدا بوا کے دروازے پر وہ دھرنا مار کر بیٹھ گئی " بوا! تھوڑی مانڈ دو۔ ترکاری کے چھلکے دے دو۔ کچھ تو دو۔ کئی دن سے پیٹ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔ "

" —— کچھ نہیں ہے ری! کچھ نہیں، مانڈ تو پچھلے بھات کھانے والے دن بنی تھی وہ تو کب کی ختم ہو گئی "

کسی طرح بھی ٹالے نہ ٹلی۔ تو ایک مٹھی چنے لا کر بچّے کے ہاتھ میں دے دیئے، میّا رے میّا کیسا بچّہ ہے سب کے سب چنے ایک ہی بار مُنہ میں ٹھونس لئے۔

رانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ایک دانہ بھی نہیں دیا۔ بڑا غصہ آیا جھٹ سے لڑکے کو زمین پر پٹک دیا۔ مُنہ میں اُنگلی ڈال کر وہ ایک چنا نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

بچّہ لیٹا رہا مگر رویا نہیں پورا زور لگا کر جبڑے بھینچ لئے بوا بولی —— اس مدھو گرام میں کیوں نہیں جاتی؟ سُنا ہے کہ وہاں تو لنگر کھُلا ہے جہاں بنا پیسے کے ایک وقت کھچڑی ملتی ہے ——

رانی بے تاب ہو کر بولی —— " سچ مچ؟ مدھو گرام کدھر ہے؟ بتاؤ نا ابھی چلی جاؤں! "

" —— بڑی دور ہے پانچ سات گاؤں دور۔ ابھی چلی جاؤ شام

تک وہاں پہنچ ہی جاؤ گی۔"

بوا نے اسے مدھو گرام کا راستہ بتا دیا۔

بچے پر غصہ کم نہ ہوا اس کو پھینک کر ہی چلی جاتی ہے۔ بہت دور جانے پر جانے اُسے کیا ہو جاتا ہے لوٹ کر جھٹکے سے بچے کو گود میں اٹھا لیتی ہے

گھومتی بھٹکتی لوگوں سے پوچھتی ہوئی مدھو گرام کے لنگر خانے میں پہنچی۔ تو تین چار بجے ہوں گے۔ راستے کے لوگ کیسے ہیں۔ کسی نے ایک ٹکا تک بھیک نہ دی۔

لنگر خانے کے سامنے کیسی بھیڑ ہے۔ چاروں طرف سے مر بھکے ٹوٹ پڑے ہیں، آدمی، عورت، بچے، کچے،

پر کسی کو اندر نہیں گھسنے دیا جاتا۔ آج سرکار کے یہاں سے چاول نہیں آیا۔ اس لئے لنگر بند ہے۔

اوہ —— کیسی مصیبت ہے، اتنا راستہ پیدل چل کر خالی لوٹ جانا ہوگا۔ کنگلے کہتے ہیں —— جھوٹ بات ہے، چاول نہیں ہے —— یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں جھانسہ دیتے ہیں۔ اور سب آپس میں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں۔

مگر کوئی سامنے نہیں جاتا۔ وہاں سپاہی پہرہ دیتے ہیں۔ مونچھ والے جوان سپاہی۔ پھولے پھولے چہروں سے تیل ٹپکتا ہے۔ رانی دور کھڑی تاکتی ہے۔ ان کے چہرے دیکھ کر من میں خیال آتا ہے —— دال اور روٹی، پھولی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں، بہت سی روٹیاں، پھولی پھولی روٹی اور دال جتنی طبیعت ہو کھاؤ۔

وہ دھکا دے کر لوگوں کو ہٹا دیتے ہیں۔ عورتوں کو ذرا آہستہ سے کہتے ہیں —— ہٹ جا عورت، بیچ بیچ میں آنکھ بھی مارتے جاتے ہیں۔

...... مایوس ہو کر گھومتے گھومتے پھر چکر، اب کے پیر آگے نہیں چلنا چاہتے۔ اور چلتے رہنے سے حاصل؟ چل کر جائے بھی کہاں؟

کچھ دور جا کر ایک جلے ہوئے گھر کے برآمدے میں لڑکے کو بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی۔ اوہ، پیٹ میں کیسی آگ ہے، سر تک پھنک رہا ہے ایک بار پھر لیٹ گئی۔ پر اس سے جوالا جیسے اور بھی بھڑک اٹھی۔ پھر اُٹھ کر اُکڑوں بیٹھ گئی۔ من میں اور کچھ نہیں آتا بس سوچتی ہے۔ بھات، ...... روٹی ...... دال ...... چنے۔

بچے نے برآمدے میں لیٹے لیٹے ہی ہگ دیا۔ پانی کی طرح پتلا دست، بڑی دور تک پھیل جاتا ہے۔ اس میں چنے ہیں —— سالم کے سالم، جیسے کھائے تھے، بالکل ویسے ہی، دو ایک آدھے ہو گئے ہیں۔ باقی چھلکے سمیت جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔

سالم چنے ...... کھانے کی چیز ...... کہنی کے سہارے اٹھ کر رانی کتنی دیر تک بیٹھی انہیں تاکتی رہی۔ سامنے تالاب میں سے آنچل بھگو کر پانی لے کر، دھیرے دھیرے دھو کر چنے الگ کئے۔ دھیرے دھیرے انہیں پھر دھویا۔ بڑی کوشش سے، جیسے بہت قیمتی چیز ہو۔

اس کے بعد ایک ایک چن کر کھانے لگی۔ ایک ایک کر کے بھی نہیں، کتنی دیر تک اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر منہ میں ڈال کر آہستہ آہستہ گھما پھرا کر چباتی ہے۔ جب تک ایک دانہ بالکل ختم نہیں ہو جاتا۔ تب تک دوسرا نہیں اٹھاتی۔

کھا کر چت لیٹی رہی۔ پیٹ کے اندر آگ تو کم نہیں ہوئی بچے نے پھر ہگ دیا۔ اس بار چنے نہیں تھے۔ صرف پانی اور کچھ چھلکے چت لیٹے لیٹے رانی دیکھتی ہے، پر ہلتی نہیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد پچکاری مار کر پانی ہی پانی —— اب کے بھی رانی اٹھ کر نہ بیٹھی۔ بچے کو دھلایا بھی نہیں۔ بچے کی ہڈیوں کے اوپر صرف چمڑی ہے۔ شام کا اندھیرا جھکتا ہے۔ ٹھنڈک بڑھتی ہے، دماغ میں ایک ہی خیال گھومتا ہے —— روٹی...... دال... ...... چنا۔

راہ چلتے سپاہی نے رک کر پکارا "او عورت! روٹی لیگی"؟

یہاں رہتے رہتے سپاہی نے بنگلا سیکھ لی تھی۔

رانی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی —— "کہاں جی؟ کدھر؟ دو —— دو!"

"—— ارے یہاں نہیں، ہمارے ساتھ آؤ، روٹی ملے گی"

اس دوران میں بچے نے شاید ایک بار پھر دست کیا۔ اسے بنا دھوئے ہی گود میں لٹکائے رانی سپاہی کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

اگھن کی شام تھی۔ خوب جاڑا پڑ رہا تھا۔ سپاہی کے بدن پر گرم اوور کوٹ تھا۔

سپاہی اُسے جھاڑی میں گھسیٹ لے گیا۔ اس کے بعد دونوں

ہاتھوں سے اُسے چھٹایا، بولا ـــــ "روٹی دے گا۔ پیسہ دے گا۔ لیکن بعد میں"۔

رانی نے بچے کو زمین پر لٹا دیا۔ اس کے بعد سپاہی رانی کے ساتھ لیٹ گیا۔ پیٹھ میں ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ جھاڑی کے اوپر آسمان دکھائی دے رہا تھا۔

گرم کوٹ کھول کر الگ پھینکتے ہوئے رانی کو چمٹاتے چمٹاتے سپاہی کو گھِن سی آئی۔ بولا "دور ہو ڈائن! تیرے لڑکے کا منہ دیکھ کر تو سب خوشی کافور ہو جاتی ہے"۔ گھبرا کر رانی نے چت لیٹے لیٹے ہی ٹٹول کر صرف اندازے ہی سے سپاہی کا کوٹ لڑکے کے منہ پر ڈال دیا۔ اوہ کتنا بھاری ہے۔ اٹھایا ہی نہیں جاتا۔

من میں ایک ہی خیال گھومتا ہے ـــ بھات ..... روٹی .... بھات ..... پیسہ، بھیانک دکھائی دے رہا ہے سپاہی کی چھاتی کے نیچے دم اٹکا جا رہا ہے، دانت سے دانت لگے جا رہے ہیں۔ ..... سپاہی کھڑا ہو کر جب پھر کوٹ پہنتا ہے، تو رانی سے گویا اٹھا ہی نہیں جاتا۔ سر چکر کھاتا ہے۔ چھاتی دب گئی ہے۔

کروٹ لے کر کھوکا کے جسم کو ہاتھ لگاتی ہے۔ بالکل ٹھنڈا، برف! گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک دو بار ہلایا۔ کوئی جواب نہیں، آنکھیں الٹ گئی تھیں۔ بیتابی سے اٹھا کر بچے کا جسم گود میں دبا لیتی ہے۔

سامنے کی طرف نظر جاتی ہے۔ ارے! کوٹ پہنے سپاہی تو چلا جا رہا ہے، روٹی تو دی نہیں! پیسہ بھی نہیں! بچے کا جسم زمین پر پھینک کر رانی چلی ـــ سپاہی کے پیچھے پیچھے۔

مکتبہ اُردو لاہور

مسعود زاہدی

اُردو افسانوی رجحانات کا تجزیہ

کہانی کی عمر بہت طویل ہے۔ گو وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کہانی نے ہندوستان میں جنم لیا یا چین میں یا یونان میں۔ البتہ یہ امر مسلمہ ہے کہ دُنیا کے کسی ملک کا ادب اس سرمایہ سے تہی دامن نہیں۔ جو قومیں ترقی کی دوڑ میں شریک ہیں۔ اُن کے رہنے سہنے کے انداز۔ سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ۔ ناچ رنگ کے طریقے۔ پوجا پاٹ کی رسمیں۔ ٹونے ٹوٹکے۔ جادو منتر۔ غرض زندگی کے ہر ہر پہلو کی اساس عجیب وغریب عقیدوں اور قدیم روایتوں پر قائم ہے۔ جو قصے کہانیوں کی شکل میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ اور اُن کے معتقدات کی تشکیل کرتے ہیں۔ پُرانی مذہبی کتابوں کا بیشتر حصّہ، خواہ وہ تخلیقی ہو یا الہامی، کہانیوں۔ قصّوں اور حکایتوں کی شکل میں ڈھلا ہُوا ہے۔ تسلسل حیات کے ساتھ ساتھ کہانیوں کا یہ لامتناہی سلسلہ بھی جاری ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو۔ کوئی رُخ۔ کوئی رنگ خواہ مادّی ہو۔ یا روحانی۔ داخلی ہو یا خارجی۔ تخیلی ہو یا تجرباتی۔ ایسا نہیں جو افسانہ کے آئینہ میں منعکس نہ ہُوا ہو۔ آفرینشِ عالم کی منزل سے لے کر انفعال انسانی کے سرچشموں تک سب کچھ افسانہ کی قلمرو میں شامل ہے۔ جنت دوزخ چاند ستارے۔ جن بھوت۔ پری دیو۔ چرند پرند۔ حیوان انسان۔ راکشس اوتار۔ رشی منی۔ پیر پیمبر۔ ملکہ بادشاہ۔ شہزادہ شہزادی۔ سپاہی زادہ، امیرزادی۔ مسافر بھٹیارن۔ طوائف۔ مولوی۔ میم میڈیا۔ انگریزی بابو۔ ولائیت رفتہ ہندوستانی۔ مس پدما بی۔ اے۔ کنور محمود ایم۔ اے۔ غلامی کا احساس، آزادی کی خواہش۔ وطنیت۔ دہشت انگیزی۔ رجعت پسندی۔ کانگرس۔ لیگ۔ مارکس۔ انجیلز۔ سوشلزم۔ اقتصادیات۔ وفاقِ عالم۔ طبقاتی کشمکش۔ بین الاقوامیت۔ فرائیڈ۔ ایڈلر۔ جنگ۔ جنسی کشمکش۔ عورت و مرد کا درجہ۔ جنسی برتری۔ نفرت۔ محبت۔ شعور۔ لاشعور۔ تحت الشعور ——— کہانیوں کے بوقلموں موضوعات کی یہ عظیم قوس آسمان کو چھوتی ہوئی زمین پر آٹکتی ہے۔ موضوعات کی یہ طول طویل فہرست لایعنی نہیں۔ اگر میں صحیح سمجھ رہا ہوں۔ تو یہی تدریجی تبدیلیاں اور مضامین کا چناؤ، انسانی فکر و نظر اور اُن کے مادّی وروحانی تصورات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ عنوانات ہمارے افسانوی ادب کے ہر ہر موڑ۔ زاویوں اور نظریوں کے تغیر و تبدل کی مربوط کڑیاں ہیں۔ عرش و فرش کے مابین اس دراز زینہ کے مشاہدہ سے یہ حقیقت قطعی واضح ہو جائے گی کہ افسانہ نگار کی نظریں کس طرح اَن دیکھی دنیاؤں۔ غیر مادّی طاقتوں۔ مافوق الفطرت انسانوں۔ بادشاہوں اور شاہزادوں کے کارناموں سے ہٹ کر جوبے ہوئے انسانی برادری۔ اس کی ابتدائی ضرورتوں اور اس کے دل و دماغ پر جم گئی ہیں۔ ارضی وسماوی کا فرق ہی قدیم وجدید۔ نئے اور پُرانے افسانوی ادب کا سنگ بنیاد ہے۔

موجودہ افسانہ کا موضوع براہِ راست یا بالواسطہ انسان ہے۔ گوشت پوست۔ ہاتھ پیر۔ آنکھ ناک والا انسان۔ جس کے کردار میں نیکی بدی۔ عیب و ہُنر۔ کمال و زوال کے تانے بانے کی پیچیدگیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہی انسان جو کہیں حاکم ہے کہیں محکوم۔ کہیں قادر ہے کہیں مجبور۔ کہیں منعم ہے کہیں مفلس۔ لیکن بہ حیثیت انسان، زندگی اور تمام کائنات کا محور ہے۔ اور افسانہ کا مرکز ہے۔ جن بھوت۔ پری آسیب اور مافوق الفطرت طاقتوں سے موجودہ افسانہ کا اُسی حد تک تعلق ہے۔ جس حد تک انسان اُن کے اوصاف کا حامل ہے اور خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ ایک شخص اپنی عمر میں گوناگوں زندگیاں گذارنے کا اہل بھی ہو۔ کم علمی۔ بے بضاعتی۔ بے چارگی اور عناصر فطرت کے دباؤ کے باعث پُرانے وقتوں کی کہانیوں میں جو تخیئلی بے راہ روی اور ذہنی قلابازیاں ناگزیر تھیں اب محال ہیں۔ تجربہ اور تخیل ہی دراصل افسانہ کے تار و پود کا کام دیتے ہیں۔ ان دونوں کے بدل جانے سے افسانہ کے رنگ اور ڈھچر میں تبدیلی قطعی فطری اور ضروری چیز ہے۔ سائنس اور جغرافیہ کی دُنیا میں رہتے ہوئے چاند کی دیوی کا عشق۔ آب حیات کی جستجو۔ امرت منتھن کا سودا۔ پریزادوں کی محبت۔ جن بھوتوں کی سلطنتیں۔ جل پریوں کے محل وغیرہ وغیرہ کی فی زمانہ وہی حیثیت ہے۔ جو "ایک تھا چڑا ایک تھی چڑیا۔ چڑا لایا چاول کا دانہ چڑیا لائی دال کا دانہ۔

دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی ...... " وغیرہ کہانیوں کی ہو سکتی ہے۔
علم و عمل کی راہیں کھل جانے اور عناصر فطرت کی باگ ڈور ہاتھ میں آنے
کے بعد ان ہوائی قلعوں کا گرنا لازمی تھا۔ آج فن کی کسوٹی پر ان میں سے
اکثر پر اشاریت اور تمثیل نگاری کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے
اصل میں انسانی تحیّر اور تجسس ہی اشیائے خارجی کی توجیہہ و تاویل کے
محرک رہے ہیں۔ جب انسان مجبور محض تھا۔ ہر بڑی طاقت کے سامنے
اُس کا سر جھکانا اُس کی کمزوری اور بے چارگی کے پیشِ نظر ضروری تھا۔ وہ
طاقتیں جن کی ماہیت اور اصلیت اُس کی فہم و ادراک سے بالاتر تھی۔
اُس کی نظر میں طرح طرح کے روپ دھارتی تھیں۔ تمام عالم کے ابتدائی
افسانوی ادب پر اسی رنگ کا غلبہ ہے۔ اس کے بعد اجداد پرستی کا دور
دورہ ہوا۔ عرب۔ ایران۔ ہندوستان۔ یونان۔ اسکنڈے نیویا وغیرہ۔
مُلکوں کی کہانیاں بزرگوں کی بہادری اور جوانمردی کے کارناموں سے پُر ہیں۔
ان کہانیوں کا مرکزی خیال خیر و شر کا تصادم ہے۔ یہ افسانے بلاشک
و شبہ اُس زمانہ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ زندگی
کا یہ انداز انسانی ذہن کے ارتقاء کا دوسرا درجہ ہے جہاں پہنچکر اُسے
خیر کا شر پر غالب ہونا اور انسان کی طاقت اور اُس کی برتری کا مبہم
احساس ہونے لگتا ہے۔ اِن افسانوں میں ہمواری اور اعتدال کا وجود
نہیں بلکہ حیرت انگیز اونچ نیچ اور ذہنی اتار چڑھاؤ موجود ہیں بعض
اوقات مافوق الفطرت طاقتوں کا تفوق بغیر تفریق و در بدستور قائم
رہتا ہے اور ارادہ کی کمزوری افکار و اظہار دونوں میں دھیمی رفتار پیدا
کر دیتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں جب قوتِ ارادی اور انسان کا احساس
برتری اُس کے تخیل پر حاوی ہو جاتے ہیں تو بڑی سے بڑی قوتیں اُس
کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ خواص کا مرتبہ بھی اُس کی نظروں
میں زیادہ نہیں جچتا۔ اس طرح معمولی انسان اُس کے کردار بن جاتے ہیں۔
پیشواؤں اور صاحبانِ کشف و کرامات کو چھوڑ کر اُس کی نظریں دوسرے
لوگوں کو منتخب کرنا شروع کر دیتی ہیں یہ جرأتیں بھی کم ہوتی ہیں۔ اور
عوامیت کا یہ عنصر بھی بھولے بھٹکے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مذہبی افسانوں
کی نوعیت کا دارومدار مختلف مذاہب کے اصولوں پر ہے۔ یہاں پر
اس بحث کی گنجائش نہیں۔ مذہبی تلقین و تدریس کے بعد معاشرہ کی
معاملات کا نمبر آتا ہے۔ اس تصویر میں بادشاہ۔ ملکہ۔ شہزادہ۔
شہزادی۔ وغیرہ وغیرہ پیش منظر میں ہیں اور رعیت پس منظر میں۔
زندگی کا شروع اور اخیر انہیں گنی چُنی ہستیوں پر ہوتا ہے۔ انہیں کے
غم و غصّہ۔ رنج و راحت۔ رحم و انصاف۔ بزدلی اور بہادری کے
بیانات تک معاشرہ کی تصویر کشی محدود رہتی ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ
ہے۔ جب زندگی کا تخیل ہی اس قدر محدود ہو جائے تو افسانہ میں پھیلاؤ
کی توقع بیکار ہے۔ مگر ہوتے ہوتے تصویر کا رُخ بدلنے لگا۔ اور پس منظر
کے دھندلے نقوش بھی نمایاں ہونے لگے۔ امراء۔ رؤسا۔ سپاہی
اپنی اپنی جگہ دکھائی دینے لگے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا افسانہ میں وسعتیں
پیدا ہوتی گئیں۔ امیر غریب۔ مرد عورت۔ چھوٹا بڑا سب کے سب اس
میں اپنا جلوہ دکھانے لگے۔ آہستہ آہستہ، افسانہ کا بنیادی خیال بھی بدلنے
لگا۔ اور جہاں راجہ رانی نظر میں سماتے تھے وہاں چوبدار نفر اسپاہی
زادہ۔ سوداگر۔ مسافر۔ درزی۔ بھٹیارن۔ فقیر۔ جوگن افسانہ نگار کا مرکز
خیال بننے لگے۔

افسانہ کی لمبائی پر موضوع کا ہمیشہ گہرا اثر رہا ہے۔ بالعموم جو افسانے
براہِ راست تلقین و تدریس کا ذریعہ بنائے گئے مختصر ہیں۔ انجیل کی کہانیاں
اور قرآنی قصّے اکثر جدید مختصر افسانہ نویسی کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔
گلستاں کی حکایتیں اختصار۔ تاثر۔ اور وحدتِ خیال کی کلیتہً حامل
ہیں۔ اس کے برعکس وہ افسانے جن میں بزرگوں کی جوانمردی اور شجاعت
کی تعریف و توصیف مقصود ہے۔ نسبتاً طویل ہیں۔ یونانِ قدیم اسکنڈے
نیویا۔ جرمنی۔ عرب اور ہند کی کہانیوں سے یہ حقیقت صاف مترشح
ہے۔ تیسری قسم اُن افسانوں کی ہے جن کا مقصد محض تفریح اور تفنن
طبع ہے۔ اِن کی پرورش درباروں اور امراء کی سرپرستی میں ہوئی۔ یہ
افسانے طویل پُر تصنع۔ رنگیلے اور دلکش ہیں۔ اُن کی دلچسپی ہی وہ شے
ہے جو آج تک اُن کی طوالت اور تصنع کو کم پڑھے لکھے لوگوں پر بار
نہیں ہونے دیتی۔ زندگی کی حرکت اور اس کے احساس نے اس
نوع کے ادب پر مشرق و مغرب میں مختلف اثرات ڈالے۔ تاریخ ادب
کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔ کہ مغربی ممالک میں جہاں لوگوں کی نظریں ماضی
سے زیادہ حال اور مستقبل پر لگی ہوئی ہیں، اس قسم کے ادب کو وہ

فروغ حاصل نہیں ہوا جو ماضی پرست مشرق میں۔ ہندو مسلمانوں کے باہمی تنازعات اور مقابلہ بازی نے اُس طومار کے حجم میں مزید اضافہ کیا بالخصوص جب مسلمانوں کا سیاسی دبدبہ مٹنے لگا اور مالی انحطاط شروع ہوگیا۔ تو اُن کے تنزل پذیر اذہان نے روایتی تفوق میں ہی پناہ لی۔ نتیجتہً ایک مدت مدید تک موضوع اور ضخامت میں کوئی نمایاں تبدیلیاں پیدا نہ ہوسکیں ان طول طویل داستانوں کی ابتدا عربی اور فارسی میں ہوئی۔ جو ترجموں کے بعد طبعزاد صورتوں میں جاری رہی۔ ماضی پرستی اور اجداد پرستی کا عرصہ تک یہ عالم رہا کہ اُردو کے ابتدائی ناولوں میں بھی وہی عنصر غلبہ پانے لگا۔ شرر۔ سرشار۔ محمد علی۔ حتیٰ کہ پریم چند اور سدرشن کے ناولوں میں بھی یہی ذہنیت کارفرما ہے۔

انگریزی راج قائم ہوا تو شروع شروع میں تو فارسی زبان کی تبلیغ و اشاعت کا دور دورہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کی کمان اُترنی شروع ہوگئی۔ اور اس کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ اُردو ناول کی ابتدا انگریزی تعلیم اور انگریزی ادب کی رہین منت ہے۔ نذیر احمد۔ شرر۔ سرشار۔ محمد علی کے ناولوں میں انگریزی ادب کے عمیق مطالعہ اور اُس کے گہرے اثر کا عکس موجود ہے۔ یہاں پر یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ اُردو ادب کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا ترقی پسند ادیب اور افسانہ نگار رتن ناتھ سرشار تھا۔ جس کا ادبی عروج انگریزی تراجم سے شروع ہوا۔ سرشار کی تصانیف سے نہ صرف اُس کے تبحرّ علمی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اُس کی تحریریں نفسیات کے گہرے مطالعہ اور معاشرہ کی بہترین تصویر کشی کے علاوہ اخلاقی قدروں کے بے مثل تجزیہ کی اعلیٰ ترین مثالیں پیش کرتی ہیں۔ اُس زمانہ کی تصانیف کو موجودہ تنقید کے معیار پر پرکھنا درست نہیں۔ کیونکہ ادب صرف دماغی پیداوار نہیں بلکہ ماحول اور وقت کی رفتار کا ادیب اور ادب دونوں پر بھرپور اثر رہتا ہے۔ اس کے باوجود اس دور کے مصنفین میں ہمیں صرف سرشار کی تصانیف میں اس دور کی طبقاتی کشمکش۔ نوابی زندگی کی انحطاط پذیر عکاسی۔ انگریزی طریق بود ماند کا رواج حکومت کی چیرہ دستیاں۔ ریاستی ماحول میں عشق کی کارفرمائیاں۔ نچلے طبقوں کی پست ذہنیت اور اُن کا احساس کمتری۔ صوبجاتی تعصبات کا ٹکراؤ۔ بایں ہمہ تنقید۔ طنز اور تمسخر سے یکسر مملو ہیں۔ سروینٹیز Cervantes کے ناول ڈون کوئیڈوٹ Don Quixote کا ترجمہ غور کیجئے تو بے مقصد نہ تھا۔ خدائی فوجدار کا مصنف روایتی تصورات کا پہلا ناقد اور رسم و رواج کی پابندیوں کے خلاف پہلا باغی تھا۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں۔ کہ سرشار نے نذیر احمد کی طرح اصلاحی اقدامات سے ابتدا نہیں کی۔

انگریزی زبان ایک طرح سے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں کلید کی حیثیت سے آئی۔ اُس کے توسل سے نہ صرف مغربی ادب سے شناسائی ہوئی بلکہ روسی۔ مصری۔ ترکی۔ فرانسیسی۔ یونانی اور جرمنی ادب کے دروازے بھی ہندوستانی طالب علموں کے لئے وا ہو گئے۔ اُس وسیع مطالعہ کی بنا پر افسانوں کے تراجم کا ایک اٹوٹ سلسلہ قائم ہوگیا۔ اور متنوع افسانوں کا اُردو میں ہر زبان سے ذخیرہ آنے لگا۔ اس تحریک سے جہاں بے شمار فائدے ہوئے وہاں ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ اکثر افسانہ نگار ترجموں کی رو اور مطالعہ کی کثرت کے سبب اپنا منفرد رنگ کھو بیٹھے۔ افسانہ کے ڈھچر۔ تیکنیک اور اُٹھان تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جب اُردو افسانوں میں یونانی۔ مصری۔ ترکی اور انگریزی زندگی کی تصویریں اُتاری جانے لگیں۔ تو یہ ہنر ایک عیب اور مستقل مضرت نظر آنے لگا۔ تراجم اور طبعزاد افسانوں میں تفریق اس قدر محال ہوگئی کہ مشہور مصنفوں کو اس قسم کی عبارتیں لکھنا پڑیں "یہ افسانے میرے ہی بتکدۂ خیال کے اصنام ہیں" اس دور کے افسانوں میں ایک ہی رنگ کا غلبہ تھا۔ رومان۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ طول طویل دلچسپ داستانوں کا خوگر ہونے کے بعد اگر افسانوں میں کوئی شے جاذب نظر بن سکتی تھی تو رومانیت۔ علاوہ ازیں گو ہندوستانیوں کی سیاسی اور معاشرتی حالت تو ضرور دگرگوں تھی لیکن دوسرے ممالک مقابلتہً عیش و نشاط میں زندگیاں گذار رہے تھے۔ اور اُس زمانہ میں خود مغربی ادب میں حقیقت نگاری کا عنصر کم تھا۔

مشینوں کی ایجاد اور عام تعلیم نے جب ادب کو معدودے چند کی میراث سے نکال کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچا دیا تو اُس کے مزاج میں اہم تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ لوگوں کی بڑھتی ہوئی مصروفیت۔ رفتار زندگی کی تیزی اور رئیسانہ عدم سرپرستی نے کئی کئی جلدوں کے ناولوں کو اُن کی ضخامتوں سے محروم کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ ناول کی جگہ ناولٹ اور ناولٹ کی جگہ طویل مختصر افسانے اور طویل مختصر افسانوں کی جگہ مختصر

افسانوں نے پیر جمانے شروع کر دیئے۔ ہندوستان میں یہ تبدیلیاں اس قدر جلد محال تھیں۔ جس قدر جلد وہ مغربی ملکوں میں رونما ہوئیں۔ یہاں زندگی کی رفتار ہمیشہ کی طرح سست تھی۔ وہ تمام تعلیمی۔ معاشیاتی۔ معاشرتی۔ ملکی۔ ملی۔ مذہبی۔ نفسیاتی۔ طبقاتی قوتیں یہاں یا تو معدوم یا مریض حالت میں تھیں۔ جو اُن ممالک کی نبضِ حیات میں تیزی اور اضطراب پیدا کر رہی تھیں۔ اور جو تمام سماجی نظام کو منقلب کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ انیسویں صدی کے افسانوی ادب پر مارکس اور انجیلز کے اقتصادی نظریات کا زبردست اثر پڑ رہا تھا۔ اور انسان کی توجہ کا مرکز مادہ قرار دیا جانے لگا تھا۔ دنیا کو مثبت اور منفی طاقتوں کا تصادم تصور کرتے ہوئے انسانی فعل و حرکت پر غور کیا جا رہا تھا۔ طبقاتی کشمکش اور محنت کش، گروہ کی مشکلیں اور حکومت کے مسائل ادیب کا مرکز خیال بنے ہوئے تھے۔

دوسری طرف فرائڈ اور دیگر ماہرین نفسیات کے انکشافات نے حیات و ادب کی تسلیم شدہ قدروں کو متزلزل کر دیا تھا۔ فرائڈ۔ ایڈلر۔ جنگ۔ برنارڈ وغیرہ نے عورت، جنس۔ حیا۔ عفت۔ عذاب ثواب۔ نیکی بدی کی پرانی قدروں کو جھٹلا دیا تھا۔ اور ابسن وغیرہ نے قدیم تصوراتی عورت کو صرف ایک گڑیا کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح سائنس۔ ڈاکٹری۔ علم العضویات نے جنسیاتی معاملات کی ادب میں صورت بدل دی تھی۔ اس تغیر کا اثر ہندوستانی افسانوی ادب پر بہت دیر میں نمایاں ہوا۔ اوّل تو منشی پریم چند اور سدرشن وغیرہ کے سامنے اور بہت سی مقامی اور ملکی اُلجھنیں تھیں جن کا ذکر اور جن کا حل پیش کرنا اشد ضروری تھا۔ دوسرے سرمایہ داری کا تخیل جو مغربی مفکرین کی فہم و نظر میں تھا اور جس کے خلاف انہوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ وہ یہاں سے قطعی مختلف تھا۔ مشینی دور کے شباب پر پہنچنے سے پہلے ہی یہاں سرمایہ داری اور اونچ نیچ کا معاملہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ پریم چند وغیرہ مارکسی نظریوں سے صرف شُدھ بُدھ رکھتے تھے۔ اُن پر مکمل عبور نہ تھا۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں وہی راجپوتی شان و شوکت کے اذکار ہیں۔ اور ترقی پسند اصلاحی افسانوں میں سودخور۔ برہمن۔ کسان جلوہ گر ہیں۔ دراصل اُن کے سامنے معمولی اور انفرادی مشکلیں اور اُن کے حل تھے۔ طبقاتی احساس اُس وقت اتنا گہرا نہیں تھا۔ چنانچہ اُن کے بیشتر اصلاحی افسانے قرض۔ سود خوری۔ بے ایمانی۔ تعلیم کی کمی۔ کسان کی عزت۔ نیکی کا اجر۔ خاندانی محبت وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اسی دور میں ایک دوسرا گروہ متشککین کا تھا جو ہر پُرانی قدر کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کے بعد اُس کی عظمت اور سچائی مان سکتا تھا۔ جنت، دوزخ۔ مادہ، مافیہا۔ جسم و رُوح کے پُرانے تصورات کو وہ بعینہٖ تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔ اس گروہ سب سے بڑے نمائندے نیاز فتحپوری تھے جن کے مضمونوں اور افسانوں میں وہی تشکیک کا عنصر غالب تھا۔ وہ آفرینش عالم کے رسمیاتی تصور۔ فردوس کے تخیل۔ دوزخ کے عقیدے۔ روح و جسم کے مذہبی نظریے۔ غرضیکہ ہر اُس تسلیم شدہ کلیہ کو جو عقل کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ زندگی کی رہبری ایک لچکیلی منطق سے کرنا چاہتے تھے۔ لچکیلی منطق میں نے اس لئے کہا کہ ایک طرف تو یہی منطق اُنہیں باغیانہ باناپہنائے تھی اور دوسری طرف اُنہیں کچھ رومانی اور رسمیاتی تصورات کا اسیر بنائے ہوئے تھی۔ اُن کے جنس۔ عورت و مرد کے فرق۔ عشق و محبت کے نظریئے صدیوں پُرانے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ پُرانے نظریوں کو نئے انداز سے پیش کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں رُومان یا شعریت کا عنصر اپنے بہترین انداز میں نمایاں ہے۔ گویا اُن کے شیشے نئے تھے اور شراب پُرانی۔ سودے نئے تھے اور علاج پُرانے۔

جدید افسانہ نے (اس میں طویل و مختصر۔ منظوم و غیر منظوم سبھی شامل ہیں) ایسے دور میں جنم لیا جب مذہب۔ مادہ۔ دنیا مافیہا۔ جنت جہنم۔ عورت مرد۔ جسم روح۔ غریب امیر۔ کسان مزدور۔ سب کے تصورات۔ ایک نئی صورت اختیار کر رہے تھے۔ نفسیاتی تجربوں۔ سائنسی کراماتوں۔ اقتصادی نظریوں نے زندگی کا رُخ ہی بدل دیا تھا۔ دنیا کی گروہ بندی ملی و ملکی حیثیت کی بجائے طبقاتی صورت میں ہونے لگی تھی۔ ایک گروہ کی ہمدردی ملکی قیود توڑ کر تمام عالم کو محیط کرنا چاہتی تھی۔ کسان۔ مزدور۔ سرمایہ دار۔ سب کی حیثیت عالمگیر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کی برادری بلا تفریق مذہب اور بلا تحدید ملک و ملت قائم ہو جائے۔ نفسیاتی تجربوں نے عذاب و ثواب سے تخیلات کو لچر اور بے بنیاد ثابت کرنا شروع کر دیا۔ چوری گناہ ہے۔ لیکن اگر اس کی وجہ اعصابی کمزوری کی بنا پر کلیپٹومینیا ہو۔ تو چوری اور گناہ

وہ لڑکی کی کیا حیثیت رہی۔ زناکاری حرام۔ لیکن بخار، درد سر اور اختلاج کی طرح اگر اس کا سبب کوئی پیدائشی یا موروثی کمزوری ہو تو زناکاری کس طرح قائم رہی۔ انسان اکثر ماہرین نفسیات کے نزدیک تحت الشعور اور لاشعور کا کھلونا بن گیا۔ گویا کہ اُس کا فعل اُس کا اپنا نہیں بلکہ ایک ان دیکھی طاقت کا فعل ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنے افعال نیک و بد کا ذمہ دار خود نہیں رہتا ——— ڈاکٹری۔ علم النفس اور اقتصادی آزادی نے عورت و مرد کے روائتی فرق کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا۔ اس کا اثر براہ راست ازدواجی تعلقات۔ اولاد۔ شادی بیاہ کی پابندیوں۔ اور حقوق نسواں پر ہوا۔ عورت جو مدت سے مرد کی ملکیت اور غلام تھی اب اتنی ہی آزاد اور خود مختار ہو گئی جتنا مرد۔ ان تغیرات نے مجلسی بساط ہی بدل دی۔ عورت عورت کی چیخ و پکار دنیا کے ادب میں ابتداء سے موجود ہے۔ لیکن اب یہی تذکرے انقلابی نعروں کی حیثیت سے کانوں میں گونجنے لگے۔

موجودہ افسانہ کو اس نقطۂ نظر سے پرکھنے کے لئے مغربی ملکوں کے افسانوی ادب کا سرسری مطالعہ ضروری ہے۔ موجودہ اُردو افسانہ نویس کو مغربی ادب کا مرہون منت قرار نہ دینا تعصب اور خود فریبی ہے۔ اوّل تو ایک اُردو ادب ہی پر کیا موقوف ہے دُنیا بھر کا ادب مختلف خارجی اثرات قبول کرتا رہتا ہے۔ اگر اُردو ادب کے ضمیر میں فارسی۔ عربی اور بھاشا شامل ہو سکتے ہیں تو مغربی ادب کا پرتو اس پر نہ پڑنا اس کے ٹھہراؤ پر دلالت کرے گا۔ اس کے علاوہ وسیع النظری سے کام لیا جائے۔ تو کسی ملک کا ادب ایسا نہیں جو بلا شرکت غیرے نسل انسانی کے چھوٹے سے حصے کے تصرف میں رہے۔ خاص طور پر جبکہ مشرق و مغرب کا تفریقی تخیل ہی مٹتا جا رہا ہو۔ "میرے اور تیرے" کا سوال ہی بے بنیاد ہے۔ انگریزی ادب نے مختلف ملکوں سے جس طرح اکتساب کیا ہے اظہر من الشمس ہے۔ ہندوستان پر انگریزی اور مغربی اثرات مدت سے پڑتے پڑتے اب ہمارے اپنے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ بند کالر اور نیچے کوٹ کو ہندوستانی اور کھلے کالر والے نیچے کوٹ کو انگریزی فرض کر لیا جائے۔ افسانہ کی باقاعدہ نشوونما اور اصولوں کی باضابطہ ترتیب کے لئے ہمیں مغرب کا ممنون ہونا ہی پڑے گا۔ جدید افسانہ نگاروں پر نظر ڈالیے تو اکثر و بیشتر انگریزی تعلیم یافتہ ملیں گے۔ اور جو مغربی ادب سے شغف نہیں رکھتے۔ وہ بھی مغربی زندگی کے عام اصولوں سے واقف ہیں۔ خود حالات کی مطابقت 'مشرق و مغرب کی کیفیات کو ہم رنگ بنائے ہوئے ہے۔

جدید مختصر افسانہ نگاری کی ابتدا امریکہ میں ہوئی۔ واشنگٹن ارونگ کی (Sketch Book) اسکیچ بک کو جدید افسانوں کی پہلی کتاب سمجھنا بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ بہ اعتبار ہیئت۔ یکسوئی اور تاثر اُس کا ہر خاکہ ایک مکمل افسانہ ہے۔ ارونگ کے بعد ایڈگر ایلین پو نے افسانہ نگاری کے باقاعدہ اصول منضبط کئے۔ اسی طرح وہی افسانہ جو صدیوں سے غیر ارادی اور لاشعوری طور پر چل رہا تھا۔ ایک مستقل صنفِ ادب اور فن بن گیا۔ پو نے مجموعی اثر پر زور دیا اور غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا۔ مجموعی اثر۔ یکسوئی اور اختصار کے اصولوں نے افسانہ اور ناول کے درمیان حدود فاصل قائم کر دیں اور طویل افسانے اور ناولٹ میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ افسانہ کا انحصار اتنا طوالت پر نہیں جتنا کردار نگاری۔ وحدت ماحول اثر انگیزی اور معاملات کی ترتیب و تفصیل و اجمال پر ہے۔ عصمت چغتائی کا ناولٹ "ضدی" تکنیک کی رو سے ناولٹ کہلانے کا مستحق نہیں۔ شائد محترمہ عصمت نے ناولٹ اور طویل و مختصر افسانہ کا فرق نظر انداز کر دیا۔ جدید افسانہ نویسی ایک باقاعدہ صنفِ ادب کی حیثیت سے روس۔ فرانس۔ اور انگلستان میں پروان چڑھی۔ فرانسیسی افسانہ نویس موپساں نے ایڈگر ایلین پو کا پورا پورا رنگ اختیار کیا اور موپساں کے بعد دیگر افسانہ نگاروں نے بھی اس روش کو ترک نہیں کیا۔ انگلستان میں اسٹیونسن نے مختصر افسانہ نگاری کے فن کو فروغ دیا اور بیسویں صدی میں کپلنگ افسانہ نویسی کا ناخدا تصور کیا جانے لگا۔ روس میں ٹالسٹائی، ٹرگنیف۔ دوستوسکی نے نئے نقطہائے نظر سے زندگی کو دیکھ کر ادب کی تشکیل شروع کی۔ اور افسانہ کو اصلاح و تبلیغ کا پُرفن ذریعہ بنایا۔ ان کے بعد چیخوف نے روسی افسانہ پر وہ اثر قائم کیا جو کپرن۔ الیکسی ٹالسٹائے۔ شیلخوف کے افسانوں پر تا حال قائم ہے۔ امریکی اور روسی افسانہ نگاری کی تکنیک جداگانہ ہے۔ او ہنری، جو امریکہ کا ممتاز افسانہ نگار ہے کپلنگ کے طرز نگارش سے بہت قریب ہے۔ چنانچہ روسی ڈھنگ انگریزی اور امریکی دونوں سے مختلف بنا۔ انگریزی اور امریکی افسانہ نویسوں کے برعکس روسی افسانہ نگار اصول وحدت کی پروا

نہیں کرتے۔ آج کل کسی جگہ بھی کسی ایک شخص کو پیشوا تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا جاتا ہے چنانچہ ہر ملک میں نئے نئے انداز اور اصول بن رہے ہیں۔ انگلستان میں یہ تحریک عام ہے۔ کیتھرائن مینسفیلڈ کے نزدیک فن کار کے لئے اصولوں کی پابندی فن کی موت ہے۔ افسانہ کی گوناگوں صورتیں اور موضوع کی آزاد اُٹھان یہی اُس روحِ بغاوت اور ذہنی آزادی کا نتیجہ ہیں جو ہر نوجوان ادیب میں فی زمانہ موجود ہے۔ اُپج اور انوکھا پن افسانہ کی جان سہی۔ لیکن اصولوں کی پابندی نیم پختہ اور ناآزمودہ کار افسانہ نگاروں کو.... اظہارِ خیال کے لئے لامحدود دریافت شدہ وسعتیں بہم پہنچاتی ہے۔ اب ذرا ان افسانہ نگاروں سے ہٹ کر جدید اُردو مختصر افسانوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا۔ کہ تقلید سے تجربہ اور ترقی کی راہیں بہت دُور نہیں۔

ہندوستان میں جدید افسانہ نگاری کا آغاز جنگِ عظیم کے بعد سے ہوا۔ یہاں پر جدیدیت سے مُراد نئے نظریاتِ زندگی کی ترجمانی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو ان نظریاتِ زندگی سے اختلاف ہو۔ یا اُس کے نزدیک غلط ہوں۔ موجودہ عالمگیر جنگ کی مانند ۱۴ء کی جنگ میں بھی کوئی گراں پایہ ادبی محاذ قائم نہیں ہوا تھا۔ جو دنیا کے ادیبوں کو ایک مقام پر جمع کر دیتا اور تمام دُنیا کے لئے ایک پیام پیش کرتا۔ البتہ صلحنامہ ورسائی اور اُس کے ہولناک نتائج نے دُنیا کے اُن تمام ادیبوں کو جو اس خونریز جنگ کو نسلِ انسانی کی آزادی اور بقا کا ذریعہ سمجھ رہے تھے۔ ایک مشترک موضوع اور ایک واحد مقصد مزید دے دیا۔ یہ عام موضوع سامراجی نظام کی مخالفت اور عام انسانی آزادی کی چاہت تھا۔ جس میں رنگ۔ نسل۔ اور ملکی تصورات کے لئے گنجائش نہ تھی۔ جنگ کا عام اثر جو ادیبوں پر ہوا نہایت قنوطی اور یاس انگیز تھا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وُہ ادیب فلسفی اور ناول نگار زیادہ تھے۔ اور افسانہ نگار کم۔ افسانہ بذاتہٖ اس صلاحیت کا حامل ہے۔ جس میں ادنیٰ بدنی تصویروں کا انعکاس ہو سکتا ہے۔ کوئی تجربہ۔ کوئی مشاہدہ کوئی واقعہ کوئی خیال افسانہ کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی افسانہ پر یاسیت کا رنگ گہرا نہیں رہا۔ خود فرانس کا افسانہ جو ۱۴ء تک قنوطی تھا۔ جنگ کے بعد یکسر بدل گیا۔ اس دور میں ہندوستانی افسانہ نگار اصلاحی یا رومانی افسانوں میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۴ء سے ۳۵ء تک کا زمانہ سیاسی ہیجان۔ اقتصادی بدحالی۔ آزادی کی جدوجہد۔ ہندو مسلم اتحاد کی ناکام کوششوں کا زمانہ تھا۔ سیاسی دباؤ اور مالی و ذہنی پریشانیوں نے ہندوستان کے ادیبوں کو بوکھلا دیا تھا۔ اُن میں اتنی سکت باقی ہی نہ تھی۔ کہ کسی نئے خیال کی ترویج کر سکیں۔ وُہ کسی زبردست محرک کے منتظر تھے ۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے اس ضرورت کو پورا کیا اور تمام اصلاح پسند اور چوٹی کے لکھنے والوں کو ایک جگہ سے، ایک لائحہ عمل کے مطابق اپنے ادبی کارناموں کو پیش کرنے کا موقع ملا۔ یہ تحریک بھی مغرب سے آئی اور انگریزی خواندہ لوگوں نے ہی اس کا خیر مقدم کیا۔ وقت کی رفتار بہت تیز ہے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ لیکن اُس زمانہ کو دیکھتے ہوئے ان ادیبوں کی کوششیں لائقِ تحسین اور ترقی پسندانہ معلوم ہوتی ہیں۔ "انگارے" کی اشاعت اُس دور کی گھناؤنی زندگی کے خلاف جہاد تھا۔ لیکن توازن کی کمی اور جوش کی زیادتی نے اس آلۂ کار کو بھی گھناؤنا بنا دیا۔ تجربہ نے انہیں تبلیغ کے بہتر انداز سکھا دیے ہیں۔ اب ان کی تحریروں میں تدبر ہے، توازن ہے، ہمواری ہے۔

گذشتہ دس سال کے افسانوی ادب پر مارکس اور فرائیڈ کی تعلیمات کا اثر نہایت نمایاں ہے۔ یہ اثر ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ تمام عالم پر مسلّط ہے۔ اقتصاد اور جنس زندگی کے بنیادی اصول سمجھے جا رہے ہیں۔ نئے زاویوں سے زندگی پر نظر ڈالنے والے ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو زندگی کے موٹے موٹے اصولوں کو اپنا نشانِ راہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور فرائیڈ یا مارکس اسکول سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ مارکسی نظریے کے افسانہ نگار یا تو براہِ راست مارکس اور انجیلز کی تصانیف سے واقفیت رکھتے ہیں یا صرف اُن کے بنیادی اصولوں سے روشناس ہو گئے ہیں۔ چونکہ افسانہ کی زمین ان نظریات کی تفصیل وار بحث کی متحمل نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف بنیادی خیال کو سنبھال سکتی ہے۔ اسلئے اُن کی کم علمی بخوبی چھپ جاتی ہے میرا خیال ہے کہ بہت کم مارکسی افسانہ نگاروں نے Des Kapital کا بالاستیعاب مطالعہ کیا

ہوگا ـــــ فرائیڈ کے پیروکار دراصل جنسی معاملات کی بنا پر فرائیڈ سے متعلق سمجھے جا سکتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر فرائیڈ کے گہرے جنسی تجربوں سے زیادہ وُہ خود اپنے منفرد جنسی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جنسی اہمیت پر زور دینے والا فرائیڈ اسکول سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ واٹسن، برنارڈ، ایڈلر جنگ وغیرہ فرائیڈ سے ہر جگہ متفق نہیں اس لئے اُن کے نظریات کو ماننے والے بھی فرائیڈ سے صرف جنسی میلانات کی حد تک تعلق رکھتے ہیں۔

جدید افسانہ میں جنس کا تخیّل کچھ مختلف صورت میں ہے۔ موجودہ ترقی پسند افسانہ نگار اُن جنسی جذبوں سے بحث کرتے ہیں۔ جو ہماری لاشعوری حالتوں میں کمسنی سے لے کر ضعیفی تک جاری رہتے ہیں۔ اِن کے نزدیک افعالِ انسانی کا سرچشمہ جنس ہے اور ہر شخص جذبۂ جنسی کے آگے محتاج ہے۔ اُن کے نزدیک خلل دماغی۔ ہسٹیریا۔ سنکی پن۔ رحم نفرت غصّہ۔ وغیرہ، حسِ جنس کے مختلف پہلوؤں کے مظہر ہیں۔ جدید افسانہ کا یہ موضوع حلیمہ، پدما یا برجیس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ "عورت" کے جذبات کی گہرائیوں سے وابستہ ہے۔ جس طرح برجیس محسوس کرتی ہے۔ اُسی طرح مس ڈی لوزا اور میڈم مونڈی ہنریٹا بھی سوچتی ہے۔ جہاں تک عورت کی اقتصادی کشمکش اور جماعتی کمتری کا تعلق ہے۔ مختلف ملکوں کے ظاہری اختلاف کے باوجود اُن کی بنیادی حیثیت ایک سی ہے۔ عورت کو وُہ درجہ حاصل نہیں جو مرد کو ہے۔ موجودہ افسانہ میں اسی جنسی تفوق کے خلاف جدوجہد ملتی ہے۔ وُہ شادی اور خانگی زندگی کو جنس سے علیحدہ سمجھتے ہوئے اُس کا حل چاہتی ہے۔ وُہ محبت۔ نفرت طلاق اور شادی میں مرد کے برابر حقوق چاہتی ہے۔ اسی جنسی جذبہ کے ساتھ طبقاتی کھینچ تان بھی لگی ہوئی ہے۔ اس موقع پر مارکس اور فرائیڈ دونوں کے نظریات گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مہندر ناتھ کے افسانوں میں محبت اور جماعتی تفریق اچھی طرح اُجاگر ہیں۔ اُن کے نزدیک متوسط طبقہ حسن حیا اور عفت کا بہترین معیار رکھتا ہے۔ وُہ محبّت سے واقف ہے۔ جذبۂ ایثار کا حامل ہے۔ یہ سب کچھ ہے اور درست ہے۔ لیکن یہ ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ درمیانی طبقہ کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی قدر "پیسہ" ہے۔ نچلے طبقے اُس کی اہمیت سے واقف ہی نہیں۔ اس لئے اُن کے لئے وُہ اس قدر قابلِ وقعت نہیں۔

امراء مرفہ الحال لوگ پیسہ کی تگ و تاز میں اُن کی برابری اس لئے نہیں کر سکتے کہ انہیں یہ نعمت میسر ہے۔ بہرکیف جنس۔ جماعت اور پیسہ کا یہ اجتماع مارکس اور فرائیڈ کے یکجا ہونے کے باوجود ترقی پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ عورت کے رومانی تخیّل اور موجودہ عورت کے دُو اور دُو چار والے جنسی نظریے میں جو بعد المشرقین ہے۔ وُہ ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو موجودہ افسانے عریاں اور غلیظ نظر آتے ہیں۔ عورت نے کس طرح اپنے آپ کو ان بیڑیوں سے آزاد کیا۔ یہ عصمت چغتائی کے مضمون "ہیروئن" میں اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ درحقیقت جن منزلوں سے ہندوستانی سیدھی سادھی گرہستن۔ کھلونا صفت۔ پیکرِ تسلیم و رضا عورت پچھلے پچاس سال میں گزری ہے وُہ موجودہ عورت کے سماجی وقار کا باعث ہیں۔ یہاں پر عصمت چغتائی کے نظریۂ جنسی کے متعلق کچھ کہنا بے محل نہ ہوگا۔ عصمت کا اسلوب تحریر کئی چیزوں کی وجہ سے دلکش بن گیا ہے۔ عموماً لوگوں کے نزدیک عصمت کی بے باکی اُس کے طرزِ نگارش اور افسانوں کو جاندار بناتی ہے۔ لیکن عصمت کی تحریر کا بھید مردانہ لہجہ اور اس میں نسائیت کی حسیّاتی طغیانی ہے۔ عصمت کے تمام کردار جنسی مریض ہیں مگر اُن میں زور اور توانائی موجود ہے۔ نسائیت کا غلبہ اور رسمیاتی تصورِ جنس عصمت کی فکر پر پوری طرح مسلّط ہیں۔ اُن کے نزدیک عورت گورکھ دھندہ ہے۔ بھول بھلیاں ہے۔ ڈائن ہے۔ سانپ ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ یہ وہی پیش پا اُفتادہ خیالات ہیں جو حاکم صفت مرد نے اپنی نوشتہ تاریخ میں عورت کے متعلق لکھ دیئے تھے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک عورت نہ تو سانپ ہے اور نہ اُس کے مُنہ کی چھچھوندر۔ وُہ بالکل ایسی ہی ہے جیسا مرد ـــــ جنسی اہمیت نہ تو اُسے بڑائی بخشتی ہے اور نہ کمتر بناتی ہے۔ مارکس کے نزدیک یہی جنس جو ہزاروں سال سے انسانی فکر و نظر کا مرکز بنی ہوئی تھی محض ایک گلاس پانی کے برابر ہے۔ دوسری ترقی پسندی محترمہ عصمت کے اس نظریئے سے ظاہر ہوگی کہ اُنہیں ہر عورت میں طوائف نظر آتی ہے۔ ترقی پسندوں اور اصلاح پسندوں کا خیال ابھی تک یہی تھا۔ کہ ہر طوائف میں عورت موجود ہے اور ہر عورت پہلے عورت ہے۔ بعد کو طوائف۔ لیکن عصمت کا زاویہ نگاہ قطعی مختلف ہے۔ اس کے

معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ اقتصادی اور سماجی حالات درست ہونے کے بعد بھی عورت کا طوائف پن (جو فطری چیز ہے) اپنی جگہ موجود رہے گا۔ روس کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ وہاں کسبیاں۔ رنڈیاں اور بھک منگی عورتیں موجود نہیں۔ ممکن ہے وہاں طوائف کے معنی ہی بدل گئے ہوں۔ عصمت صرف اس حد تک ترقی پسند افسانہ نگار ہیں کہ وہ عورت کے جذبات کی من وعن ترجمانی کرتی ہیں۔ گو اُن جذبات کی پرکھ کا انداز اور ان خیالات کی اساس وُہی پرانی داستانیں ہیں۔ ترقی پسندی بذاتہ نیک اور پُرخلوص جذبہ سہی لیکن اُسے موجودہ مختصر افسانہ نگاری کا جزو لائینفک قرار دینا درست نہیں۔ میرے خیال میں بغیر ترقی پسندی کے طرہ کے بھی محترمہ عصمت اعلیٰ درجہ کی افسانہ نگار رہیں گی۔

سنہ ۱۹۴۵ء کے ہر افسانہ نگار کو ترقی پسند سمجھنا عقل سے دشمنی ہے۔ پیشہ ور ناقد "پھیلن" یا "ذکر انور" کے مطالعہ سے بہک کر محترم عسکری کو ترقی پسندوں میں جگہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ مگر محترم عسکری کے نظریاتِ ادب وحیات ترقی پسندوں سے بہت کچھ مختلف ہیں بنگال کا قحط کوئی معمولی اور بھلا دیا جانے والا واقعہ نہ تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ حساس افسانہ نگار کا دل اس سے نہ کراہ اٹھتا۔ مگر انہوں نے افسانہ نگاروں کی نوحہ خوانی سے متنفر ہو کر فرمایا تھا۔ کہ عجب بات ہے کہ آج کل ہر افسانے کی تان قحط بنگال پر ٹوٹتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چند سو میل فاصلہ پر جب لاکھوں انسان کیڑے مکوڑوں کی مانند مر رہے ہوں تو کون سا جذبہ کسی ذی حس مصنف کو بے قرار ہونے سے باز رکھ سکتا ہے۔ رہا سوال معمولی لکھنے والوں کا سو تنقید کا اطلاق معمولی اور کمتر درجہ کے افسانوں پر نہیں ہوتا۔ عسکری کے سوویٹ روس اور اُس کے ادب کے متعلق نظریات بھی کچھ ایسے نہیں جو آپ سے سوویٹ دوست اسی لئے ترقی پسند کہنے پر مجبور کریں۔ بہر حال یہ تو مثال ایسے افسانہ نگار کی تھی جسے لوگ ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ اب ایک ایسے افسانہ نگار کو لیجیئے جو خود کو ترقی پسند۔ اصلاح پسند اور انقلاب پسند باور کرتا ہے۔ جہاں تک افسانہ نویسی کے فن کا تعلق ہے۔ احمد عباس کی طبیعت کو اس سے فطری لگاؤ نہیں۔ اُن کے افسانے کہانیاں نہیں بلکہ مضمون ہوتے ہیں۔ جس میں غلط قسم کا پروپیگنڈا اور متضاد تصوراتِ انقلاب و روشن خیالی۔ آپس میں گڈمڈ ہوتے ہیں۔ محترم احمد عباس کا مزاج دراصل اخباری مضمون نگاری یا فلمی کہانیوں کے لئے موزوں ہے۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر اُنہیں ترقی پسند افسانہ نگار تسلیم کیا جا رہا ہے۔ نئے زاویے کی جلد دوئم میں اُن کا مضمون "زندگی" ہے۔ اس میں زندگی کے تین پہلو پیش کئے گئے ہیں۔

"ایک بچہ" آزادی کا دلدادہ اور اُس کے حصول کے لئے زندہ رہنے کا متمنی۔

"ایک بوڑھا" ــــ مہاتما گاندھی۔ "ایک شہر" ــــ اسٹالین گراڈ۔

یہاں پر تیکنیک سے بحث نہیں کیونکہ وہ افسانہ ہے ہی نہیں۔ یہاں پر محض اُن کے ترقی پسندانہ نظریے کا تجزیہ مقصود ہے۔ ادبی بحثوں میں سیاسی اور ذاتی معاملات کا دخل مناسب نہیں لیکن چونکہ زندگی اور ہر چیز میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے میری یہ حرکت نازیبا نہیں سمجھی جائے گی۔ یہاں کسی ایک فرد واحد کا سوال نہیں بلکہ ایک ادارہ کا معاملہ ہے۔ ہستی کا نہیں بلکہ اُس کے پھیلاؤ کا معاملہ ہے۔ ترقی پسندی۔ روس پسندی۔ مادہ پرستی تو غالباً ہم معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر مادہ پرستی۔ روس پسندی اور روحانی اداروں سے مثلث قائم کیا گیا تو یہ تثلیث ترقی پسندی سے مترادف نہیں ہوگی۔ اسٹالین گراڈ کا تحفظ اور مہاتما گاندھی کا برت اگر اجتماعِ ضدین نہیں تو آگ پانی کا بیر بے معنی رہ جاتا ہے۔ برت جینؤ۔ آسمانی آواز۔ پوجا پاٹ۔ روح۔ عالم بالا ممکن ہے ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کے ایوان تصور کے لئے مسالہ پیش کر سکیں۔ لیکن روسی مادہ۔ مشین۔ زندگی اور زمین کے قائل ہیں۔ قوت حیات دونوں صورتوں میں یکجا سہی لیکن رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا انحصار قوتِ حیات کے مظاہرے پر نہیں بلکہ طریقے اور انداز پر ہے۔ ان متضاد تصوراتِ حیات وحریت کے ساتھ خود کو ترقی پسند سمجھنا ترقی پسندی کو نئے معنی پہنانا ہے۔ خیالات کا یہ اُلجھاؤ افسانہ کی رُوح کو ختم کر دیتا ہے اور افسانہ بے ترتیب اظہار جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پرچاری اثر جو مصنف کا مقصد اولیٰ ہوتا ہے۔ افسانہ پر محیط ہو کر اُس کے حسن و قبح کو ڈھک لیتا ہے۔ اور اس طرح سے ایک واقعاتی کیفیت پیش کرنے کے بجائے قاری کے سامنے ایک ذہنی خاکہ پیش کرتا ہے

جدید مختصر افسانہ نگاروں میں مقامی رنگ کی جھلکیاں عام ہیں۔ کہنے کو تو یہ جھلکیاں مقامی کیفیات کی ہوتی ہیں اور کسی ایک جگہ کی بڑائی

بھلائی۔ رُجحانِ طبع۔ اور زندگی کے نظریوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ تصویریں وسعتِ کونین کے وہ گوشے ہوتے ہیں جن پر خود وسعت قائم ہے۔ کرشن چندر کا کشمیر دراصل اُس کے کرداروں کو ایسے پس منظر کے ساتھ پیش کرتا ہے جو مقامی ہوتے ہوئے بھی آفاقیت کے حامل ہیں۔ صوبجاتی اُفقیت کم و بیش ہمارے تمام مختصر افسانہ نگاروں میں پائی جاتی ہے۔ مقامی گیت اس زندگی میں رس بھر دیتے ہیں اور اختلافِ زبان۔ محاورہ۔ تشبیہہ اور استعارہ کے باوجود زندگی کے بڑے دھارے کی مختلف شاخیں معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کا سرچشمہ فطرتِ انسانی ہے۔ ہمارے افسانہ نویسوں کے خلاف یہ الزام بار بار دہرایا جاتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں شہری ماحول پیش کرتے ہیں۔ اس کی کئی خصوصیات ہیں۔ موجودہ افسانہ نگاروں میں سے اکثر بیشتر شہری کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوان ہوتے ہیں۔ اور سب سے پہلے وہ اُن محرکات سے دوچار ہوتے ہیں جو اُن کی روزانہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔ دوسرے فی زمانہ گاؤں کی زندگی اور موت کا انحصار شہری حالات پر ہے۔ شہر سے دوری اور پیداوار اُسے ایک علیحدہ گوشہ میں پڑا رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ شہری زندگی دیہاتی زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ مغربی ادب۔ مِل / مزدور۔ کسان۔ مشین۔ فیکٹری۔ فیشن زدگی۔ تعلیم وغیرہ۔ ہمارے سامنے وہ عام دشواریاں پیش کرتے ہیں کہ حساس ادیب اُن سے بحث کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علاوہ ازیں عام پسندیدگی اور لوگوں کے مذاق کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے پُر تصنع اور پُرکارانہ اندازِ زندگی کے نقشے غالباً قاری کے لئے زیادہ دلچسپ اور پیچیدہ مواد پیش کر سکیں گے۔ گاؤں کی سادہ زندگی اور وہاں کے لوگوں کے سیدھے سادھے خیالات اہم اور وزنی ہونے کے باوجود اکثر شہریوں کے لئے بہت معمولی اور ناقابلِ اعتنا معلوم ہوں گے۔

اُردو افسانہ نگاری کے عام رجحانات کے سرسری تجزیہ کے بعد ہندوستان میں افسانۂ جدید کی مقبولیت کے اسباب پر روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کی رفتار۔ لوگوں کی عدیم الفرصتی اور تنوع کے شوق نے کس طرح اس صنفِ ادب کو عروج دیا۔ مغربی اثرات کے علاوہ خود ہندوستان کی فضا نے اسے پروان چڑھایا۔ اُردو کے ایک مشہور مقالہ نگار فرماتے ہیں اُردو مختصر افسانہ کی مقبولیت کا باعث ہندوستان کی گرم آب و ہوا ہے۔ اُنہیں غالباً یہ یاد نہیں رہا کہ روس۔ انگلستان۔ امریکہ اور فرانس کا درجۂ حرارت یہاں سے بہت کم ہے اور افسانہ وہاں یہاں سے زیادہ رائج اور کامیاب ہے۔ اگر یہ اشارہ جنسی افسانوں کی طرف ہے تو بھی سرد ملکوں میں جنسی افسانے یہاں سے پہلے جنم لے کر پھول پھل چکے ہیں۔ درحقیقت عدیم الفرصتی۔ زندگی کی برق رفتاری سے زیادہ جس چیز نے افسانہ کو ہر دلعزیز بنایا وہ اُس کا تنوع اور اختصار ہے۔ رسالوں کی بہتات ضخامت کی کمی۔ تحریر کی سہولت۔ اشاعت کی آسانی۔ معاوضہ کا خیال ریڈیو۔ اخبار اور فلموں میں کہانیوں کی کھپت۔ ترجمہ۔ سرقہ اور مواخذہ کی آسانیوں نے مختصر افسانہ کو بہت جلد فروغ دے دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریڈیو میں زبان اور بیان کی پابندیوں اور فلم میں انگریزی ناولوں کے ترجمے اور ڈائرکٹروں کے سوقیانہ مذاق ان دونوں ذریعوں سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانے میں مانع ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اُردو افسانہ کی رفتار نہائت اُمید افزا ہے۔ اور بہت جلد اُردو افسانہ دنیا کے بہترین افسانوی ادب میں قابلِ وقعت درجہ حاصل کر سکے گا ؎

ایک خط

خدیجہ مستور

"ہاں لکھو بھیا" کلو نائی کی بیوی نے حکم لگایا۔

"ہوں!" اس نے مری سی آواز میں ہوں کی اور تخت پر پڑی ہوئی موٹی سی انگریزی کی کتاب کو دیکھ کر قلم اٹھالیا ــــ ابھی ذرا دیر پہلے وہ کیسے مزے میں اپنی بیٹھک میں تنہا پڑا "ہندوستانی ادب میں رکھا ہی کیا ہے" کے عالمانہ خیال کو دماغ میں اچھالے مغربی ادب کو جانچ رہا تھا۔ اور اب یہ آگئی نہ جانے کہاں سے، بھری دوپہر میں پریشان کرنے۔

"سلام لکھوں یا دعا؟" اس نے پوچھا۔

"ہے تو بڑا بھائی، پر بھیا تم کچھ نہ لکھو اور ــــ" دمے کی بلغمی کھانسی آندھی کی طرح اٹھی اور وہ اپنے منہ میں اوڑھنی کا آنچل ٹھونس کر ساری جان سے کانپ گئی، چہرہ بیر بہوٹی ہوگیا اور آنکھیں پھانسی پانیوالے مجرم کی طرح ابل پڑیں ــــ بلغم کی دلدل میں پھنسی ہوئی کھانسی کی آواز سے اس کا جی متلانے لگا تو وہ دھیان ہٹکانے کی غرض سے بیٹھک کے ادھ کھلے دروازے کے باہر دیکھنے لگا ــ لُو کے تیز جھکڑ میروں دھول اڑاتے، بھوتوں کی طرح ناچتے پھر رہے تھے، آسمان کے سایۂ عاطفت میں کتنی ہی چیلیں ہوا میں قلابازیاں کھا کھا کر زور زور سے چیخ رہی تھیں، پاس پاس بنے ہوئے آدھے کچے آدھے پکے مکانوں کے دروازے بند تھے۔ اور سامنے کی چھوٹی سی تلیا میں ایک بھینس بڑی گرمی سے پناہ لے رہی تھی ــ کنارے پر کوئی راہگیر اپنی لٹھیا قریب رکھے، دھوتی سمیٹے اکڑوں بیٹھا تھا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر چند سؤر اپنی سیاہ تھوتھنیاں لٹکائے، راہ گیر کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"اب لکھو بھیا" کھانسی کا دورا ختم ہونے کے بعد وہ اوبی اوبی سانسوں کے درمیان بولی۔

"ہاں ــــ بولو جلدی جلدی کیا لکھیں؟"

"تم یہ لکھو بھیا کہ تم ہو تو اپنے باپ سے پر ہو حرا ــــ" قلم اسکے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا۔ ایک گاؤں میں بسنے والی نائی کی اولاد جس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بھائی کے سامنے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھنا سیکھ لیا ہوگا، بھائی کے سامنے نظریں اٹھا کر بات کرنے کی کبھی ہمت نہ پڑی ہوگی، وہ بغیر سلام دعا کے اپنے بھائی کو خط کے شروع ہی میں یہ کچھ لکھوا دے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ لُو کا ایک گرم جھونکا اسکے دماغ میں داخل ہوگیا ہے ــــ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ اپنے ننھے میتھے گاؤں آیا کرتا تو وہاں کے لوگ بارے احترام کے پڑھنے لکھنے کا سارا کام اسی سے لیا کرتے: "فلاں کو خط لکھ دو بھیا اللہ نے تم کو علم دیا ہے۔" "یہ خط پڑھ دو بھیا کھلیچہ تو ہوگی پر بھگوان نے تم کو علم دیا ہے۔" "مہاجن کے پاس کھیت رہن رکھوانا ہے میاں جرا چلکر لکھا پڑھی کرا دو"۔ عورتیں بھی اس سے خط لکھوانے آیا کرتیں۔ شہروں میں کام کرنیوالے شوہر، باپ یا بھائی کو۔ ایسے خلوص سے بھولا بھالا خط لکھوائیں کہ اسے گاؤں میں رہنے والی معصوم معصوم عورتوں پر پیار آنے لگتا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے چاچی، جو اپنے بھیا کو ایسا خط لکھوانے بیٹھی ہو؟" اس نے بڑی کڑوی نظروں سے کلو کی بیوی کو دیکھا۔

"تمہاری بَلا سے کرہیں بھیا، ہم جو کچھ کہیں وہ لکھتے جاؤ تم نے تو ہمکو جبان دی ہے کہ جو کچھ ہم لکھوائیں گے تم لکھ دو گے۔ اور کل بات اپنے تک رکھو گے۔ کیسا میرا بھیا۔ لکھ دو تمہارے پاؤں پڑوں، اللہ نے تم کو علم دیا ہے" کلو کی بیوی مجسم خوشامد بنی بیٹھے ہی بیٹھے اپنے دبلے پتلے جسم کو گھسیٹتی اسکے پیروں کی طرف بڑھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایک انسان کا سر دوسرے انسان کے قدموں پر جھکتا، وہ ایک دم کھانسی کے چنگل میں پھنس گئی۔

"اچھا اچھا، چلو اب جلدی بولو" اس نے قلم انگلیوں میں تھام کر نفرت سے کلو کی بیوی کو دیکھا۔

"ہاں ــــ آں!" وہ کھانسی کے تیز جھکڑ میں گنگنائی اور پھر جیسے ہی کھانسی کا دورا ختم ہوا، پسینہ پونچھ کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بولی: "ہم نے جو جو بولا تھا لکھ لیا بھیا کہ تم ہو تو اپنے باپ سے پر ہو حرا ــــ ؟"

"ہاں لکھتے ہیں!" اسکے چہرے پر نفرت آمیز شرارت کی ایک تیز لہر رینگ گئی اور اس نے سادے کاغذ پر لکھنا شروع کیا ــــ "تمہیں بلاس پور میں رہنے والی بہن کا سلام پہنچے اور پھر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ہوں تو

۱۔ منت کرنا

اپنے باپ سے پر عادتوں کی ہوں حرا ـــــ" قلم کاغذ پر ایک ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ایسی عبارت پھیلا رہا تھا جس سے کلو کی بیوی کی اچھالی ہوئی گندگی خود اسی پر برس رہی تھی ـــــ تعلیم یافتہ مرد ایک جاہل عورت سے دغا کر رہا تھا۔ ایک دوسرے مرد کی حمایت میں ـــ ایک کمزور دمے کی مریض ادھیڑ عمر کی عورت سے دغا۔ مگر وہ مجبور تھا، وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ شہروں شہروں گھوما تھا جہاں اس نے عورت کی دلیریوں کو اپنے حساب بڑے عجیب عجیب تباہ کن انداز میں دیکھا تھا۔ اسے وہاں نہ تو دیہاتی عورتوں جیسی شرم و حیا نظر آئی تھی۔ نہ پاس و لحاظ۔ اسے سب کی سب منہ پھٹ اور بے باک نظر آئی تھیں۔ جو مشرق کی روائتی تہذیب کے پردوں کو نوچے ڈال رہی تھیں انتہائی غلط طریقے سے۔ ـــ اور اسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تو حد سے زیادہ نفرت تھی۔ کالج میں ایک لڑکی نے کھلم کھلا عشقبازی کی۔ اور جب لڑکی کے بھائی نے اسے تنبیہ کی تو اس نے بھری کلاس میں بھائی کی بدعنوانیوں کو گنوا کر اسے ذلیل کر دیا تھا ـــــ اب بھلا وہ عورت کی اتنی آزادی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ آخر وہ دیہات کی "پیداوار" تھا۔ اس نے آنکھ کھول کر یہی دیکھا تھا کہ بہنیں اپنے بھائیوں کی سب جا و بیجا برداشت کرتیں۔ اور کبھی آنکھ نہ اونچی کرتیں۔ بیویاں اپنے شوہروں کے جوتوں، تھپڑوں اور لاٹھیوں کے زیر سایہ رہتے ہوئے بھی کبھی اُف نہ کرتیں۔ اسے ان عورتوں پر رحم تو ضرور آتا، لیکن ساتھ ہی وہ ان عورتوں کی سعادتمندی پر خوش بھی ہوتا ـــــ لیکن آج یہاں بھی اسے ایک منہ پھٹ اور بیباک عورت سے سامنا تھا ـــ دیہات کی بے زبانی اور معصومیت پر بدنما داغ ـــــ اسے اس سے دغا کر کے روحانی خوشی ہو رہی تھی۔

"ہوں لکھ لیا۔ اور بولو۔"

"اب اسکے آگے لکھو بھیا ـــــ اگر تم ایسے نکلے ہو تو تمہارا کیا قصور۔ اللہ جنت دے تمہارا باپ بھی بکٹ کھر اب آدمی تھا۔ پر تم اس سے دو ہاتھ بڑھ کر نکلے ـــــ باپ نے تو کھیر گھر میں ایک ہی مہریا رکھی اور اسی کے ہاتھی جیسے ڈبل کو مار مار کر چوہا بنا دیا تھا۔ پر تم نے چار سے گھر بسایا اور ایک کے بھی نہ ہوئے۔ اور پھر کون جانے کہ باہر کتنی نالیوں میں ہاتھ ڈالتے پھرے ـــــ لکھ لیا بھیا؟"

"ہوں!" اس نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اب لکھو بھیا۔ کہ تم کو ہمارے منہ سے ایسی باتیں سنکر بڑا گُستہ آویگا۔ اگر سامنے ہوتے جیو درہم پر لٹھ بالیکر سیدھے ہو جاتے۔ پر اب ہم کو اپنی لگی کے آگے کسی کی بھی پرواہ (پروا) نہیں۔ جیوں جیوں پانی سر سے اونچا ہوتا ہے تو آدمی سب کچھ کہہ لینا چہتا (چاہتا) ہے، ہاں ـ" وہ کہتے کہتے چپ ہو کر اس کی ہوں کا انتظار کرنے لگی، وہ رک رک کر سوچ سوچ کر خط لکھ رہا تھا۔

"ہوں!"

اب لکھو بھیا۔ آج تمہاری بہن چپ نہیں رہ سکتی ـ وہ تمہارے کرتوت تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیگی۔ گسہ آئے تو آدھی روٹی جیادہ کھا لیجیو ـــــ ہم تمہارا کھیال کیوں کریں جب تم نے ہمارا کھیال نہیں کیا ـــ ؟ اپنی بہن کو تین مہریاں برتنے ہوئے آدمی کو بیاہ دیا۔ بوڑھا، دمے کا ماندہ ـــ ہم کھوب جانتے ہیں تم نے بڈھے سے روپیہ لے لیا ہوگا اپنے لئے مہریاں پھانسنے کو۔ تبھی تو اپنی بالی عمر کی بہن کو اس کے گھر ڈھکیل دیا ـــ تمہیں یہ بھی کھیال نہ آیا کہ میری بہن نے میری کیسی کھدمت کی۔ اپنی نیند کو نیند نہ جانا۔ رات کے دو دو بجے تسہ پاتی کر کے ستاتے گھر آتے تو تمہاری بہن تم کو گرم گرم سالن روٹی دیتی۔ گھر میں جتنا بکری کا دودھ ہوتا اس میں سے اپنے حصے کا دودھ بھی تمہارے لئے رکھ دیتی کہ ہمارا بھیا پیئے گا۔ پر تم نے بہن کو بیاہنے کے وقت سب کچھ بھلائے دیا اور اسے تلیا جیسے مرد کی گودی میں ڈال دیا اور ـــ

"کیا پوری کتاب لکھواؤ گی، آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟" اس نے کڑوی کڑوی باتوں سے تنگ آ کر کہا اور قلم رکھ دیا۔

"مطبل ـــــ بھیا رے تمہارے پاؤں پڑوں تھوڑی تکلیف اور کر لو بس ہم کو ایک ہی کھط لکھوانا ہے۔ پھر جندگی میں نہ لکھوائیں گے۔" کلو کی بیوی کی آواز التجا کے دباؤ سے کپکپا کر رہ گئی۔ اور وہ پھر زور زور سے کھانسنے لگی۔

"اچھا بولو" اس نے نفرت سے کہا، ایسی نفرت کہ وہ اسے کھانسنے کی مہلت بھی نہ دینا چاہتا تھا۔ کلو کی بیوی نے سارا بلغم پی کر جیسے کھانسی کا خاتمہ کرتے ہوئے پوچھا

"ہم نے جو کچھ بولا تھا وہ سب لکھ لیا بھیا؟"

"ہاں!" اسے اپنی پیٹھ پر چیونٹیاں رینگتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

کھدا تم کو کھوس رکھے۔ تو اب لکھو کہ تم کو کھدا نے اکل تو دی تھی۔ مردجات کے عقل ویسے ہی جیادہ ہوتی ہے۔ پر تم نے اپنی اکل کا سارا جو ہر بچہ عورت باجی پر کھرچ کر دیا۔ تم نے اپنی اکل سے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ بن ماں باپ کی لڑکی اپنے بھیا کو صر بھیا اس لئے جیادہ نہیں جانتی

ہے کہ وہی سب کچھ ہوتا ہے، بلکھے (بلکہ) اس لئے اس کا کھیال کرتی ہے کہ وہ اپنی بہن کا ہاتھ کسی اچھے مرد کے ہاتھ میں دے بکھت آنے پر ——اور——"

"ایں؟؟" تیزی سے چلتا ہوا قلم ایک دم رک گیا —— اس نے کلو کی بیوی کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ کیا وہ سچ بول رہی تھی ——؟ اس کی بھی تو ایک بہن تھی، چپ چاپ رہنے والی گڑیا۔ کیا اسکے پیٹ میں بھی یہی گھن بھرے ہیں؟ اور اس کے ماں باپ بھی تو بالکل بوڑھے ہیں۔ اتنے بوڑھے کہ موت انکی زندگی کے دروازے پر دستک دینے کو تلی کھڑی ہے۔ کیا اس کی بہن بھی اسی لئے اس کی خدمت کیلئے پیش پیش رہتی ہے؟

"لکھ لیا بھیا؟"

"ہوں!" اس نے ایک بجھی سی ہوں کی۔

"اب لکھو بھیا۔ تمہاری بہن تو بوڑھے کی تلیا میں گر کر ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ پر تم جانو بوڑھے کی جوان جورو دیکھ کر کیسا جی مچلتا ہے مردجات کا۔ سبھی کی بُری نجر پڑتی ہے —— پانی میں آگ پھینکو تو بجھ جائے گی پر کوئلہ تو اوپر ہی تیرتا رہے گا —— اسے نکال کر سلگانا کون بڑی بات ہے۔ کتنوں نے ہمیں گھسیٹا، پر پھر جمیندار جی نے تو چوری چوری رکھ بھی لیا۔ پیسہ ملا، جوانی ملی، پر اللہ کے گھر کے لئے منہ کالا ہو گیا —— پھر کا ہے کو تمہارے منہ کی کالکھ تم کو نہ دکھاؤں۔ پر مردجات کی آنکھیں اپنی کالکھ دیکھنے بکھت گدی میں گھس جاتی ہیں۔ اب تم یہ پڑھ کر ہمکو گالیاں دو گے، ہماری بے گیرتی کو اچھالو گے بہن ہی کو بہن کی گالی دو گے۔ پر اب ہم کو تمہاری پرواہ (پروا) نہیں اور ——" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اس کے گلے میں بلغم اس طرح خرخرانے لگی، جیسے اس کے سینے میں غصے سے بھری ہوئی بلی بیٹھ رہی ہو چھپ کر —— اس نے کھنکار کر بلغم منہ میں جمع کیا اور اٹھ کر بیٹھک کے باہر تھوک آئی —— قلم اس کی انگلیوں میں ٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا اس لب دم عورت کی جرات اور صاف گوئی پر۔

"اب لکھو بھیا کہ ہم نے جمیندار جی کی بکسیس (بخشش) سے جو دو سو روپیہ جمع کیا تھا سو وہ بھی پاس نہ رہا۔ تمکو کھوب یاد ہوگا کہ چار سال پہلے جب تم آئے تھے تو اپنی بہن کو اپنا پتا سنا سنا کر سارے روپے کرج (قرض) کے نام سے لے گئے تھے۔ میں نے یہ کہہ کر تمہارے منہ پر جوتا بھی مارا تھا کہ تمہارا کنجوس بہنوئی کھانا کپڑا تو دے نہیں سکتا کھرچ کو روپے کہاں سے دیگا۔ میں نے جانے کہاں کہاں سے یہ روپے جمع کئے ہیں —— پر تم ایسے بن گئے اپنی گرج پر کہ بہن کی کمائی بھی لے لی۔ میرے دل میں تو آئی کہ تمہارا منہ نوچ لوں اپنے ناکھونوں سے پر چپی ہو رہی۔ ایک ماں کے پیٹ میں رہنے کی لاج نے ایک لفج منہ سے نہ نکلنے دیا —— تم کہہ گئے تھے کہ ایک برس کے اندر اندر سارا روپیہ ادا کر دو گے۔ پر چار سال ہو گئے پلٹ کر کھبر بھی نہ لی —— لکھ لیا بھیا؟" وہ اطمینان کے لئے بار بار رک کر پوچھتی۔

"ہاں!" وہ تیزی سے قلم چلاتے ہوئے شیطنت سے مسکرا رہا تھا۔

"تو اب لکھو میاں۔ ہم نے منسی جی سے اور لالہ جی سے دو کھط لکھو لکھو کے لکھوائے کہ اب ہمارا روپیہ بھیج دو۔ پر تم نے جواب بھی نہ دیا۔ ہم نے تمہاری عجت بچانے کو اپنا روپیہ دیدیا تو اس کا یہ پھل دیا تم نے؟ میرے جی میں آتی ہے کہ تمہارے گاؤں آکر برادری بھر میں تمہارے گن کہہ کر بیروں کے بھاؤ عجت بیچوں پھر دیکھوں تمہاری مونچھ کتنی اونچی ہوتی ہے ——" کلو کی بیوی نے پورے جوش سے کہا۔ وہ کنکھیوں سے اسے دیکھ کر جی ہی جی میں ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔

"سیدھی طرح کہے دیتے ہیں کہ ہمارا دو سو کا دو سو روپیہ فوراً بھیج دو۔ نہیں تو ہم کچھ کر بیٹھیں گے ——" وہ رک رک کر تیز تیز سانسیں لینے لگی۔ مسلسل بولتے رہنے سے اس کی سانس چڑھ رہی تھی، اور سارا جسم اس طرح پسینے سے شرابور ہو رہا تھا جیسے اسے تلیا میں ایک غوطہ دے دیا ہو۔ اس کی آواز کا جوش ایک دم گرنے لگا۔

بس اتنا اور لکھ دو بھیا —— وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی —— سال ہونے آتا ہے۔ تمہارا بہنوئی مر گیا پر اپنا دمہ ہمیں سونپ گیا کہ اس کے پیچھے ہم کو کوئی روٹی دینے والا، برادری کے سامنے چھاتی کوٹ کر نہ نکل آئے۔ سو کوئی نکلا تو کیا۔ جمیندار جی نے بھی دمے کی بجہ (وجہ) سے چھوڑ دیا۔ مجوری کر کے پیٹ بھرتی رہی۔ پر اب مجوری بھی نہیں ہوتی۔ کھانسی نے بدن کا جوڑ جوڑ توڑ دیا ہے —— اب ہمارا روپیہ ہمیں بھیج دو۔ ہم دوا دارو کر کے اور روکھی سوکھی کھا کے اپنی جندگی کاٹ لیں گے۔ اب ہمارا کون بیٹھا ہے جو ایک بکھت کی روٹی دے گا ——" بولتے بولتے اس کی سانس شدت سے چڑھنے لگی تو بلغم کی دلدل میں پھنسی ہوئی کھانسی

کراہنے لگی ——— وہ قلم رکھ کر کلو کی بیوی کو دیکھنے لگا جو بے چین ہو ہو کر اپنا سینہ سہلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں مارے تکلیف کے ابھر کر بڑی بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔

"کچھ اور لکھوانا ہے یا بس؟" اس نے خط پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا

"اور کچھ نہیں لکھوانا ہے بھیا۔ روپے کے لیئے تو لکھ دیا ہے نا، ذرا پڑھ کر سنا دو اتنا۔"

"ہم تم سے کچھ نہیں مانگتے تم ہمیں ہمارا روپیہ بھی نہ بھیجو ———"

اس نے اپنا لکھا ہؤا پڑھا اور دانتوں تلے زبان داب لی۔ کلو کی بیوی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہم نے لکھا ہے چاچی کہ ہمارا روپیہ ہمیں فوراً بھیجدو۔ فوراً فوراً۔" اس نے جلدی سے بغیر خط دیکھے کہا۔

"صدقے جاؤں بھیا کے، ذرا کھط دیکھ کر پڑھ دو۔" کلو کی بیوی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ اور اس نے کچھ جھینپ کر وہ ایک لائن ذرا رد و بدل کے ساتھ سنا دی۔ تب بھی اس کی آنکھیں اطمینان کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔

"تم کو اللہ نے علم دیا ہے بھیا۔ تبھی ہم تمہارے پاس کھط لکھوانے آئے۔ ایسا کھط کوئی بھی نہ لکھتا گاؤں میں۔ سب میں پھونکتے پھرتے۔ بھیا گاؤں کے لوگ تو آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیتے ہیں، پر تم کو اللہ نے علم دیا ہے۔ تم دلوں کا حال دیکھتے ہو پھر لفظ نہیں۔"

"ایں؟" اُسے ایسا محسوس ہؤا جیسے کلو کی بیوی نے پیار ہی پیار میں اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا ہے۔ وہ ایک دم کسی گہری فکر میں غوطے کھانے لگا، اس کی صاف ستھری، چکنی پیشانی پر باریک باریک سلوٹیں اُبھر آئیں، بھویں گتھ گئیں اور قلم بے خیالی میں ہاتھ سے چھٹ کر تخت پر گر گیا، جس سے روشنائی کی ایک ننھی سی بوند نکل کر سفید چادر میں جذب ہو گئی۔

"بھیا رے اب کھط ختم کر دو۔" کلو کی بیوی نے کہا تو وہ ایک دم چونک پڑا۔

"کچھ اور لکھوانا ہے؟"

"نہیں، ہاں بس اتنا ہی اور لکھ دو آکھر میں کہ ہمارا روپیہ ہمیں بھیج دو، نہیں تو تم پر اللہ کا گجب نازل ہوگا، ہم تو تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ تم اتنی سرافت کرو کہ ہمارا روپیہ ہمیں بھیج دو، ہاں ———" اور وہ خط بولتے بولتے اس سے مخاطب ہو گئی۔ "بھیا اب ہمارا کون بیٹھا ہے جو ایک بکھت کی روٹی دیگا۔" محرومیوں کے احساس سے گھبرا کر وہ دوپٹے کا آنچل منہ پر رکھ کر رونے لگی۔ اور کلو مرحوم کی بٹھائی ہوئی پہرے دار کھانسی مٹی ہوئی بیوہ کے رونے سے مشکوک ہو کر ایک دم اس پر جھپٹ پڑی ——— دیکھتے ہی دیکھتے وہ مارے کھانسی کے زمین پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ بلغم کی پیلی پیلی پھٹکیاں منہ سے اڑ اڑ کر اس کے میلے کچیلے کپڑوں پر بکھرنے لگیں اور پیشانی سے پسینے کے موٹے موٹے قطرے ڈھلک ڈھلک کر ناک اور آنکھوں پر بہنے لگے ——— وہ قلم رکھ کر کلو کی ظالم کھانسی کے سخت دھاوے کے اثرات اس کے چہرے پر دیکھنے لگا۔ اور جب تھوڑی دیر بعد کلو کی بیوی کو ذرا سکون ہؤا تو وہ دیوار کے سہارے بیٹھ کر الٹی سیدھی سانسیں لینے لگی ——— بیچاری ٹوٹی عورت۔

"تمہارے بھائی کا پتہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جلع کانپور، ڈاکخانہ اوناؤ۔ موجع ——— پہنچ کر عادل حجام کو ملے۔" کلو کی بیوی نے پتہ بتاتے ہوئے اپنی قمیص کی جیب سے ایک مڑا تڑا جگہ جگہ سے پسینے میں تر لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اب پورا کھط سنا دو بھیا، تم نے سب کچھ لکھ دیا ہے نا؟"

"ہاں سب لکھ دیا ہے۔" اور معًا اس کی نظر لکھے ہوئے خط کے شروع پر پڑ گئی۔

"چاچی کل آ کر پورا سن لینا اور لے بھی جانا ابھی صاف نہیں لکھا ہے"

"اچھا بھیا، کھدا تمہیں کھوس رکھے، تمہارے گھر آئی بلائیں ٹالے۔" وہ اپنی پتلی ٹانگوں میں پھنسا ہؤا سیاہ سوسی کا چوڑی دار پاجامہ ٹھیک کرتی، اپنی تیز تیز سانسوں سے مقابلہ کرتی دروازے

کی طرف بڑھی "بھیا! آخر میں یہ ضرور لکھ دینا کہ ہمارا روپیہ ہمیں بھیج دو" اس نے چلتے چلتے مڑکر کہا اور پھر گرم گرم دھول سے اَٹی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں ٹپٹپاتی تلیا کی طرف ہولی — بھینس اب تک تلیا میں بڑی گرمی سے پناہ لے رہی تھی۔ اور کنارے پر لگے ہوئے سایہ دار درخت کے نیچے ایک چھ سات سال کی لڑکی اور ایک لڑکا پاس پاس اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور ان دونوں سے کچھ دور چند سؤر اپنی تھوتھنیاں لٹکائے دُمیں جھلاتے خوان نعمت کا انتظار کر رہے تھے۔ اور تلیا کے دوسرے کنارے پر ایک راہگیر جوڑ الٹیا میں پانی بھر رہا تھا — کلو کی بیوی تلیا کے داہنی طرف جانے والے راستہ پر مڑ گئی۔ تو وہ اسے دیکھتے دیکھتے سر جھکا کر اس کا خط دوسرے کاغذ پر لکھنے لگا۔ غیر معمولی پھرتی سے —

اور پھر خط کے آخر میں وہ لکھ رہا تھا: "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ نمبردار جی کے لڑکے یوسف میاں نے مجھے اپنی زبان سے ماں کہا ہے۔ اگر تم نے اس خط کو دیکھتے ہی ہمارا روپیہ نہ بھیجا تو وہ تم سے جوتے مار کر اگلوا لے گا — آخر تو تم اپنے باپ سے ہو۔ عادتوں کے حرا — ہو تو کیا۔ شرافت اسی میں ہے کہ فوراً روپیہ بھیج دو"

فقط تمہاری بلاس پور کی رہنے والی بہن۔

بقیہ "سلمیٰ"

آتا۔ خوب بناتی ہیں چائے تمہاری بیگم" ایک اور صاحب بولے "تم تو کہا کرتے تھے، تمہاری بیوی گاؤں کی ہے؟" "ارے یار" جاوید نے کہا "جس روز آئی تھی۔ اُف اس قدر پھوہڑ اور گنوار تھی کہ حد ہے" "سچ" دوسرے صاحب نے حیرانی سے کہا۔ "ایمان سے" جاوید چلائے "پھر" دوسرے صاحب نے پوچھا "پھر کیا" جاوید نے جواب دیا "بمشکل اس راہ پر لایا ہوں۔ بڑی محنت سے سکھایا ہے۔ لیکن اب تو کیا بات ہے اُس کی" وہ ہنسے "یعنی یہ سمجھ لو چھیاں سے سلمہ بنا دیا ہم نے اُسے" اس پر ایک قہقہہ لگا۔ میری تشویش اور بھی بڑھ گئی۔ جاوید صاحب کیا سکھائیں گے اُسے؟ پھر اس تبدیلی کی وجہ کیا تھی میں سوچ میں پڑ گئی۔

اگلے روز جب میں سلمہ کے ہاں گئی تو وہ کمرے میں نہ تھی۔ میز پر وہی پیڈ اور قلم دوات رکھی تھی۔ سامنے اس کا بکس کھلا پڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اُس روز اُس نے مجھے ملنے سے پہلے بکس کو بند کر دیا تھا۔ سوچا دیکھوں تو۔ ایسی بات مجھے اللہ دے۔ دوڑ کر گئی۔ دو ایک کپڑے اُٹھائے تو کیا دیکھتی ہوں کہ خطوں کا ایک پلندہ پڑا ہے۔ عین اُس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "ڈاک والا!" فوراً غسل خانے کا دروازہ کھلا اور سلمہ چادر میں لپٹی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی۔ ڈاکیہ نے تین لفافے اور ایک کارڈ پھینک دیئے۔ سلمہ نے ان میں سے سبز رنگ کا لفافہ اُٹھا لیا اور باقی تینوں کو وہیں چھوڑ، پھر غسلخانے میں گھس گئی۔ پھر مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے صندوق کھولا۔ کپڑے سرکائے۔ تمام کے تمام خطوط سبز رنگ کے پیڈ پر لکھے ہوئے تھے۔ اس بات پر میرے دل میں تجسس سا پیدا ہوا اور میں کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی — دور — سامنے فلیٹ کی سبز کھڑکیوں میں کوئی گھڑا دائکین بجا رہا تھا۔ "چوری چوری چپکے چپکے — ساجناں"۔ اور مجھے یوں لگا۔ جیسے ساجناں کی جگہ — سلمہ کہہ رہا ہو ؛

کنہیا لال کپور

فریادی

"مجموعۂ اضداد ہے! راز سربستہ ہے! واماندۂ راہرو ہے!
سو فی صدی پرولتاری ہے! دو سو فیصدی بورژوا ہے۔ سوالیہ
نشان ہے۔ المیہ نظم ہے۔ سراسر رومانی ہے۔ یکسر قنوطی ہے۔
نوحۂ کشمیر ہے! نالۂ یتیم ہے!!! لارنس عربی کے بعد دوسرا پُراسرار
شخص ہے۔ آزاد اور ظفر علی خاں کے بعد تیسرا خطیب ہے"——

یہ ہیں مختلف رائیں جن کا اظہار کرشن چندر کی شخصیت کے متعلق کیا گیا ہے
حتّٰے کہ بیچارہ کرشن چندر ابوالہول کی ایک پہیلی بن کر رہ گیا ہے۔ میری
دانست میں کرشن چندر سیدھا سادا انسان ہے۔ اُس کی سب سے
بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اُسے ہر خوبصورت عورت "اپنا بھائی" اور ہر بدصورت
لڑکی "اپنا عاشق" تصور کر لیتی ہے۔ مجموعۂ اضداد وہ صرف اس حد
تک ہے کہ اُس کی آنکھیں کشمیری، زبان پنجابی اور لباس یورپین
ہے اور طبعاً و عملاً وہ بورژوا لیکن قولاً و تحریراً پرولتاری ہے۔ البتہ
ایک اعتبار سے وہ عجیب و غریب ادیب ہے۔ نومبر ۱۹۳۹ء کا
ذکر ہے کہ لاہور میں اچانک اُس نے خودکشی کر لی۔ لیکن ایک سال
بعد دہلی میں زندہ ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ میں اُس کی دوسری وفات
ہوئی۔ لیکن عدم آباد پہنچنے کی بجائے وہ پونہ پہنچ گیا۔ اس وقت بمبئی
میں ہے اور ابھی تک زندہ ہے۔[1] شاید اب کبھی نہیں مریگا

فطرتاً وہ تلوّن کیش ہے۔ ہر تیسرے سال بعد ایک نئے امام کے ہاتھ
پر بیعت کرتا ہے۔ لڑکپن میں اُس کا امام ڈان جوآن تھا۔ جوانی میں احمد شاہ
بخاری۔ چند دنوں کے لئے وہ ڈبلیو زیڈ احمد پر ایمان لے آیا اور آج کل
اُس کا امام دیوکا رانی ہے۔ ایک ہی قسم کے قدرتی نظاروں، نسوانی
جمالوں اور ادبی تجربوں سے وہ بہت دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ سرینگر
سے پہلگام جاتے ہوئے کشمیری جھرنوں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں
اور گنگناتے ہوئے پہاڑی نالوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن جلد ہی
ان سب کا مذاق اڑاتے ہوئے گنگناتا ہے "یہ جھرنے کتنے بیوقوف ہیں"۔ وہ لاری میں
بیٹھے ہوئے کہتا ہے "یہ کم بخت آبشار کس قدر مسلسل اور بے معنی شور میں
موسیقی تلاش کر رہے ہیں"۔ پہلگام میں دو چار دن رہنے کے بعد
اُس کی طبیعت اُکتا جاتی ہے اور وہ بار بار یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے
"خیال کرو۔ صرف دو چار اونس صاف آکسیجن کے لئے ہم اس ویرانے
میں آ بسے ہیں"۔ اپنے افسانوی مجموعوں کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں
میں کبھی چمک پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے اُسے کبھی اپنے افسانے کی تعریف
کرتے نہیں سُنا۔ دراصل وہ گذشتہ تجربوں سے بہت جلد بیزار
ہو جاتا ہے اور نئے نئے تجربوں کی دھن میں اپنا بہت کچھ پیچھے
چھوڑ جاتا ہے۔

پہلی ملاقات میں اُس کے مداحوں کو اُس سے مل کر اکثر مایوسی ہو جاتی
ہے۔ میانہ قد، گندمی رنگ اور جواں سال۔ وہ اگر کالج کا چھوکرا نہیں تو زیادہ
سے زیادہ سول سیکرٹریٹ کا کلرک دکھائی دیتا ہے۔ عام ہندوستانیوں
کی طرح اُسے باتیں بنانے کا شوق نہیں۔ آپ اُس سے گھنٹوں باتیں
کئے جائیں۔ وہ چپ چاپ، خاموش مبہوت بنا بیٹھا رہے گا۔ یا آپ کا
جی رکھنے کے لئے کبھی کبھی مسکرا دے گا۔ اُس کی مسکراہٹ ہمیشہ ہلکی اور
نرم ہوتی ہے۔ مونالیزا کی طرح، مسکراتے مسکراتے تھک جائے گا تو تھوکنا
یا ناک صاف کرنا شروع کر دے گا۔ اُس کی ناک میں نقص ہے۔ جس کی
وجہ سے اُسے اکثر زکام کی شکایت رہتی ہے۔ "بدصورت عورتوں کے
بعد زکام ہی وہ لعنت ہے"۔ وہ کہا کرتا ہے "جس سے میں عمر بھر پیچھا
نہیں چھڑا سکا"۔ مسکراہٹ کے علاوہ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب
قسم کا حزن و ملال ہے۔ ایک قسم کی ازلی و ابدی حسرت جو میں نے

[1] چونکہ اب دیوکا رانی نے امامت چھوڑ کر نمازی بننا قبول کر لیا ہے۔ اس لئے (شاید) کرشن چندر کو اب اپنا امام آپ ہی بننا پڑیگا۔ (ادارہ)

کشمیری بچوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے

اُس سے ملنے کے بعد —— ہر سمجھدار شخص کو یہ شک گزرتا ہے کہ وُہ افسانے خود نہیں لکھتا بلکہ کسی سے لکھواتا ہے۔ دراصل جلوت کا کرشن چندر خلوت کے کرشن چندر سے بالکل مختلف ہے۔ جلوت میں وُہ تکلف اور سنجیدگی کا نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ صرف بے تکلف دوستوں کی محفل میں کھلتا ہے اور جب کھلتا ہے تو امریکن پراپیگنڈے کی طرح "بے پناہ" ہو کر کھلتا ہے اور اُسی وقت اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وُہ دلچسپ چوٹیں کر سکتا ہے۔ قہقہے لگا سکتا ہے۔ نشاۃین کے جھگڑے چکا سکتا ہے اور دل کے پھپھولوں اور سینہ کے داغوں کی نمائش بھی کر سکتا ہے۔ نفاست پسندی اُس کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ وُہ کبھی معمولی کپڑے نہیں پہنتا۔ رذیل ہوٹل میں قیام نہیں کرتا معمولی درجے میں سفر نہیں کرتا اور گھٹیا قسم کی نثر نہیں لکھتا اور اکثر کہتا ہے "وُہ نثر ہی کیا جس کے ہر فقرہ میں مزاح کی چاشنی یا شعریت کی رنگینی نہ ہو۔" اُس کی زندگی کا کوئی اصول ہے تو وُہ ہے "سمجھوتہ"۔ وُہ مہاتما گاندھی کی طرح قدم قدم پر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہے۔ وُہ اُن ادبا سے آنِ واحد میں سمجھوتہ کر لیتا ہے جنہیں ساری عمر کوستا رہا ہے۔ وُہ اُن رشتہ داروں کے ناز اُٹھانے کے لئے فوراً تیار ہو جاتا ہے جو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وُہ اُس ہنسی سے بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے جو رونے سے مشابہت رکھتی ہے۔ چند آدمیوں سے اُسے ازلی بیر ہے۔ مثلاً پنڈت، لالے۔ للائنیں۔ بدصورت عورتیں۔ اگر اُس کا بس چلے تو اُنہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے لیکن اُس کا بس نہیں چلتا اور وُہ اُن سے بھی سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب وُہ سرینگر کے بازاروں میں للائنوں کو دہی کے بڑے اور بیسن کے پکوڑے کھاتے ہوئے دیکھتا ہے تو غصہ سے چیخ اُٹھتا ہے "سالیاں چار سو میل کا سفر اس نعمت کو چکھنے کے لئے کرتی ہیں"۔

کرشن چندر طفلِ مکتب اور فلسفی کا دلچسپ مرکب ہے۔ لذیذ کھانا دیکھ کر بچوں کی طرح چٹخارے لینے لگتا ہے۔ ہمسایوں کو ڈرانے کے لئے پہلگام میں آدھی رات کے وقت منہ میں اُنگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجاتا ہے۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ "ایم اے" کا دُمچھلا لگاتا ہے۔ اس کا فلسفہ لینن اور شیلی کے فلسفہ کا امتزاج ہے۔ وُہ پرانے نظام کو دھماکہ سے پھٹنے والے بم سے اس طرح اڑا دینا چاہتا ہے کہ مزہ آ جائے۔ "کائنات کو مٹھی میں اس طرح بھینچنا چاہتا ہے کہ چُرمُر ہو جائے"۔ اُسے طبقاتی نظام سے نفرت ہے۔ لاری میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے لیکن سیٹ پر بیٹھتے ہی سوچنے لگتا ہے کہ انسان نے ہر جگہ پہلا، دوسرا، تیسرا درجہ کیوں بنا رکھا ہے۔ جماعت بندی ہمیشہ اُس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ کشمیری ہاتوؤں کو صاحب لوگوں کے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھ کر اُس کا خون اُبلنے لگتا ہے اور جب وُہ کشمیر سے متعلق رندی اور ہوسناکی کی داستانیں سنتا ہے تو سرد آہ بھر کر کہتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ اس جنت میں فقط حور و غلمان کی تلاش کرنے آتے ہیں"۔

کشمیر سے اُسے والہانہ عشق ہے لیکن وُہ کاشمیری نہیں وُہ صرف اسی نسبت سے کاشمیری ہے جس نسبت سے لاہوری۔ دہلوی لکھنوی۔ یو۔ پی یا بمبے وی ہے۔ وُہ نہ کشمیری بول سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن کشمیری زبان سُن کر اُس کا دل مسرت سے اُچھلنے لگتا ہے۔ "کتنے شیریں بول ہیں کشمیری زبان کے"۔ وُہ حیرت سے ہاتوؤں کے مُنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

کرشن چندر اچھے افسانے تب لکھتا ہے جب پانی برس رہا ہو، جب وُہ کسی "لالہ رُخ" کے کاشانے میں جلوہ افروز ہو۔ جب اُسے پیسوں کی سخت ضرورت ہو۔ وُہ عموماً ایک نشست میں افسانہ لکھ لیتا ہے اور لکھتے وقت بہت کم الفاظ کاٹتا ہے۔ بیشتر اُس کا نقشِ اول ہی نقشِ آخر ثابت ہوتا ہے۔ بسا اوقات اُس کے افسانوں کی بنیاد کوئی ذاتی حادثہ یا سانحہ ہوتا ہے۔ اُسے زندگی میں کافی حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک دفعہ یرقان میں سخت مبتلا ہوا۔ دو دفعہ باؤلے کتے نے کاٹ کھایا۔ ایک بار کالج سے بھاگ گیا اور ہنگلی کے پل میں پناہ گزین ہوا۔ ایک دفعہ پولیس کے ڈر سے چھت پر سے چھلانگ لگا دی اور متعدد بار حسین لڑکیوں سے اس لئے شادی نہ کر سکا کہ اُس کے پاس موٹر کار نہ تھی۔ موٹر کار کو وُہ نہایت کام کی

چیز سمجھتا ہے۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص سیاست یا عشق میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے پاس موٹر کار نہ ہو۔

پرائیویٹ زندگی میں کرشن چندر شمع خاموش ہے جس نے یہ سمجھ کر کہ صرف چیخنے سے اندھیرا دور نہیں ہوتا۔ ہر رنگ میں جلنا منظور کر لیا ہے۔ اپنے افسانوں میں وُہ اُس فرشتے کی طرح چلاّتا ہے جو عرش سے اُڑ کر زمین پر اُترے اور حضرتِ انسان کی خباثت، کمینگی اور بربریت کو دیکھ کر غم و غصہ سے بلبلا اُٹھے۔ انگریزی شاعر شیلی کی طرح وُہ ہمیشہ آنے والی حسین دُنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ ایک ایسی دُنیا جس میں نوجوان لڑکیاں وحشی ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھریں۔ مرد دیوتا نظر آئیں اور ہر عورت ہیلن او ٹرائے اور ہر محبوبہ کلیو پیٹرا بنی ہوئی ہو۔ لیکن جب زندگی میں اُسے یہ چیزیں نہیں ملتیں تو اُن کھلونوں سے دل بہلاتا ہے جو ایامِ طفلی سے اُس کی تسکین کا باعث بنتے رہے ہیں۔ یعنی ایک عدد موٹر کار۔ چند احباب۔ ایک درجن اچھی کتابیں اور لذیذ کھانا پکانے والی معمولی خد و خال کی بیوی!

علی عباس حسینی

میخانہ

کلکتہ کی مشہور سڑک ہریسن روڈ پر ایک سر بفلک عمارت کے بالائی حصے میں سیٹھ نتھومل اپنے چشم و چراغ چینومل کو کاروبار کے کچھ خاص گُر بتا رہے تھے۔

سیٹھ صاحب کے لباس کی وضع، چہرے کی قطع، توند کا گھیر، باتوں کا ہیر پھیر، غرض سارا ظاہر خاص مارواڑی تھا مگر ڈرائینگ روم کا سامان کوچ کرسیاں، صوفے قالین، سنگِ مرمر کے بُت، نیم عُریاں جنگلی تصویریں اور ریشمی پھولدار ہلکے رنگ کے پردے اس ملمع کا پتہ دیتے تھے جو ہر ہندوستانی سرمایہ دار پر مغرب پرستی نے چڑھا دیا ہے۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سڑک پر "بلیک آوٹ" تھا۔ ٹریم گاڑیاں اور بسیں بند ہو چکی تھیں ٹیکسیاں اور فوجی لاریاں خال خال چلتی تھیں۔ فضا پر ایک غنودگی اور ایک سکوت کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی، بالکل ویسی ہی جیسی اندھیری راتوں میں قبروں اور مرگھٹوں میں محسوس ہوتی ہے۔ اس مرگ بدوش سکوت کو دو آوازیں بار بار توڑتی تھیں۔ ایک تو سڑک پر تڑپتے ہوئے قحط زدہ بھوکوں کی چیخ، دوسری پُرشباب "بُہو" کے گراموفون پر بجتے ہوئے ریکارڈوں کی صدا۔

چینومل نے بیوی کے کمرے سے کسی خوش گلو کو "پیا ملن کی آس" بار بار کہتے سُنا اور اس "پکار" پر اس کا لبیک کہنے کو بیساختہ جی چاہنے لگا۔ اُس نے اُس دن کی سٹے کی داستان جلدی جلدی ختم کی اور وہ صوفے سے اٹھ کر لب فرش تک آیا۔ وہ کسی آس والی کو بے آس نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہیزم خشک، بڑے سیٹھ کو ایسی جذباتی باتوں سے کیا مطلب تھا۔ اُن کا معشوق تو صرف روپیہ تھا۔ اُن کی زندگی کا آسرا تو وہی تھا انہوں نے ہلکے ہلکے کھانس کر چینومل کی توجہ اپنی طرف پھر مبذول کی انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے پوچھا۔

"تمہارے نئے کام کا کیا حال ہے؟"

"کونسا؟"

"وہی آشرم والا" اور وہ میمونی انداز سے ہنسے

"جی کل ساٹھ ہزار پانچ سو ساڑھے گیارہ آنے آج تک اُٹھے ہیں اور ایک لاکھ پچپن ہزار تین سو سوا چودہ آنے وصول ہوتے ہیں"۔ اُس کی آواز میں ایک ہلکا سا تفاخر تھا۔ "پتا جی بھی کیا کہیں گے کہ اُن کا چینو کتنا اچھا حساب کتاب رکھتا ہے۔"

بڑے سیٹھ نے مُنہ بنایا۔ وہ بولے۔ "بس! لگ بھگ تین گُنا فائدہ ہوا!" ان کا انداز صاف کہتا تھا۔ "ان لونڈوں کو ابھی ٹھیک طور پر بیوپار نہیں آتا"؟

چینومل کی ساری اکڑ نکل گئی۔ اُس نے دفاع میں کہنا شروع کیا "میں کیا کروں، سوائے سندھ اور پنجاب کے اس مال کی کہیں کھپت نہیں اور وہاں تک پہنچانے میں بڑا خرچ بیٹھتا ہے۔ پھر بیچ والے آدھا سا جھا کر لیتے ہیں۔ اس پر جگہ جگہ پر گھوس۔ دام کا ایک چوتھائی مشکل سے بچت میں آتا ہے"۔ لب و لہجہ میں اس حد کی غصہ بھری شکایت تھی جیسے اس پاک کمائی میں اس کے سوا کسی کو حصہ پانے کا حق ہی نہ تھا

"پھر بہار اور یو پی کیوں نہیں بھیجتے"؟

"جی بہار میں تو آپ ہی ہلکا سا کال ہے۔ وہاں بھی تو اپنا آشرم ہے"۔

"اور یو پی؟"

"جی وہاں سدا سے تیرتھ استھانوں پر اس طرح کے آشرم کھلے ہوئے ہیں۔ پھر پنڈے بدیسیوں کو دھنسنے نہیں دیتے"!

"تو پھر ترائی میں نکاسی کی فکر کی ہوتی"! بوڑھا بنوٹیا بچے کو گھاتیں اور چوٹیں بتاتا جاتا تھا۔

مگر چینومل انیلا نہ تھا۔ وہ سیانا کوا بن چکا تھا۔ بولا "جی وہاں پیسہ کہاں؟ وہ تو اسی لئے ساجھے کی ہانڈی ہی میں کھا لیتے ہیں!"

"پھر اب کیا کروگے، بڑی پکڑ دھکڑ ہے، کڑا فوجی انتظام ہے"۔

چپنومل آنکھیں نچا کے بولا "جی اب باہر مال نہ جائے گا، اسی جگہ کھپت ہو جائے گی"۔

"وہ کیسے؟" استاد کے ذہن میں بھی یہ پیچ نہ آیا تھا۔

شاگرد مُنہ سکھا کر بولا "آخر ہمارے ہندوستانی سپاہی اپنا دیس گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان کی تفریح کا سامان کرنا بھی تو کلکتہ والوں کا فرض ہے!"

دونوں باپ بیٹے کھلکھلا کر ہنسے۔ ساتھ ہی سڑک سے ایک درد بھری چیخ کے ساتھ آواز آئی "ہائے میری بچی، مٹھی بھر اناج کے لئے مر گئی!"

ادھر بہو کے گراموفون نے ایک نیا گانا چھیڑا "پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے"۔ —— چپنومل کی آنکھوں میں سرخ شراب کی ایک ٹیڑھی ترچھی لکیر پھر گئی —— کس غضب کی آنکھیں تھیں آشرم والی اس رادھکا کی، سیاہ پتلیوں کے گرد لال لال ڈورے! آنکھ بھر کر دیکھ لے تو آدمی بے پیے بدمست ہو جائے۔ لیکن کتنی سوکھ گئی تھی وہ فاقہ کرتے کرتے! بالکل ہرنی کی آنکھیں، مگر اسی کا سا خالص ہڈیوں کا چہرہ! پورے تین ہفتے کی دوا اور غذا کے بعد تو اس کی سوکھی ہڈیوں میں ذرا سی تری اور نرمی پیدا ہوئی تھی۔ پھر جب چپنو نے اسے اپنے اصول اور اس کی مرضی کے خلاف پہلی دفعہ اپنایا تو اس نے بے بسی کے غصہ میں اپنے ہونٹوں کو کس کس طرح چبا ڈالا تھا اور جب فتح سے سرخرو سیٹھ نے اُسے سب کچھ بھول جانے کے لئے شراب پلانا چاہی تو اس نے جھنجلاہٹ میں کیسی لات ماری تھی کہ سرخ شراب کی بوتل لڑھک کر فرش کو گلنار کرتی دور تک چلی گئی تھی۔ شراب اور خون! "پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے!" نہ جانے کس کے ہاتھ بکی، کہاں گئی غریب! . . . . .

چپنومل کے خیالات کا سلسلہ بڑے سیٹھ نے توڑا۔ وہ چڈے کھجاتے ہوئے بولے "تمہارے ان آشرموں سے تو میرے خیراتی اڈے ہی اچھے رہے"۔

"وہ کیسے؟" چپنومل اپنے کو باپ سے کچھ اچھا ہی بیوپاری سمجھتا تھا۔

"واہ، چاول اڈوں پر سامنے سڑک پر تو بھوکوں کو آٹا بٹتا تھا اور ادھر پیچھے گلی میں اچھا اناج مُنہ مانگے داموں بکتا تھا"۔ وہ اس طرح بے ڈھنگے پن سے ہنسا کہ مصنوعی دانتوں کا چوکا جگہ سے کھسک گیا۔ اُس نے جلدی سے ہاتھوں کے سہارے اُسے ٹھیک کیا۔

"اور چار من آٹا جو روزانہ مفت بانٹنا پڑا۔ وہ اس مہنگی کے سمے کس بھاؤ بکتا؟" چپنومل پسپائی میں بھی لڑائی جاری رکھنے کا ڈھب سیکھ گیا تھا۔

"اُنہہ! بچے ہو! وہ تو کب کا خراب ہو چکا تھا، میں نے جوار بسوا کے اس میں ملا دی، نہیں تو اُسے گائیں بھینسیں بھی نہ پوچھتیں!"

"پھر بھی کافی خرچ ہوا ہوگا"! اب بھی وہ یقین کرنے کو آمادہ نہ تھا کہ بوڑھا بھی اس جوان رعنا سے بازی لے گیا۔

"پر اسی کی وجہ سے ایک کے دس وصول ہوئے۔ جس کو غرض تھی اُس نے پورے روپئے کے پاؤ ڈیڑھ پاؤ چاول لئے"!

"کل کتنا خرچ ہوا ہوگا"! لب و لہجہ کہتا تھا۔ اب کچھ کچھ یقین آچلا ہے۔

"سڑا ہوا آٹا آج سے تین برس پہلے کا پندرہ ہزار کا تھا۔ دو ہزار اس کے سود کے مانو، تین ہزار کی اس میں جوار ملائی۔ کوئی تین ہی ہزار آدمیوں پر خرچ ہوئے۔ دس ہزار کے قریب گھوس میں اُٹھے۔ بس یہی سمجھو کہ کوئی تیس ہزار خیرات میں اُٹھا"۔

"اور ادھر سے کیا ملا"؟ اب استعجاب میں خوشی کی بھی جھلک تھی یہ ساری کمائی اسی اکیلے کو تو ملے گی!

"پانچ لاکھ کا اصل مال تھا، تیس لاکھ پینتیس ہزار ملے، بس سمجھو تیس لاکھ صاف نکلے"!

چھوٹا سیٹھ اچک پڑا۔ "چھ گنا فائدہ"!

بڑا سیٹھ زانو پر ہاتھ مار کر ہنسا "اور دان پن کے لئے نام گھاتے میں"۔

دونوں کے قہقہے سنگ مرمر کی میز پر رکھے ہوئے بوتل کے لمبے سرخ شیشے سے ٹکرائے اور ایک خاص طرح کی آواز پیدا ہوئی۔ گویا بارش کے قطرے کسی بوسیدہ چھت سے چھن چھن کر خالی ظرف میں گر رہے ہیں۔ ٹن! ٹن! غڑاپ!

اور اُدھر بھولی بہو کے کمرے میں زہرہ بائی اب بھی گائے جا رہی تھی۔

"پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے"!

مخمور جالندھری

نیلیں چہرے

"فروغِ آفتاب ـــــ اُن گرم ہونٹوں کا تبسّم ہے
ابھی تک جن سے اُٹھتی ہوں مسلسل لمس کی آنچیں
ہوا کے مست جھونکے ہیں مئے گلرنگ کے چھینٹے
اُبلتا ریزۂ جامِ فلک ہے دھوپ جاڑے کی
چمکتی صبح ـــــ اور بستر میں ہو تم منجمد بیٹھے ـــــ!!
کوئی الہامِ عشرت یا کوئی پیغامِ سرمستی،
تمہیں لکھا نظر آتا نہیں زرکار کرنوں میں ـــــ؟
اِدھر دیکھیو ـــــ یہ بٹوہ رات جس نے کھُل کے قسمے کی تھی
اُسے پھر بھر کے لایا ہوں خداوندانِ نعمت سے
یہ نیلے نیلے کیا ہیں سات ـــــ اذنِ بادۂ و نغمہ ـــــ!!
نہ پوچھو، کس طرح، کیونکر ـــــ ہوا ممکن حصول اُن کا
بڑی محنت سے ملتے ہیں، ریا کے جال بچھتے ہیں
مری محبوبہ، ہمیری دلربا، یعنی مری بیوی ـــــ!!
بہن کے بیاہ میں نذرانہ لے کر میکے جائے گی
بچائے تھے روپے کچھ اُس نے ـــــ اُن کو لے کر آیا ہوں
مگر میں بلبس کی ساری کو ستّر کی بتاؤں گا ـــــ
ہماری بیویاں بھی کتنی سیدھی سادی ہوتی ہیں
غریب ـــــ انوارِ مشرق کی طرح پاکیزہ ہوتی ہیں
ادا، شوخی، شرارت اور ضد ـــــ فطرت ہے عورت کی
وہ عورت ـــــ ارضِ مغرب کا مقدر ہے مگر، ہمدم!
اُٹھو، جلدی کرو ـــــ میں اور بھی پروانے لاتا ہوں
اُنہیں پیغام دیتا ہوں کسی شمعِ فروزاں کا ـــــ!!
ابھی لو ـــــ سب کے سب آئے سنوارے اپنے پَر پُرزے"

"ممل" کے جاتے ہی یاد آئے اس کے پاؤں کے بندھن
"ممل" کا گھر اُسے زرّیں قفس، اجڑی جناں کہہ لو
جہاں یہ ربت ہے ـــــ خرچ آٹھواں حصّہ ہو آمد کا
جہاں دولت بہا کرتی ہے شادی پر، عمارت پر
مکاں دیکھو ـــــ تو اُس کے رنگ و روغن سے نظر پھسلے
مگر اندر غلاظت ہے، تعفّن ہے، کثافت ہے
گلے میں، بانہوں میں پہنے ہوئے ہیں دیویاں گہنے
بدن پر اُن کے لیکن چیتھڑے ہیں ـــــ میل کے تودے ـــــ!!
گیارہ سال کے، دس سال کے بچے ہیں، ننگے ہیں۔
یہاں معیارِ ہستی میں کوئی ہلچل نہیں ہوتی
یہاں جہدِ ترقی ہے، نہ رفعت کی تگ و دو ہے،
یہاں اک کشمکش بڑھتا چلے میزان کھاتے کا
یہاں آسودگی ہے اور وہ آسودگی کیا ہے
مہینے میں وہ آئیں ساٹھ کی، ستّر کی آتی ہیں
مگر اک وقت کا پکا ہوا دو وقت کھاتے ہیں
یہاں پیاز اور ادرک بھی نہیں ہوتا ہے سبزی میں
روایاتِ مقدّس سے یہاں کتنی عقیدت ہے
یہاں مذہب کی پابندی ہے کھانے اور پینے میں ـــــ

ممل کی تیرہ بختی اور کیا اس کے سوا ہو گی
بچارے نے کثافت کے محل میں آنکھ کھولی ہے
ابھی چھ سال ہی کا تھا کہ اُس کی ماں ـــــ وہاں پہنچی
کوئی رختِ سفر ہوتا نہیں ہے جس مسافت میں
گئی ماں ـــــ ہو گیا بند آدلیں ایوانِ تربیت

بچا رہے کا ہوا خشک آولیں سرچشمۂ شفقت ——!!
جواں ماں آئی —— اپنے ساتھ لائی ظلم کی کثرت
اثر اُس سانحہ دردوالم کا اب بھی ہے اُس پر
ہوا کرتی ہے موٹی، بھدّی عورت انتخاب اُس کا
ڈرا کرتا ہے اب بھی وُہ جواں اور دُبلی عورت سے

بمل —— بھولا بمل ——!! اس محبسِ زریں کا پروردہ
یہی دو سال گذرے اس صنم خانے اک بُت تھا
وُہی عادت، وہی فطرت، وہی صورت، وہی ہیئت
وُہی ناقابلِ برداشت سا اک بوجھ کندھوں پر
دباؤ —— کی بدولت ہی بچسارا پست قامت ہے
دباؤ کی وُہ شدت تھی کہ جب پہلے پہل اُس نے
مرے ساتھ ایک ہوٹل میں جوانی کو قریں پایا
(جوانی کیسی —— جو تھی فارغ التحصیل عشووں میں)
جھلک اُٹھی تھیں خفت کی لکیریں اُس کے ماتھے پر
نگاہیں جھک گئی تھیں گر گئی تھیں اُس کے قدموں میں
دیئے روشن ہوئے تھے اُس کے گالوں کے گلابوں میں
"جوانی" کو اُسے چھونے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی
عیاں تھی حُسن پر ناپختگی اپنے شکاری کی
جوانی بھی ہزاروں دے چکی تھی درس عشرت کے
یہ قحبہ خانے —— کتنی سستی جنسی درسگاہیں ہیں ——!!

بمل —— باغی بمل ——!! ہے شدتِ احساس کا گھائل
نکلنا چاہتا ہے توڑ کر زریں قفس اپنا
قدامت کا مگر جادو کبھی ٹوٹا ہے اک پل میں —— ؟
بغاوت کامراں ہوتی ہے کب پہلی ہی یورش میں
بمل تو آج بھی اپنے صنم خانے کا اک بُت ہے ——!!
وہی عادت، وہی فطرت، وہی صورت، وہی ہیئت ——!!
چلا ممکن نہیں شاید کبھی انساں کی فطرت پر
بمل پر آج بھی غالب ہے حفظِ نفس کا ارماں
وُہ رہتا ہے الگ ہی دوستوں سے وقت پڑنے پر
بجا ہے دوستوں کے ساتھ مرنا عید ہوتی ہے
وُہ ان اقوالِ زریں کا مگر قائل نہیں ہوتا
وُہ صرف اس واسطے ساتھ آتا ہے یارانِ محفل کے
کہ تنہا عیش کی جرأت کبھی کر ہی نہیں سکتا
نہ جانے زیست کیوں مرہونِ منت ہے سہارے کی
مگر اک جامِ مے —— اُبلا ہوا لاوا شجاعت کا
رگوں میں اُس کی، بھر ہی دیتا ہے اک جوش —— بیخوفی
بمل کو نشے میں چاہو تو ٹکرا دو چٹانوں سے
جوانی بھی تو نشہ ہے جنوں ہے آرزوؤں کا ——
یقیں ہے اتنا مجھ کو نشے میں اک دن اگر بپھرا
تو وُہ اپنے صنم خانے کے حق میں غزنوی ہوگا

(۲)

"بڑی اُلجھن میں ہوں کتنے ہی مجھکو کام کرنے تھے
مجھے سیبوں کے ٹھیکے کے لئے افسر سے ملنا تھا
ابھی دینا ہے اُس کی میم کو وسکی کی بوتل بھی ——
بڑی مشکل میں ہوں —— رُکتا ہوں تو ٹھیکہ نہیں ملتا
اگر جاتا ہوں —— مخلص دوست سب ناراض ہوتے ہیں
چلو چھوڑو —— بمل پہنچا تو میں فوراً چلا آیا" ——
مجھے کلدیپ کی باتوں پہ آتی ہے ہنسی اکثر
کہ اُن میں نفسِ مضموں سے بڑی تمہید ہوتی ہے
ہمیشہ دوسروں کے سر پہ وُہ احسان رکھتا ہے
نہ جانے جو کوئی بھی دھوکا دیتا اور بنتا ہے
ہمیشہ دوسروں کو عقل سے عاری سمجھتا ہے
بنا دیتی ہے اس کو بھی خوشامد بیوقوف اکثر
خوشامد سے —— جو چاہو کام تم کلدیپ سے لے لو
ذرا تعریف کردو تم کبھی ایسی ہی خوبی کی
نشاں تک بھی نہ ہو موجود جس کا اُسکی فطرت میں

تمہارے راستے میں اپنی وہ آنکھیں بچھا دے گا
تصنّع جن میں ہوتا ہے، تصنّع دوست ہوتے ہیں

"کہاں تھے رات کو — ؟" تم اُس سے اتنی بات اگر پوچھو
مقامی سیٹھ کی دعوت میں شرکت اُس نے کی ہو گی
جہاں اُس نے "بلیک اینڈ وائٹ" اور شمپین پی ہو گی
جو اسٹیشن پہ اس کو اتفاقاً دیکھ پاؤ گے —
وہ دِلّی جا رہا ہو گا کوئی ٹھیکہ بڑا لینے
کھڑا ہو گا اگر وہ دوسرے درجے میں گاڑی کے
تو شملے جا رہا ہو گا کسی محبوبہ سے ملنے
نہ جانے بات کیا ہے جس قدر محبوب ہیں اُس کے
کوئی کشمیر رہتا ہے، کوئی دلی کا باسی ہے
اگر آتے ہوئے رستے میں تم کلدیپ سے پوچھو
وہ اُٹھ کر آ رہا ہو گا کسی افسر کے دفتر سے
اگر جاتے ہوئے رستے میں تم کلدیپ کو روکو
وہ گھر سے جا رہا ہو گا کسی افسر سے ملنے کو

بچارا اس قدر مرعوب ہے عہدوں سے، منصب سے
کہ اُس کی گفتگو کا ارتقا، افسر ہی ہوتے ہیں
پریزادوں سے کی ہیں اُس نے جن کی خلوتیں روشن
ہے عورت — مرد کی سب سے بڑی دلچسپ کمزوری
"پریتو" — مجکو وہ مظلوم چہرہ یاد ہے اب تک
گھنی زلفیں، گھنے ابرو، حسیں ماتھا، حسیں شانے
اُسی نے جگمگائیں افسروں کی مدھبھی راتیں
ثمر کلدیپ کو ملتا تھا لیکن اُس کی محنت کا
کہ پھل کھاتے ہیں اکثر دوسرے ہی مزد و محنت کا
کسی پر کمتری کا رنگ اتنا بھی نہ ہو گہرا
مجھے بھولا نہیں ہے اُس درخشاں رات کا قصّہ
وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا امرتسر سے اک لڑکی
جسے اُس نے بتایا تھا کہ وہ کوٹھی میں رہتا ہے
بچاری نے مگر وہ رات قبرستاں میں کاٹی تھی
وہ کہتی ہی رہی اُس سے مجھے گھر لے چلو اپنے
اُسے گھر کیسے لے آتا، مزا آتا جو لے آتا
بچارا ننگا ہو جاتا، حقیقت سامنے آتی

ملمع جو چڑھا رکھا ہے اُس نے اپنے چہرے پر
اگر اک دن وہ ہمت آشنا ہو کر اُسے دھو دے
اگر وہ خود کو ننگا دیکھنے کا حوصلہ کر لے
تو کلدیپ اور بھی مقبول ہو سکتا ہے نظروں میں

(۳)

"کہو کیسے ہو، چپ بیٹھے ہو، اچھے تو ہو تم دونوں — ؟
ابھی اخبار میں پڑھ کر ہٹا ہی تھا — کمل پہنچا
بہت خوش تھا — کہیں دیکھا ہے کوئی جلوۂ رنگیں
ادھر اتنے دنوں سے زندگی بے کیف، افسردہ
گذرتی تھی — یہ مژدہ دعوتِ کوثر سے کیا کم ہے"

"انل دت" — کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا
مواقع جب میسّر ہوں تو پھر وہ رائیگاں کیوں ہوں
"انل دت" جانتا ہے اپنے ہر اک سانس کی قیمت
بسا لیتا ہے وہ بے رنگ لمحوں میں بھی خوشبوئیں
"مرادیں حسب نیت ملتی ہیں" — یہ سنتے آئے ہیں
مثل — تنہا انل دت پر ہی لیکن صادق آتی ہے
کہ اُس کی شہر میں ہے موٹے بنیوں سے شناسائی
ہوا کرتے ہیں موٹے استوار اقدام سے عاری
بہت آساں ہے دھارے موڑ دینا اُن کی عادت کے
انل دت کے وہ آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں
انل دت کے خیال — اشلوک ہو جاتے ہیں گیتا کے
انل دت کے بغیر اُن کی کوئی تقریب عشرت کی

فروزاں ہو نہیں سکتی، درخشاں ہو نہیں سکتی
انل وت کی لذیذ و گرم باتیں مول بکتی ہیں
ہزاروں ایسے بھی انسان اس دنیا میں بستے ہیں
نہ جن کے راستے کوئی، نہ جن کی منزلیں کوئی
ضرورت ہر قدم پر راہبر کی جن کو پڑتی ہے
انل وت ایسے ہی گمراہ انسانوں کا رہبر ہے
کوئی کشمیر جائے یا کوئی دلی کا عازم ہو
انل وت ——— اُس کے ہی مصرف پر اُس کیساتھ جائیگا
انل وت ——— اپنے ہر خط میں یہ پہلی سطر لکھتا ہے
"یہاں انبالے میں "جگ" کیساتھ ہوں پنجاب ہوٹل میں"
"کراچی سے میں لکھتا ہوں تمہیں کشمیر ہوٹل سے
مرے ساتھ آتے ہیں لالہ ہزاری لعل سوداگر"

مجھے رشک آتا ہے اکثر انل دت کے مقدر پر
مجھے وُہ دن نہیں بھولا وُہ لمحے یاد ہیں مجھکو
جب آیا تھا وُہ میرے پاس آنکھوں میں چمک لے کر
"چلو گے ——— جا رہا ہوں اگلے ہفتے سیرِ دُنیا کو ——— ؟
کروڑی مل مجھے لے جا رہے ہیں ——— تم تو واقف ہو
خدا حافظ، چلوں۔ اک سال کے بعد آکے مل دونگا"
وُہ اُس کی گفتگو تھی یا مرے دل کے لئے نشتر
وُہ اپنے ساتھ لایا تھا حسیں مغرب کے افسانے
فسانے ——— حُسن کے، رنگینیوں کے، عیش زاروں کے
وُہ افسانے سُناتا اور ہم اس سوچ میں رہتے
انل دت آدمِ ثانی ہے اور جنت سے آیا ہے ———

انل وت ——— سوچتا رہتا ہوں میں خوش بخت ہے کتنا
یہی جاڑے کے دن تھے، برف کا طوفان برپا تھا
جہاں بھی، ہم گئے اور جا کے دروازوں پہ دستک دی
کھڑے پایا وہیں مایوسیوں کو، نامرادی کو

انل دت کے مگر کہنے سے اک ہوٹل میں جا بیٹھے
وہاں بھی کھیلتی تھی برف زاروں کی سی ویرانی
نہ غنچے تھے، نہ کلیاں تھیں، نہ زلفیں تھیں، نہ ساغر تھے
مگر ہوٹل کا مالک ——— نو شگفتہ ایک غنچہ تھا
انل دت نے اُسے دیکھا، نگاہوں سے اُسے پرکھا
نہ جانے اُس سے کیا باتیں ہوئیں اور کیا کہا اُس سے
ہمارے سامنے کی بات ہے دو تین لمحوں میں
انل دَت ——— اُس کو پہلو میں لئے تھا، مسکراتا تھا

انل وت کے بہت سے شوق ہیں اُن میں سے اک یہ ہے
کیا کرتا ہے اپنے دوستوں پر برتری وارد ———
تمہیں وُہ گھر بُلائے گا، تمہیں چائے پلائے گا
مُراد اُس کی مگر اس سے تواضع تو نہیں ہوتی
تمہیں چائے پلاتا ہے کہ تم مرعوب ہو جاؤ
نفاست سے، حسیں ٹی سیٹ سے، کمرے کی سجاوٹ سے

انل وت اب بھی یوں بیٹھا ہے میرے سامنے جیسے
فلک پر ہو مقام اُس کا زمیں پر سجدہ سا ہوں میں

(۴)

"ہمل کے حکم سے تھیلے میں پریاں بھر کے لایا ہوں
ابھی تھیلے میں ہیں جی چاہتا ہے شعر کہنے کو
سُنو میں دیکھ کر آیا ہوں رستے میں وُہ نظارہ ———!
ابھی تک میری آنکھوں میں جو رقصاں ہے درخشاں ہے
بڑے برگد کی لمبی لمبی داڑھی کے اندھیرے میں
کھڑا تھا لے کے خالد اپنا "پالش مارکہ" دلبر
چھپا رکھا تھا چہرہ اُس نے یوں آغوش میں اُس کی
کہ جیسے بچہ کھیلے گود میں اک حبشن آیا کی
نہ جانے یہ مقولہ، یہ مثل سچی کہاں تک ہے
"محبت خوبصورت، خوبرو اشیا سے ممکن ہے"

کبھی دیکھا ہے گھلتے ملتے اک گورے کو کالے سے
جو سچ پوچھو تو خالد ہے مبارکباد کے قابل
طلسمِ رنگ جس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دکھایا ہے"

یقیناً "بنجمن" سے مل کے بیحد آپ خوش ہوں گے
تضاد — اُس کی طبیعت کا، یہی کردار ہے اُس کا
حقیقت میں مرکب ہے وہ سونے اور پیتل کا
بڑا ہی برق فطرت، زود رنج اور زود مقصد ہے
وُہ بادل ہے جو چھاتا ہے، گرجتا ہے، برستا ہے
بہا دیتا ہے، بہہ جاتا ہے وُہ ایسا تلاطم ہے
وُہ رُکنے کا، ٹھہرنے کا نہیں قائل رواں ہو کر

وُہ رُکنے کا، ٹھہرنے کا نہیں قائل رواں ہو کر
اُسے کہدو — کہ ہوگا آج شغلِ بادہ و شاہد
کہیں سے لائے خالی جیب اپنی بھر کے لائے گا
مقامِ وعدہ پر احباب سے پہلے ہی آ جائے گا
لبِ ساغر جو چھو جائے گا اک بار اُس کے ہونٹوں سے
وُہ مدہوشی کی، بدمستی کی حد تک پی کے اُٹھے گا

بڑا ہی زود فطرت، زود رنج اور زود ارادہ ہے
وُہ جب بھی نشے میں ہوگا، ہنسے گا، مسکرائے گا
وُہ گرد و پیش دیکھے گا، یہی اُس وقت چاہے گا
کہ کر دے دوستوں میں سے کوئی گانے کی فرمائش
کھڑا ہو جائے گا مخصوص لَے میں گیت گائے گا
غزل ہو، گیت ہو، ٹھمری ہو — اک ہی لَے میں گاتا ہے
نہ جانے اس قدر وُہ گیت کیوں مرغوب ہے اسکو
کہ ہے پنجاب کے دیہات کا دل جس کی تانوں میں
وُہ جس میں موٹی اور اک تیلی دوشیزہ کا قصہ ہے
جھُجھکے گا، مسکرائے گا، نظر سے داد چاہے گا

ابھی بیٹھے گا — گا کر جانے کیا یاد آئے گا اس کو
وُہ رونے لگ پڑے گا ہچکیاں بندھ جائیں گی اُس کی
غلط ہے جامِ مے میں خود فراموشی کا جادو ہے
ہر ایک انسان غمگیں، غمزدہ، غم دوست ہے کتنا
ذرا سی ٹھیس سے دکھوں کے سوتے پھُوٹ بہتے ہیں
نہ جانے کونسا غم ہے جو اُس کے قلبِ مضطر میں
ہوا ہے جاگزیں جاوید بنکر، جاوداں ہو کر
سبب پوچھو گے اُس سے تو یہی ہوگا جواب اُس کا
کہ اُس کے دوستوں کو اُس سے مُنہ دیکھے کی الفت ہے
محبت بھی طلبگارِ محبت ہے حقیقت میں —

وُہ بادل ہے جو چھاتا ہے، گرجتا ہے، برستا ہے
فریب اور بنجمن کھا جائے دشوار اور ناممکن
بڑا ہی ماہرِ فن ہے وُہ عورت کے خصائل کا
کیا کرتا ہے حسب حال حیرت خیز اداکاری
"چمیلی" — پتلی پتلی، دبلی دبلی یاد ہے بلّی —!!
جسے لطف آتا تھا غمزوں سے مردوں کے بنانے میں
اداؤں ہی سے جن کی بھُوک کی تسکین کر دیتی
خبر کیا تھی اُسے آج اُس کا جو مدِ مقابل ہے
بڑا ہی فتنہ گر، فتنہ ادا اور فتنہ ساماں ہے
بچاری سے نہ جب کچھ بن پڑا تو رو پڑی آخر —
وُہ جتنا چیخی، بپھری، بنجمن اُتنا ہی چلّایا
ریاکاری کو چھوڑا اور بچاری نے سپر ڈالی
وُہ ہنستے مسکراتے دونوں پھر کمرے سے نکلے تھے

(۵)

"مجھے حسرت ہی قدرِ وقت سے بیگانہ سب کیوں ہیں
مثل ہے "وقت ہی دولت ہے" — ان کو لاکھ سمجھاؤ
مگر — وقتِ معیّن پر کبھی گھر سے نہ آئیں گے
ہمیں ہی — کرنا پڑتا ہے ہمیشہ انتظار ان کا —"

سعید ـــــ اُس کا وہ چہرہ، اُس کی وُہ معصوم جھنجلاہٹ ـــــ!!
کوئی تندی، کوئی غصّے کی چنگاری نہیں رکھتی
سکوں ہی ـــــ اُس نے سیکھا ہے حوادث کے تھپیڑوں سے
مگر اُس کی حیات اک جنگ ہے، رزمِ مسلسل ہے
اک ایسی جنگ بچپن میں ہوئی تھی ابتدا جس کی

ہمارے گھر ـــــ یہ اینٹوں، لکڑیوں کی چار دیواریں
انہیں جو غور سے دیکھو تو چھوٹی سی ریاستیں ہیں
جہاں فرمانرواؤں سے ہیں اطوار اپنے آبا کے
جہاں کوئی نہیں تفریق اولاد اور پرجا میں
وہی ہیبت، وہی تندی، وہی حکمت، وہی سختی ـــــ!!
سمجھتے ہیں جہاں بچوں کو اپنے، جائداد اپنی
وُہ جن کا حسبِ منشا خوب استعمال ہوتا ہے
جہاں کی جاتی ہیں سلب انفرادی قوتیں اُن کی
یہاں معمار کی اولاد بھی معمار ہوتی ہے
جسے احساس اپنی انفرادیّت کا ہوتا ہے
یہاں الزام عائد اُس پہ ہوتا ہے بغاوت کا
یہاں مسدود ہو جاتے ہیں در اُس پر اعانت کے
حکومت میں بغاوت کی سزا بھی سخت ملتی ہے
جو اپنی انفرادیّت سے کر لیتے ہیں غدّاری
یہاں ملتا ہے ان کو جانفزا منصب سعادت کا
حکومت بانٹتی ہے جیسے غداروں میں نذرانے ـــــ

کچل دیتا سعید اپنی جو روحِ انفرادیت
نہ اتنا غمزدہ ہوتا، نہ اتنا مضمحل ہوتا
نہ خارِ رہگذر بنتے کبھی یوں اُس کے گھر والے
مگر یہ بات الگ ہے، مرد نے لڑنا ہی سیکھا ہے
سعید ـــــ اُس کی حیات اک جنگ ہے، رزمِ مسلسل ہے
تمناؤں کا اپنی خون ہوتے اُس نے دیکھا ہے

کڑی تنہائیوں میں دل کو روتے اُس نے دیکھا ہے
میں اکثر سوچتا ہوں ایسے خستہ حال بسمل کو
بنایا کیوں نہیں ہے سنگدل موجِ حوادث نے ـــــ
نہ جانے آج بھی وہ موجِ کیوں ہے، نرم دل کیوں ہے
اُسے پگھلا دیا ہے الفتِ ناکام نے شاید ـــــ!!
کہ اُس کی بدنصیبی میں بھی ظالم ہاتھ پنہاں ہے
(گھروں کی سلطنت کے پُر رعونت بادشاہوں کا)
محبت کا مزہ چکھ کر بھلا دینا نہیں آساں
وُہ پھر بھی اس کو چکھتا ہے جو لذت یاب ہوتا ہے

وُہ اک مشکل سے نکلا تھا، نئی مشکل نے آ گھیرا
وُہ تصویر ـــــ ایکٹرس کی دیکھتے ہی دل لٹا بیٹھا
بچارا بن گیا موہوم افسانوں کا شہزادہ
جنہیں پاگل بنا دیتی تھیں تصویریں مصوّر کی ـــــ!!
رہا آوارہ سرگرداں بمبئی کی صاف سڑکوں پہ
تڑپتا ہی رہا اور گو ہر مقصد نہ ہاتھ آیا
تمناؤں میں دائم آگ بھر دیتی ہے محرومی
جبھی تو معتقد سچّی فلاطونی محبت کا
بنایا ہے اُسے ناکامرانی، نامرادی نے ـــــ
اب اکثر کامیابی، کامرانی کی تمنا میں
بدلتے رہتے ہیں آدرش اُس کے مستقل جامد ـــــ!!
پڑا کرتے ہیں دورے آج بھی اُس پر محبت کے

"حمیدہ" ـــــ اک طلائی دانت تھا جس کی تبسم میں
جسے رہ رہ کے ہنس ہنس کے نمایاں کرتی رہتی تھی
بڑی خوش وضع تھی، خوش پوش تھی اور خوش طبیعت تھی
مگر لبریز تھا دل اُس کا آلام و مصائب سے
میاں کی اپنے وُہ ـــــ بیوی کہاں تھی، اُس کی سوزی تھی
وُہ اپنی سخت گیری سے ڈراتا تھا بچاری کو

مگر ظلم اپنے مظلوموں پہ قبضہ رکھ نہیں سکتا
وہ آخر بھاگ نکلی تانگے والے کی معیت میں
لگائی اپنے دل پر اُس نے مرہم خود فریبی کی
سمجھتی تھی کہ پا لی ظلم سے آخر نجات اُس نے
وہ تانگے والا اُس کا پہلا شوہر تھا خصائل میں
تطابق کس قدر ہے حکمرانوں کے مزاجوں میں
سعید — اُس غم زدہ لڑکی سے کتنا پیار کرتا تھا
مثل ہے — "وقت ہی دولت ہے" اُس کا معتقد قائل
حمیدہ کو بٹھا کر سامنے دن کاٹ دیتا تھا
وہ جب بھاگی تھی عالم تھا بچارے پر قیامت کا
مصیبت اور رسوائی کی ذلت تھا فرار اُس کا
چھپا رکھا ہے ہم نے اُس کو، شک گذرا تھا یہ سب کو
محبت بیسوا کی بھی ہے، عصمت باختہ اُلفت —!!

رضیہ — صاف ستھرا رنگ، مست آنکھیں، گھنے ابرو
سعید — اُس سے ملا تو دل گنوا بیٹھا، پکار اُٹھا
"جمال اس کا مرا آدرش ہے، معیار ہے میرا" —!!
کٹی جب رات آنکھوں میں، نہ وہ وعدہ شکن آئی
سعید — اُٹھا بہت مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹا
کئی ہفتے حجامت تک نہ بنوائی بچارے نے —!!
سعید — اُس کے بھٹکتے عشق کا یہ چوتھا دورہ تھا

وہ بھاری جسم کی کملا، سلونی سانولی کملا —!!
نہ جانے بات کیا اُس میں تھی، میں حیراں ہوں ششدر ہوں
نہ جانے اُتری کیوں اُس کے بلند آدرش پر پوری
گماں یہ ہے بلند آدرش ہی اُس تک اُتر آیا
نہ بھولے گی ہمیں اُس دن کی اُس کی گریہ وزاری
کہ وہ ہنستی تھی اور یہ خون کے آنسو بہاتا تھا
سعید — اُس کے بے پیاسے عشق کا تھا پانچواں دورہ —!!

محبت میں مسلسل نامرادی کی یہ ارزانی —!!
سبب بنتی چلی جاتی ہے اُس کی کوچہ گردی کا
ہر اک دے کدہ طرب کا، عشق کا، تفریح کا جھانسہ
جہاں چاہے اُسے لے جاتا ہے وادی میں پربت پہ
کوئی اتنا بھی محروم مسرت ہو نہ عالم میں
تصوّر کا جو منت کش ہو کیف و رنگ کی خاطر
وہ خود کو مست کر لیتا ہے ساغر کے تصوّر سے
وہ سگرٹ پی کے بھی مخمور ہو جاتا ہے پل بھر میں —

یہ اُس کی تشنگی جانکاہ — لامحدود، بے پایاں
شکستوں سے اُسے ہونے نہیں دیتی سراسیمہ
اُمید اس کو ہے اب بھی سیر چشمیٔ تمنّا کی
سبب شاید یہی ہے وہ کفایت دوست ہے اتنا —
اسی اُمّید پر شاید، اسی تنہا بھروسے پر
کہ اک دن اُس کا آدرش آ گرے گا اُس کے دامن میں
وہ دولت بھی بچاتا ہے، وہ قوّت بھی بچاتا ہے
کہ اک دن کام آئے گی کفایت اور پس اندازی

وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا غرقِ تصوّر ہے
نظر ہے اُس کی شاید مرغزاروں پر، بہاروں پہ
وہ شاید دیکھتا ہے خواب "ہالی وڈ" کی جنت کا
فرانسسکو کا، پیرس کی طرب گاہوں کا، لندن کا
یقیں ہے اُس کو مغرب ہی میں بر آئیں گی اُمّیدیں
یہ اُس کی آخری اُمّید اُس کی زندگانی ہے

(۶)

"بڑا ہی سست بیٹھا تھا کہ اتنے میں بمل پہنچا
جب اُس نے یہ کہا — "دو وائٹ لیبل ہاتھ آئی ہیں"
نہ پوچھو دل پہ کیا بیتی، مری نظروں پہ کیا گذری
دکھاؤ تو کہاں ہیں — ان کو سینے سے لگاؤں گا

غضب ہے —— رنگ کیا ہے، دیکھنے سے نشہ ہوتا ہے —— !!
انہیں کونے میں رکھتا ہوں کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
بتاؤں آج کل غفار کیوں شامل نہیں ہوتا
ہوا ہوں راہ میں آتے ہوئے اس راز سے واقف
نہ پوچھو —— آج اُس کے ساتھ کیسا برق پارہ تھا
وُہ لڑکا تھا —— کہ بجلی تھا، چھلاوہ تھا، شرارہ تھا
کہاں سے جانے لے آتا ہے آئے دن نیا جلوہ ——
اگر بھولے سے کہہ بیٹھو تم اُس سے ”یہ بھی کیا لت ہے“ ——
وُہ پھر گنوائے گا اتنے فوائد اس بُری لت کے ——
کہ تم کو ہر طرح سے اُس کا قائل کر کے چھوڑیگا
کہے گا —— ”سب سے پہلے تم پہ کوئی شک نہیں کرتا
ہمارے بیٹے کا دوست آیا —— گھر والے سمجھتے ہیں“
اُسے چائے پلاتے ہیں، اُسے بسکٹ کھلاتے ہیں ——
پھر اس کو جس جگہ جی چاہے اپنے ساتھ لے جاؤ
کہو، کیا داشتہ کو ساتھ رکھ سکتا ہے یوں کوئی
بھئی کچھ بھی ہو —— بے معنی نہیں غفار کی باتیں
مگر لڑکوں کے غمزے سہنا، اُن سے دوستی رکھنا
ہے بالکل ایسے، جیسے بھینس گھر میں باندھ لے کوئی ——
میں سچ کہتا ہوں ہم سے یہ محبت تھہ نہیں سکتی —— ”

حنیف —— اُس کی بھی فطرت سینکڑوں رنگوں کا آنچل ہے
وُہ جس میں کچھ سیاہی کی لکیریں بھی نمایاں ہیں
کئی ماحول ہیں —— گذری ہے جن میں زندگی اُس کی
ابھی تک بھوک سے نالاں ہیں اُس کے پیٹ کی آنتیں
ابھی اُس کے گلے میں تشنگی کے خار چبھتے ہیں
اگر، رنگ ریا ہے اُس کی فطرت میں —— وُہ بے بس ہے
فلاکت ملگجے کردار ہی تعمیر کرتی ہے
بناوٹ ہے، شرارت ہے، تصنع ہے، نمائش ہے
یہی تو ارتقائی دور کے —— غالب محاسن ہیں

حنیف —— ان کی بدولت دیکھتا ہے اپنے قدموں پر
مسرت، فتح و نصرت، کامرانی، شوکت و عظمت
مسرت چند لمحوں کی سہی —— آخر مسرت ہے
طرب سامانیوں پر اختیارِ عارضی اُس کا
اُسے سرشار کچھ دن کے لئے تو کر ہی دیتا ہے
حقیقت میں ریاکاری بھی —— فنکاری کی حامل ہے
حنیف —— اوصاف دشمن ہی نہیں، ہے ماہرِ فن بھی
ہر اک محبوبہ —— جس کی ہمدمی کا فخر ہے اُس کو
کبھی آغاز میں اُس کی بہن تھی، اُس کی ہمشیرہ
بہن کے لفظ میں کتنا تقدس ہے کہ بے کھٹکے
ہر اک دوشیزہ کے تم بھائی بن سکتے ہو —— پھر شوہر

ہنسی آتی ہے مجکو آج ”گرٹی“ کی حماقت پر
حنیف اس کا بھی بھائی تھا —— بڑی خوش تھی بہن بنکر
اُسی بھائی کا بچہ بن چکا ہے گود کی زینت
اب اس مضمون کے خط لکھتی ہے —— اپنے پیارے بھائی کو
”لگائے رہتی ہوں سینے سے میں تیری نشانی کو“
بتاؤں —— عورتیں کیوں چاہتی ہیں جعلسازوں کو ——؟
کہ جھوٹے —— حسن کے بہتر ملمع ساز ہوتے ہیں
حنیف —— اُس کے ”گھٹیا“ سے رنگ کو انجیر کہتا تھا
اُسے انجیر جب کہتا تو ”گرٹی“ کھلکھلا پڑتی
ذرا سی تمکنت آجاتی بھدی چال میں اُس کی

فریدہ —— بھی تو اُس کے گھر میں آئی تھی بہن بن کر
بڑی ظالم ہوا کرتی ہے کالی رات ساون کی
رگوں میں جتنا جتنا تیز نشہ گھول دیتی ہے
یہ راتیں —— ہیں کہ قدرت کا اجازت نامۂ عشرت
اسی ظلمت میں دوشیزہ کو عورت بننا پڑتا ہے
اسی پردے میں بعض اوقات بنتی ہے بہن بیوی ——

حنیف ــــ اپنی پریشاں حال، اپنی نیک بیوی کو
زیادہ دیر تک کس طرح کیونکر مطمئن رکھتا
کہ راز افشا ہی ہونے کے لئے ہوتے ہیں عالم میں
حنیف اُس نے اُٹھا کر ہاتھ پر قرآن قسم کھائی
"فریدہ کا میں بھائی ہوں ــــ فریدہ ہے بہن میری"
حنیف اوصاف دشمن ہی نہیں، فن کا بھی ماہر ہے
اُسے معلوم ہے مذہب کے جادو کی ہمہ گیری
کوئی جھوٹی قسم کھا کر فنا تو ہو نہیں جاتا
قسم ــــ اور اُس کی بیوی ہوگئی تھی مطمئن کتنی ــــ!!
بچاری کا یہ اطمینان بے چاری کو لے ڈوبا
اب اک کونے میں بیٹھی، رات دن قسمت کو روتی ہے

حنیف ــ اُس کی بھی فطرت سینکڑوں رنگوں کا آنچل ہے
غرور اتنا ــــ معافی تک نہ مانگے گا حماقت پر
مجھے اک واقعہ یاد آ رہا ہے، لکھ ہی دیتا ہوں
وُہ ننھی بیسوا، وُہ شانتی جو گھر سے نکلی تھی
ارادہ باندھ کر اک لاکھ سکّے جمع کرنے کا
اُسے اپنے شباب و حسن پر کتنا بھروسہ تھا
عجیب اُس کی طبیعت تھی، عجیب اُس کی تمنّا تھی
وُہ کوٹھی چاہتی تھی ــ باغ اور موٹر کی طالب تھی
تجارت کیسی ہو ــــ آخر امارت اُس کا مقصد ہے
حنیف اُس زر پرست اُس تاجرِ خوش رنگ کی خاطر
وفا خو ــــ ہمدم دیرینہ سے دست و گریباں تھا
وُہ تسلیم آج بھی کرتا نہیں کوئی خطا اپنی

غریب اتنا ــــ کہ جس سے ربط اپنا وُہ بڑھائیگا
کئی امیدیں اُس کی ذات سے وابستہ کرے گا
اُسی کا کھائے گا ہر دم اُسی کے گیت گائے گا
ذرا سی بات پر اُس سے بگڑ بیٹھے تو فوراً ہی

اُسے پاگل بتائے گا، اُسے بدّھو بھی کہہ دے گا
"بھئی رحمٰن ــــ ارے اُس کو تو میں اُلّو بناتا تھا" ــــ
اسی جھوٹی رعونت سے وُہ خفت کو چھپائے گا۔
نمائش اس قدر ــــ گھر سے پہن آئے گا جو کپڑا ــــ!!
بھرے بازار میں ملنا محال اُس کا ہے، مشکل ہے
وُہ جس سے لایا ہے، اُس کی دکاں میں تین ہی گز تھا ــــ

وُہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے اس تکلّف سے
ابھی اُٹھے گا جیسے اور یہ اسرار کھولے گا
کہ جس کرسی پہ وُہ بیٹھا رہا تختِ سلیماں تھی ــــ!!

(۷)

"کریم اللہ سے باتیں کر رہا تھا جب میں پہنچا
کریم اللہ نے کل جس زرد رو درزی کو پیٹا تھا
سُنا ہے اُس کی حالت صبح سے ابتر ہے، نازک ہے
غلط کیوں، جانے ہر طاقت کا استعمال ہوتا ہے ــــ
زبردستی ــــ بنا دیتی ہے ناممکن کو بھی ممکن ــــ
سلیمہ بھی تو اُس نے کی ہے حاصل زورِ بازو سے
نہیں تو بات کیا اُس میں ہے ــــ ٹھنگنا قد، سیہ رنگت
قوی، جاہل، جری منگول کی تصویر ہے گویا
یہ تصویر اور کھُب جائے گی عورت کی نگاہوں میں
میں خود حیران تھا ــــ اک دن پوچھ ہی بیٹھا سلیمہ سے
ابھی تک گونجتا ہے میرے کانوں میں جواب اُس کا
"میں کیا کرتی، میں جب دفتر سے آتی، سامنے ہوتا
میں جب دفتر کو جاتی روک لیتا راستہ میرا
مجھے تنگ آ کے جھکنا ہی پڑا، مجبور ہے عورت ــــ!!
کروں کیا ــــ میں کہاں جاؤں ــ میں پابندِ سلاسل ہوں"
ہزیمت خوردہ ــ دُشمن کو بھی کوئی چھوڑ دیتا ہے ــــ؟
مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ عورت خوش بھی اس سے ہے
جو اس کو پیٹے، اُس پر ظلم کا کوہِ گراں توڑے

کہ عورت نظرناً ہوتی ہے ظلم و جور کی خُوگر ——
مگر یہ کیا —— ابھی سے ہی بہکنے لگ گیا ہوں میں
یہاں تو فلسفے کو غرقِ بادہ کرنے آیا ہوں ——"

"جگت سنگھ" —— یوں تو جذباتی ہے لیکن ایسا جذباتی
کہ جس کا دِل ہوا کرتا ہے جھلمل جھلمل آئینہ ——!!
کہ جس پر —— بال پڑنے کا نہیں ہوتا ہے اندیشہ

ہر اک تصویر لیکن دو رُخی ہوتی ہے —— یہ سچ ہے
وُہ جب پی لیتا ہے جی چاہتا ہے اُس کا لڑنے کو
صفت اپنی نہیں یہ اُس کی —— شاید نندمے کی ہے
مگر لڑتا نہیں ہے ہر کوئی گلرنگ مے پی کر
شرابِ ارغوانی کے تاثر کی یہ نیرنگی ——!!
کوئی رو پڑتا ہے —— پی کر کوئی باتیں بناتا ہے
کوئی سو جاتا ہے —— اور کوئی جھگڑا مول لیتا ہے
جگت سنگھ پر بھی طاری ہیں یہی کیفیتیں چاروں ——

جگت سنگھ اُس کی داڑھی بھی ہے —— اک تصویرِ دو رُخ کی
سفید اور کالی داڑھی جس کو باندھے رکھتا ہے ہر دم
وُہ جس سے اُس کے چہرے پہ ہے عالم دھوپ چھاؤں کا
وُہ جس کے نیچے آدھے گال، ٹھوڑی، ہونٹ پنہاں ہیں

نظر آتی تو ہے اکثر اذیت دِہ عذاب اُس کو
نکل آیا ہے لیکن سرکشی کے دَور سے کوسوں
وُہ جب یہ مستقل، جامد روابت توڑ سکتا تھا
بچارا کیا کرے —— اب موردِ تشنیع ہوتا ہے
وُہ بلونت —— اب بھی آجاتی ہے، جو بزمِ تصوّر میں
بڑی چنچل تھی، ہنس مکھ تھی، بڑی ہی شوخ فطرت تھی
عجب اُس کی طبیعت تھی، الوکھا تھا مزاج اُس کا
اُسے اپنی تجارت کا سلیقہ بھی نہ آتا تھا ——
یہ اُس کا شوق تفریحی تھا، لذت کوش تھا شاید
"پیتا جی —— پاؤں پڑتی ہوں" جگت سنگھ سے وُہ جب کہتی
جب اُس کی گود میں گر کر وُہ داڑھی کو ہلا دیتی
نظر آتیں اُسے داڑھی پہ چلتی قینچیاں لاکھوں

جگت سنگھ —— اب بھی یوں بیٹھا ہے جیسے سوچتا ہوگا
اگر وُہ بیاہ سے پہلے ذرا سا حوصلہ کرتا
تو اُس کے سر پہ ترچھی ہیٹ پگڑی کی جگہ ہوتی

"وُہ آتا ہے بِل —— اُٹھو چلو یہ اُونگھنا چھوڑو
اُٹھو، چلنے سے پہلے دل ہی دل میں یہ دُعا مانگو
کہ جیسے ہم ہیں ہنستے، کھیلتے، رنگین پروانے ——
ملے ویسی ہی ہنستی بولتی شمعِ فروزاں بھی"——

عبدالرحیم شبلی

روسی ادب کا اثر اُردو افسانے پر

"ادب" "اور" "انسان" ایک دوسرے سے بڑی حد تک مشابہ ہیں جس طرح ہر انسان کی ایک علیحدہ "شخصیت" ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ادب ایک مخصوص "شخصیت" کا حامل ہوتا ہے۔ کمزور ادب کی "شخصیت" کمزور اور صحت مند ادب کی "شخصیت" صحت مند تسلیم کی گئی ہے۔ جس طرح عمل و جہد کی اس دُنیا میں ہر طاقتور اپنے سے کمزور کو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر صحت مند ادب، غیر صحت مند ادب پر اپنا شعوری یا غیر شعوری اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ تاریخ ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں ادب کا ورثہ یونان سے روما کو ملا۔ اور اِن دونوں سے جدید یورپی قوموں کو۔ اس کے بعد ایشیا نے یورپی ادب کے اثرات قبول کئے۔ لیکن ہر قوم میں چونکہ ادب کا فطری عنصر بھی ہوتا ہے۔ اسلئے وہ اکتسابی ادب صرف اُس حد تک قبول کرتا ہے۔ جس حد تک اُس کے فطری جذبات کا اسلوب اور معیار اجازت دے۔ اگر خارجی ادب کا پیوند مُلکی ادب کے فطری رجحان سے نہ لگ سکے تو بسا اوقات اُس کی نشو و نما رُک جاتی ہے۔ اور غیر ملکی ادب ایک محدود اور مصنوعی دائرے میں حرکت کرتا ہے۔

مثال کے طور پر روس کے ادب کو لیجئے۔ اس ملک میں یورپی ادب نے پاؤں پسارنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کا بیشتر حصہ چونکہ ملکی ماحول اور فطری تقاضے کے خلاف تھا۔ اس لئے وہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اور اُس کی نشو و نما رک گئی۔ البتہ بعض حلقوں میں اُس کا چرچا مدت تک ہوتا رہا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ رُوس میں ادب کے فطری اور مصنوعی عناصر جُدا جُدا پرورش پاتے رہے۔ اور آج ہمیں تاریخ ادبیاتِ روس میں ان دونوں کا الگ الگ سُراغ ملتا ہے۔ اس کے برعکس بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن کے ادب نے نہ صرف خارجی اثرات کو خیر مقدم کہا۔ بلکہ اپنی مخصوص "شخصیت" کو برقرار رکھتے ہوئے اُن کی نشو و نما اور تربیت کے لئے ایک نیا رستہ نکالا۔ مثلاً انگلستان اور جرمنی نے اپنے ادب کی بنیاد یونانی ادب پر رکھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنی انفرادیت کو نہیں کھویا۔ بلکہ خارجی اثرات سے کھاد کا کام لیا۔ اور ایک نئے ادب کی تخلیق کی۔ یہی کیفیت ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ یہاں کے ادب پر یونان، پرتگال، عرب، ترکی، ایران اور یورپ وقتاً فوقتاً اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے فطری جذبات ہمیشہ غالب آئے۔ اور خارجی ادب کی جڑیں صرف اُس حد تک پھیل سکیں جس حد تک ملکی ادب کی مٹی نے اجازت دی۔ اور اب وُہ تمام اثرات کی روشنی میں ایک نیا اور ترقی پسند رستہ ڈھونڈ رہا ہے۔ ہمیں گذشتہ اثرات سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُردو ادب روس سے کس حد تک متاثر ہوا؟ اور ہمارے مختصر افسانے کی تعمیر میں اُس کا کیا حصہ ہے؟ لیکن اِن سوالوں کا جواب دینے کے لئے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اُردو افسانے نے کن حالات کے ماتحت روسی ادب کے اثرات قبول کئے؟

پراچین عہد میں ہندوستان پر دیوتاؤں اور برہمنوں کی حکومت تھی۔ اس لئے ہندو ادب میں اونچی جاتیوں کے عیش و عشرت کا تذکرہ تو موجود ہے۔ لیکن اُسے عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ سنسکرت کے اکثر افسانے "جنسی فوضویت" "Sexual Anachy" کے آئینہ دار ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ رؤسا و اُمرا کے شہوانی جذبات کو تسکین دینے کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں "افسانے" کی نسبت "شاعری" کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ اور اس کا پیش منظر بھی زیادہ تر ایرانی تھا۔ بحر و قوافی، بیان و معانی اور تشبیہ و استعارہ پر کافی زور صرف کیا گیا۔ لیکن حکمران طبقے اور عوام کے درمیان جدائی کی جو خلیج آریاؤں کے زمانہ سے حائل رہی اُسے پاٹنے کی کوئی کامیاب کوشش نہ ہو سکی۔ آخر پلاسی کی لڑائی کے بعد ہندو اقتدار مٹ گیا۔ اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کی کشتی بھی ہلکورے لینے لگی۔ سامنتی تمدن کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور ہندوستان کے دروازے

پر تغیر و تبدل کی نئی قوتیں دستک دینے لگیں۔ اس بحران اور انتشار کا نتیجہ عمل یہ ہوا کہ دونوں قومیں اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگیں۔ اور نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لئے جدت کی مخالفت اور قدامت کی حمایت ہونے لگی۔ لیکن مغربی تمدن کے زیر اثر اقتصادی اور سیاسی نظریے نئے نئے سانچوں میں ڈھل رہے تھے۔ معاشری اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ پرانے تمدن اور قدیم تہذیب کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اس لئے صوفیانہ نقطۂ نگاہ کے لئے اب کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ لوگ حقائق کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ شاعر اور ادیب بادشاہوں کے محلات سے نکلے۔ اور عوام کے جھونپڑوں کی تصویر کشی کرنے لگے۔ قصیدہ خوانی کی جگہ مزدوروں اور دہقانوں کی زندگی کی عکاسی نے لے لی۔ معنی و مقصد کو لطفِ زبان اور زیب داستان پر ترجیح ملنے لگی۔ اور ادب کی زمام صوفیوں، بیراگیوں اور امیروں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے پاس آ گئی۔ اس زمانہ میں "لبرلزم" کے خیالات کی اشاعت ہو رہی تھی۔ اس لئے ہندوستانی ادب میں بھی "عمومیت" "اور خود تنقیدی" کی جھلک نمایاں ہونے لگی۔ انگریزی تعلیم نے اس جذبۂ حریت و آزادی کو ہوا دی۔ اور سرسید اور حالی کی کوششوں سے ملک میں عقلیت اور رواداری پھیلنے لگی۔ لیکن ہندوستان کا ذہن چونکہ لبرلزم کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسلئے ادب نے ایک اور کروٹ لی۔ اور یہ تحریک "قومیت" سے بدل گئی۔ جس کے علم بردار مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ تھے۔ اس تحریک کا آغاز اس خوف سے ہوا کہ اگر ہندوستان نے مغربیت اختیار کر لی تو ہم ہلاکت کے غار میں جا گریں گے۔ اور ہمارے "روایتی احساس" کو صدمہ پہنچے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ چلیں اور اسی راہ پر گامزن ہوں جو ہمارے آبا و اجداد نے اختیار کی تھی۔ لیکن اس اثنا میں انگریزی نے اپنے قدم جما چکی تھی۔ سرامپور کا چھاپہ خانہ بنگال کے کونے کونے میں مغربی ادب پھیلا رہا تھا۔ اور لارڈ میکالے کی استعمار پسندانہ پالیسی ایک ایسی تعلیم کی داغ بیل ڈال چکی تھی۔ جو انگریزی میں سوچنے والے دماغ پیدا کرتی ہے۔ اس لئے نوجوانوں نے انگریزی ادبیات کا مطالعہ شروع کیا۔ اور انگلستان کی رومانی تحریک سے متاثر ہو کر ایک ایسے ادب کی تخلیق کی۔ جس میں قوم پرستانہ جذبات کی آگ بھڑک رہی تھی۔

سب سے پہلے بنکم چندر چیٹرجی نے لارڈ لٹن کا "اندھی مالن کا گیت" سنا۔ اور اسی کی بنا پر اپنا ناول "رجنی" لکھا۔ جس کے چھپتے ہی ہندوستان بھر میں بنکم بابو کی دھوم مچ گئی۔ بنکم چندر کے دل میں سرکاری ملازمت کے باوجود قومیت کا احساس موجزن تھا۔ اس نے "آنند مٹھ" لکھ کر ملک میں آگ لگا دی۔ اور نہ صرف "انارکزم" کی تحریک پھیلائی۔ بلکہ فرقہ پرستی کے بیج بھی بو دیئے۔ جس کا اثر زائل کرنے کے لئے شرر لکھنوی کو لنگر لنگوٹا کس کر میدان میں اُترنا پڑا۔ بہر حال اب دیسی ادب کو انگریزی ادب کا پیوند لگ چکا تھا۔ اور اس کے پنپنے کی وجہ محض یہ تھی کہ انگلستان کی رومانی تحریک ہندوستان کے جذبۂ قومیت کو ہوا دینے کے لئے مفید ثابت ہو رہی تھی۔

انگریزی ادب کے اثر کے ماتحت پہلے تو اُردو میں ناول لکھے گئے۔ اس کے بعد مختصر افسانے کی طرف توجہ کی گئی۔ اور سب سے پہلے جس افسانہ نویس نے بنگالی ادب کے جدید رجحانات کی تقلید کی۔ اس کا نام پریم چند ہے۔ منشی جی بنگلہ نہیں جانتے تھے۔ لیکن ہندی زبان کی وساطت سے وہ افسانہ نگاری کے جدید میلان سے بے خبر نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اُردو افسانے کو نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ اور تکنیک کے لحاظ سے اُنیسویں صدی کے انگریزی فنِ افسانہ نویسی کے ہم پلہ بنا دیا۔ پریم چند سے پہلے قصہ کی بنیاد زیادہ تر فرضی واقعات پر ہوتی تھی۔ منظر نگاری پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ کردار کی تعمیر کی طرف توجہ نہ کی جاتی تھی۔ انمل بے جوڑ باتوں سے پلاٹ کو کئی کئی صفحات پر پھیلا دیا جاتا تھا۔ مشاہدہ کے بجائے قیاس آرائی سے کام لیا جاتا تھا۔ پریم چند نے ان نقائص کو دور کر کے افسانے کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اور غالباً پہلی مرتبہ کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کو پوری وضاحت کے ساتھ افسانے کے آئینہ میں دکھایا۔

اس دوران میں انگریزی کی وساطت سے فرانس اور روس

کے ناول بھی مارکیٹ میں آچکے تھے۔ ہندوستان میں چونکہ قومیت کا احساس اپنے شباب پر تھا۔ اس لئے وہ ایسے ہی ادب کو جذب کر سکتا تھا۔ جس میں لوگوں کو مغربیت کے سیلاب کو روکتے اور تشدد کا مقابلہ کرتے دکھایا جائے۔ یہ دونوں چیزیں روسی ادب میں موجود تھیں۔ اور ٹالسٹائے اُن کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ لہٰذا اُردو افسانے نے اُن کو قبول کر لیا۔ دوسری طرف گاندھی جی برطانوی سامراج سے نبرد آزما تھے اور "گاؤں کو واپس چلو" Back to Villages کا نعرہ لگا رہے تھے۔ جب اُنہوں نے ٹالسٹائے کی تصانیف پڑھیں تو اُن کے دل پر عدم تشدد، مسیح کی اخلاقی تعلیم، مشینوں کے نقصان، دیہات پرستی اور رجعت پسندی کے فلسفے کا خاص اثر ہوا۔ اُنہوں نے تحریکِ عدم تعاون کی بنیاد ہی ان باتوں پر رکھی — اور نئی روشنی کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں کو روایتی ماحول اختیار کرنے کی تلقین کی۔ منشی پریم چند چونکہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کے سرگرم رُکن تھے اسلئے ناممکن تھا۔ کہ اُن کے ادب پر گاندھی جی کی آواز کا اثر نہ ہوتا۔ اُنہوں نے بھی ٹالسٹائے کو اپنا ادبی رہنما بنایا۔ اور عمر کے آخری ایام میں جو افسانے لکھے اُن میں عدم تشدد اور دیہات پرستی ہی پر زور دیا۔

الغرض اُردو افسانے نے ادبیات روس کا پہلا اثر جن حالات میں قبول کیا وہ یہ تھے کہ ہندوستان میں مغربیت کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ پرانے تمدن کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں، لوگ روایتی مذہب و اخلاق سے بیگانہ ہو رہے تھے۔ معاشی قوتوں کے زیر اثر گاؤں کی اہمیت کم ہو چکی تھی۔ اور شہروں میں مشین کا رواج عام ہو رہا تھا۔ ٹالسٹائے کے زمانہ میں بھی یہی کچھ ہوا۔ سولھویں صدی میں پیٹر اعظم روس کے خوش حال طبقہ کو مغربی معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کر چکا تھا۔ ٹالسٹائے کے زمانہ میں روس ایک ہولناک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جسے دُور کرنے کے لئے اُس نے مسیحی فلسفۂ اخلاق کی تبلیغ کی۔ یہی خیالات جب سیاسی انتشار کے زمانہ میں ہندوستان پہنچے۔ تو اُردو افسانے نے اُن کو بلا تامل جذب کر لیا۔ اور اُن کا سب سے گہرا اثر پریم چند اور کسی حد تک رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔

اس عرصہ میں ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ پُرانے نظام کی بوسیدہ ہڈیوں پر تمدن کے نئے ایوان تعمیر کئے جا رہے تھے۔ ہر ملک اپنے مستقبل کی تشکیل میں مصروف تھا۔ "معاشی قومیت" کا جذبہ مقبول ہو رہا تھا۔ لیکن ہندوستان ابھی بھوک اور غلامی کے دوگونہ عذاب میں مبتلا تھا۔ وہ اپنے لاکھوں نوجوان جنگ کی بھٹی میں جھونک چکا تھا۔ لیکن ایثار و قربانی کا معاوضہ ۱۹۱۹ء کی چیمسفورڈ ریفارمز کے سوا کچھ بھی نہ مل سکا۔ ہندوستان کا دل اس کھلونے سے کیونکر بہل سکتا تھا؟ اُس نے اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ کانگرس نے سول نافرمانی کا حربہ استعمال کیا، مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی، لیکن ہندوستان کا مسئلہ سائمن کمشن اور گول میز کانفرنسوں کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ دوسری طرف جنگ کے معاشی اثرات ہولناک صورت اختیار کر رہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں زرعی پیداوار کی فراوانی بین الاقوامی قرضوں کا "انجماد"۔ اور زر رائج کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنک ٹوٹ گئے۔ تجارت و صنعت کا بازار سرد پڑ گیا، اشیا کے نرخ گر گئے۔ اور انگلستان نے معیارِ طلا ترک کر دیا۔ جنگ چونکہ ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے بیکاری عام ہو گئی۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان کے سامنے پہلے ہی سرکاری ملازمت کے سوا کسبِ معاش کا کوئی رستہ نہ تھا۔ اب دفتروں کے ماتھے پر "نو ویکنسی" کے لٹکتے ہوئے بورڈ دیکھ کر اُس کے رہے سہے ہوش بھی خطا ہو گئے۔ اُس کی تمناؤں کا گلا گھونٹ ڈالا گیا۔ وہ اپنے ماحول سے بیزار ہو گیا۔ اور اُس کے سینے میں انقلاب و بغاوت کی چنگاریاں پرورش پانے لگیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد کمیونزم کی اشاعت عام ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے ادیب نے جب بھوک اور غلامی کے مسئلہ پر غور کیا۔ تو اُسے بالشوزم کے سوا نجات کا کوئی رستہ نظر نہ آیا۔ اُس نے دیکھا کہ کچھ اسی قسم کے حالات روس کو بھی درپیش آئے تھے وہاں بھی "انفرادی آزادی" نوکرشاہی کی چکی میں پیسی جا چکی تھی۔ وہاں بھی غلامی اور بھوک کا دَور دورہ تھا۔ آخر کارل مارکس کے معاشی فلسفہ اور لینن کے جوشِ عمل نے وہ آگ بھڑکائی کہ روس کا شہنشاہی

نظام بھک سے اُڑ گیا۔ اور عوام آرام کی سانس لینے لگے ہندوستانی
ادیب بھی غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا کہ کمیونزم کو اگر کُلّی طور پر اختیار
نہیں کیا جا سکتا۔ تو اُسے ہندوستانی حالات کے مطابق ڈھالا ضرور
جا سکتا ہے۔ لیکن اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے عوام کو بیدار
کرنا ضروری تھا۔ اور عوام اُس وقت تک بیدار نہ ہو سکتے تھے۔
جب تک ادب کو نئی بنیادوں پر استوار نہ کیا جاتا۔ چنانچہ ترقی پسند
ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ حالیؔ اور اقبالؔ پہلے میدان تیار کر
چکے تھے۔ اب شاعروں نے اشتراکی نقطہ نگاہ سے سوچنا شروع کیا۔
جوشؔ۔ الطافؔ اور احسانؔ دانشؔ وغیرہ نے بعض ایسی نظمیں کہیں۔
جن میں زرداروں کی تحقیر اور کسانوں، اور مزدوروں کی عظمت کا تذکرہ
پایا جاتا ہے۔ لیکن ان شاعروں کا تعلیمی پس منظر چونکہ وسیع نہ تھا اِس
لئے اُن کا نقطۂ نگاہ واضح صورت اختیار نہ کر سکا۔ اور یہ سمجھ میں نہ
آ سکا کہ آخر اِن لوگوں کا منتہائے مقصود کیا ہے؟ تاہم فیضؔ۔ مجازؔ۔
مخدوم محی الدین۔ علی سردار جعفری۔ علی جواد زیدی وغیرہ کے حریت
پسندانہ نغمے لوگوں کے کانوں میں گونجتے رہے، اُن کا نقطۂ نگاہ بھی
کافی واضح تھا۔ اسلئے وُہ جدید رجحانات کی تربیت کے لئے مفید
ثابت ہوئے۔ اور اُن کا سب سے گہرا اثر نثر نگاروں نے قبول کیا۔
افسانہ نویسوں نے بھی اپنے خیالات و افکار کا دھارا موڑ دیا۔ اور اُن
کی کہانیوں سے انقلاب و بغاوت کی آتشناک صدائیں اُٹھنے لگیں۔
اِن میں سے جو افسانہ نویس پڑھے لکھے اور ذہین تھے۔ اُنہوں نے
غیر ممالک کے ترقی یافتہ لٹریچر کا مطالعہ کیا تو اُن کو ہندوستان اور
روس کے حالات میں ایک حیرت انگیز یکسانی اور مطابقت نظر آئی۔
اور قدرتی طور پر وُہ اُس سے متاثر بھی ہوئے۔

مثلاً سب سے پہلے اُنہوں نے دیکھا۔ کہ جس طرح روس صدیوں
تک جاگیرداری اور زاریت کے آہنی پنجوں میں جکڑا رہا ہے۔ اسی
طرح ہندوستان بھی برسوں سے استعماریت کا شکار ہے۔ جس طرح
روس کا بیشتر علاقہ دیہات پر مشتمل ہے اِسی طرح ہندوستان کی
آبادی کا اکثر حصہ بھی دیہات میں آباد ہے۔ جس طرح انقلاب ۱۹۱۷ء
سے پہلے روس کے لوگ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے
تھے۔ اِسی طرح ہندوستان کے باشندے بھی اب تک سماج کے
بندھنوں اور روایتی ماحول سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ جس طرح روس
مغربیت کو ہضم کرنے کے قابل نہیں ہو سکا اسی طرح ہندوستان میں بھی
مغربیت پوری طرح سرائیت نہیں کر سکی۔ اور یہاں بھی وہاں کی طرح
جدید و قدیم میں تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ان مشابہتوں کے علاوہ روسی
ادب میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو ہندوستانی ادیب کے دل پر
ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ مثلاً روسی ادب پشکن سے لیکر گورکی تک
حقیقت پسند ہے۔ وُہ ماحول پر پوری سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔
اور جہاں تک ہو سکے بے مقصد مزاح و تفریح سے کام نہیں لیتا چنانچہ
گوگول کے بعض افسانے مزاحی رنگ کے حامل ہیں۔ اُس کے متعلق
کسی نے کہا ہے کہ اگر وُہ کبھی ہنستا ہے تو اُس کی ہنسی میں آنسو کی
ایک بوند چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اُردو افسانے کو چونکہ حقیقت پسندی
کی ضرورت تھی۔ اس لئے روسی ادب سے یہ ضرورت پوری کر لی گئی۔
دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روسی ادب میں ایک عالمگیر وقار پایا جاتا
ہے۔ اُس کی نظر وسیع ہے۔ وُہ انگریزی ادب کی طرح تنگ ظرف
اور محدود نہیں ہے۔ نہ کسی خاص طبقے اور قوم کے لئے مخصوص ہے
اس لئے اگر اُردو افسانے نے اُس کے بعض عناصر کو جذب کر لیا۔ تو
یہ اُردو افسانے کے ترقی پسند ہونے کی دلیل ہے۔ تیسری خصوصیت
یہ ہے کہ روسی ادب میں ایک طرح کا حزن و ملال پایا جاتا ہے۔ اس
لئے ہندوستان کی مغموم طبیعت کو اس سے قدرتی طور پر تسکین ملتی
ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ روسی ادب "ایشیائی مزاج" کا آئینہ بردار
ہے۔ اس لئے ہندوستان بھی اُسے بہ آسانی قبول کر سکتا ہے۔

اِن خصوصیات اور مشابہات کو دیکھ کر ہندوستان کا ادیب
فطری طور پر روسی ادب سے دلچسپی لینے لگا۔ اور چونکہ روسی ادب
کی "شخصیت" طاقتور تھی اس لئے وُہ اُردو افسانے پر، جو ابھی ابتدائی
مراحل طے کر رہا تھا، اثرانداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ اُردو کے افسانہ نویسوں
نے نہ صرف روسی ادب کا مطالعہ کیا۔ بلکہ اُس کا بہت زیادہ اثر بھی لیا۔
بعض نے ترجمہ پر اکتفا کی، بعض نے روسی افسانوں کو اپنا لیا، بعض
نے اُن کو صاف ہی اُڑا لیا، اور بعض پر اُن کا غیر شعوری اثر ہوا۔ یوں

تو اِکّے دُکّے افسانوں کا بہت سے ادیبوں نے ترجمہ کیا ہے لیکن جن لوگوں کے روسی افسانوں کے تراجم کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن میں جلیل قدوائی، پروفیسر حبیب منصور احمد مرحوم اور سعادت حسن منٹو کی مساعی خاص طور پر لائق داد ہیں۔ جہاں تک ایک اہم ادبی ضرورت کا تعلق ہے وہ اِن تراجم سے پوری ہو چکی ہے۔ روسی افسانوں کو اپنانے والوں میں سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے نام ممتاز ہیں۔ اور وہ افسانہ نویس جنہوں نے روسی افسانے کی ٹکنیک اور مواد کا لاشعوری اثر قبول کیا ہے۔ اُن میں آج کل کے تقریباً تمام چوٹی کے لکھنے والے شامل ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ روس کے وہ کون سے افسانہ نگار ہیں۔ جن کے فانوسِ ادب سے اُردو کے فن کاروں نے روشنیاں مستعار لی ہیں؟ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ٹالسٹائے کے اخلاقی فلسفہ، پشکن کے انقلابی جذبہ، ترگنیف کی انسانیت سے گہری ہمدردی، گوگول کی حقیقت نگاری، چیخوف کے انداز بیان کی سادگی اور متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی زندگی کی عکاسی، دستوفسکی کی نفسیاتی تحلیل، اور گورکی کی پرولتاری سیاست کا ہمارے افسانے کی ساخت اور مواد پر گہرا اثر پڑا ہے۔

ٹالسٹائے کی ابتدائی کہانیاں اب بھی پُرانے رنگ کے لکھنے والوں کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ تاہم اُس کی سادہ بیانی، دیہات پرستی، جذباتیت اور حقیقت نگاری سے ترقی پسند افسانہ نویسوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خصوصاً "جنگ اور صلح" اور "ہمیں کیا کرنا چاہئے"۔ اُردو افسانے کو نئی نئی راہوں سے آشنا کرتی رہتی ہیں۔

گوگول کو روس کے افسانہ نویسوں میں امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اُس کے ادب کا مقصد صرف بہلانا یا عبرت دلانا نہیں۔ بلکہ اُس کا موضوع زندگی کے ہر پہلو اور ہر کیفیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں نہ صرف موجودہ حالات کا عکس بلکہ مستقبل کی زندگی کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ گوگول نے کوسک ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے اُس کی ذہنیت ایک ایسے دیہاتی کی ہے۔ جو شہری زندگی کی نفاستوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اُس کی پہلی کامیاب تصنیف کا نام "دجکانکا کے قریب ایک باڑی میں سُنی ہوئی کہانیاں" ہے اس میں دیہاتی زندگی کے قصے سُنائے گئے ہیں۔ اور یوکرائن کے قدرتی مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور فنی لحاظ سے بھی اُن میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو ادب کو بلند سطح پر پہنچا دیتی ہیں۔ اُس کے اکثر افسانوں میں بھوتوں اور چڑیلوں کا ذکر آتا ہے لیکن اس کا گوگول کی حقیقت نگاری پر اثر نہیں پڑتا۔ اُس کے دوسرے مجموعے کا نام "میر گورود" اور تیسرے کا "گلکاریاں اور کہانیاں" ہے۔ ان مجموعوں میں اُس کا فن انتہائی عروج پر نظر آتا ہے۔ بعض جگہ وہ ہنسی مذاق سے کام لیتا ہے۔ لیکن اُس کے افسانے پڑھ کر انسانی ہمدردی آہوں اور آنسوؤں کا خراج لیتی ہے۔ اس لئے ہندوستانی طبیعت کو یہ افسانے خاص طور پر راس آسکتے ہیں۔

پشکن اُنیسویں صدی کا ایک بغاوت آموز شاعر تھا۔ اُس کی زندگی آوارہ گردی اور ہوس پرستی میں گزری۔ لیکن وہ سماج کی ذہنی اور روحانی بیماریوں کو ایسے ماہرانہ انداز میں کُریدتا ہے کہ اُس کی سیرت کے بدنما پہلوؤں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی آتشیں نظموں نے نہ صرف اُس زمانہ کے لوگوں کو بیدار کیا بلکہ آئندہ نسلوں کی نگاہ میں اُسے روس کا سب سے بڑا شاعر اور مدبر بنا دیا۔ اُس نے ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن افسانے موضوع کے اعتبار سے قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ اُردو ادب میں جنسی ہیجان اور اخلاق و مذہب کی روایتوں کے خلاف جو باغیانہ جذبہ نظر آتا ہے اُس کا ذمّہ دار ایک حد تک پشکن ہی ہے۔

چیخوف افسانہ نویسی کے ایک نئے اور نرالے طرز کا موجد تھا۔ اُس نے زندگی کی کیفیات اور انسان کے احساسات کا نقشہ کھینچنے کے لئے جو اندازِ بیان اختیار کیا وہ فنِ افسانہ نگاری میں انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ وہ اپنی کہانی کو معنی خیز بنانے کے لئے "اتفاقات" اور "غیر معمولی حادثوں" کا سہارا نہیں ڈھونڈتا۔ بلکہ عام واقعات اور احساسات کو اس صفائی اور وضاحت سے پیش کر دیتا ہے کہ افسانے میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ اُس کی بعض ادبی تصویریں دھندلی نظر آتی ہیں اور اسکا زوردار وہ سیاسی اور اخلاقی نظام ہے جو حقائق کو یکرنگ بنا دیتا ہے چیخوف نے ظریفانہ افسانے

بھی لکھے ہیں جن میں سماج اور حکومت پر زبردست طنز کی گئی ہے لیکن اُس کا خاص موضوع تعلیم یافتہ طبقہ کی سیرت اور ذہنیت کو آشکار کرنا ہے۔ وُہ متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ روسیوں کی ذہنی کش مکش پر ایسے مؤثر پیرایہ میں روشنی ڈالتا ہے کہ دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ اُردو افسانے کو تعلیم یافتہ طبقہ سے ہمدردی اور انداز بیان کی سادگی چیخوف ہی سے ملی ہے۔

دستووسکی کے ناولوں میں "واقعات" کا بہت کم ذکر ہے۔ اُس نے انسان کی اندرونی کیفیات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اُن کی اہمیت پر اتنا زور دیا ہے۔ کہ وُہ ناول کی ساری فضا پر چھا جاتی ہیں۔ دراصل ایک تو اُسے مرگی کے دورے پڑتے تھے اور دوسرے اُسے قتل کا حکم دیا گیا تو اُس نے موت کا انتظار کرتے وقت اپنے ذہن کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ انہی تجربات کا اعادہ اُس نے اپنے ناولوں میں کیا ہے۔ بعض نقاد اُسے ذہنی مریض اور روگی قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے "نفسیاتی تحلیل" سے کام لے کر ادب پر جو احسانات کئے ہیں اُن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے ناول "جرم و سزا" نے انسانی نفسیات پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ اور علم، اخلاق اور فلسفے کے لحاظ سے اُس کی تمام تصانیف دنیائے ادب میں ایک اہم درجہ رکھتی ہیں۔ موجودہ افسانہ نگاروں نے دستووسکی کے فلسفۂ جذبات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

گورکی روس کے اُن ادیبوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہے جو انقلاب کے طوفان میں آ کر غائب ہو گئے۔ اُس نے عوام کی زندگی اور اُن کے جذبات و احساسات کی تصویر کھینچ کر روسی ناول کو قومی زندگی کا مکمل نمونہ بنا دیا۔ اُس نے ایک ایسے طبقے کی نمائندگی کی جو مہذب و متمدن لوگوں کی توجہ سے محروم رہا۔ اُردو افسانے میں پس ماندہ طبقے سے جو ہمدردی کا احساس ملتا ہے وُہ گورکی کی پرولتاری سیاست ہی کا مرہونِ منت ہے۔

اِن اُدبا کے ساتھ ہی اُردو افسانے نے ترگنیف کی انسانیت سے ہمدردی، آندرے بیلی کی اشاریت، اینڈریف کی ابہام نگاری، زمیاتن کی طنزِ ملیح، سولوگپ اور کپرن کی جمال پرستی کا شعوری یا غیر شعوری اثر بھی قبول کیا۔ لیکن اُن کے نقوش اتنے واضح نہیں کہ الگ الگ چھانٹے جا سکیں۔ انقلاب ۱۷ء کے بعد روس کے ادب میں بہت کچھ تغیر آ چکا ہے۔ مثلاً ۲۲ء کے بعد روسی افسانے کا "عالمگیر وقار" برقرار نہیں رہ سکا۔ بلکہ وُہ جغرافیائی ماحول اور ہنگامی مسائل میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ جمالیاتی اور فنی عناصر کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ کیا اُردو افسانہ اِن جدید ترین رجحانات کو بھی قبول کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ ہندوستانی ادب کا فطری عنصر خارجی اثرات کو جس حد تک جذب کر سکتا تھا وُہ کر چکا ہے۔ اب اُسے بعض دوسرے مسائل کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق ایک نیا رستہ نکالنا ہے۔ کیونکہ کمیونزم کو اِس ملک میں وُہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو کساد بازاری کے زمانہ میں حاصل تھی۔ اب اُسے اپنے مخصوص قومی، ثقافتی اور مذہبی تقاضوں کے ماتحت ایک نیا دستورِ اساسی وضع کرنا ہوگا۔ اسی احساس کے پیشِ نظر میرا خیال ہے کہ ہندوستانی ادیب آئندہ کمیونسٹ لٹریچر سے بہت کم دلچسپی لیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مستقبل میں اُردو افسانہ روسی ادب کے اُن رجحانات سے متاثر نہیں ہوگا۔ جو ۲۲ء کے بعد پیدا ہوئے۔ البتہ ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات چونکہ ابھی تک وہی ہیں جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع کے روس میں دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے جب تک ہندوستان کو انقلاب کا سامنا نہیں ہوتا۔ یا منزلِ مقصود صاف نظر نہیں آ جاتی۔ اُردو افسانہ قبل از انقلاب کے روسی ادب سے بدستور روشنی حاصل کرتا رہے گا۔

ممتاز مفتی

سلمہ

سلمہ کا ناک نقشہ اور رنگ روپ نہایت موزوں تھا مسکراتی تو گالوں میں گڑھے پڑ جاتے اور آنکھیں —— اُف کتنی پیاری تھیں اُس کی آنکھیں۔ ہرنی ایسی رسیلی اور حیران آنکھیں! جن پر بھیگی بھیگی پلکیں جھکی جھکی رہتیں۔ اس کے باوجود میرا ذرا جی نہ چاہتا کہ اُس کے پاس بیٹھوں۔ جانے کو تو میں اکثر اس کے ہاں جایا کرتی لیکن وہاں پہنچتے ہی جی چاہتا کہ بس چلی آؤں۔ واپس چلی آؤں۔ توبہ! اُن کے گھر اک اُداسی سی چھائی رہتی تھی۔ لوٹتی تو اماں مجھ پر بگڑتیں جیسے اُن کی عادت ہے" اے ہے لطیفہ تجھ سے وہاں دو منٹ بھی بیٹھا نہیں جاتا۔ دو گھڑی اس کے پاس بیٹھ کر سبق یاد کر لیا کرے تو کتنا اچھا ہو" سلمہ مجھے قرآن پڑھایا کرتی تھی۔ کیسا اچھا پڑھتی تھی وہ سارا زبانی یاد تھا اُسے۔ کتنی ہی خوبیاں تھیں اس میں۔ پھر بھی نجانے کیوں مجھے ذرا بھی پیاری نہ لگتی۔ وہ بات ہی نہ تھی اس میں۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کتنی بھدی نظر آتی۔ اور باتیں کرتی تو —— توبہ کتنی بے جان باتیں تھیں اُس کی۔ لفظوں کو چبا چبا کر بولتی۔ لہجے میں گنوار پن اُس پر ہاتھ چلا چلا کر سمجھانا۔ اور ہاتھوں کو یوں ہوا میں معلق رکھنا جیسے جوہڑ میں دو بگلے کھڑے ہوں۔ توبہ ہے۔ اُس کی سہیلیاں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ کنجڑے کی بیوی برکتے۔ تنور والی مائی نوراں اور ساتھ والی مسجد کے ملا کی بیوی الیشاں اور وہ سب اسے چھیماں کہکر پکارا کرتی تھیں چھیماں —— توبہ ایسے اچھے نام کو خواہ نخواہ بگاڑ لینا۔ مگر سلمہ کو ذرا بھی غصہ نہ آتا شاید اپنے گاؤں میں بھی اسی نام سے مشہور ہو گی۔ لیکن اس نام پر اُس کے میاں جاوید بہت بگڑا کرتے۔ جاوید کی موجودگی میں اُس کی سہیلیاں آتی ہی نہ تھیں۔ کبھی کبھار بے خبری میں کوئی پوچھ لیتی چھیماں تمہارے میاں گھر ہی پر ہیں کیا۔ تو یہ سنکر جاوید کو آگ سی لگ جاتی۔ غصے سے مُنہ سُرخ ہو جاتا۔ اور پھر خوب لڑائی ہوتی۔ خیر لڑائی تو کیا ہونی تھی کیونکہ سلمہ تو جواب تک نہ دیتی۔ بس کھڑی سنتی رہتی ایسا معلوم ہوتا جیسے اُسے پرواہی نہ ہو۔ حالانکہ جاوید ایسی ایسی سخت باتیں کہتے کہ کیا کہوں۔ اور وہ چپ چاپ کھڑی سنتی رہتی۔ جب وہ چلے جاتے تو میں پوچھتی آپا آج بھائی اس قدر ناراض کیوں ہو رہے تھے۔ تو سلمہ آہ بھر کر کہتی۔ اُن کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ کوئی سلمہ کہکر بلائے یا چھیماں کہکر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مطلب تو مخاطب کرنے سے ہے۔ اُنہیں کھانا کھلاتے یا کوئی چیز دیتے سلمہ کا ہاتھ کانپتا تھا۔ جب کبھی وہ آواز دیتے تو سلمہ چونک کر لرز جاتی جیسے جرم کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اور گھبراہٹ میں کوئی ایسی چوک ہو جاتی۔ جس سے اُس کا پھوہڑ پن اور بھی واضح ہو جاتا۔ اس پر جاوید نفرت اور جذبات کی شدت سے اُسے گھورنا شروع کر دیتا۔ اُف پھوہڑ پن کی انتہا ہو گئی۔ کیا ہے تمہیں سلمہ کیا تم اتنا سا کام بھی سلیقے سے نہیں کر سکتیں۔ پلیٹ کی طرف کیا دیکھتی ہو۔ ایسی بیسوں پلیٹیں ٹوٹ جائیں تو بھی مجھے پروا نہیں۔ لیکن تمہارا یہ بھدا پن۔ اُف۔ گنوار کہیں کی۔ نہ جانے اماں نے تم میں کیا دیکھا تھا۔ جو میرے گلے مڑھ دیا تمہیں۔ اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھتی ہو۔ دور ہو جاؤ اور میرے سامنے نہ آیا کرو۔ جاہل عورت۔" اور اس کے چلے جانے کے بعد بھی جاوید بڑبڑاتے رہتے" میری تو زندگی برباد ہو گئی۔ اوروں کی بیویاں ہیں۔ کیا سلیقہ ہے اُن میں۔ بات کرتی ہیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ ایک یہ ہے ماں کی چھیماں —— اُف۔ کس قدر گھن آتی ہے مجھے۔ نہ کسی سے ملنے کے قابل نہ کسی کے پاس بیٹھنے کے لائق —— اُف!! "

اس وقت ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا کہ انہیں واقعی اذیت ہو رہی ہے۔ خیر اس وقت تو وہ غصے میں ہوتے لیکن عام طور پر بھی جب اُن کی نگاہ سلمہ پر پڑتی جو اپنے دھیان میں بیٹھی کام میں مشغول ہوتی تو اُن کی آنکھ میں نفرت کی چمک لہرا جاتی۔ ناک سکڑ جاتی۔ اور وہ بے خبری میں جھرجھری لیتے۔ یہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے واقعی انہیں سلمہ سے نفرت تھی۔ اسی وجہ سے سلمہ کی ہر بات انہیں بُری

لگتی تھی۔ ایک روز جب اماں خالہ کے گھر گئی اور مجھے سلمہ کے ہاں چھوڑ گئی۔ تو میں سرِشام ہی سو گئی تھی لیکن کافی رات گئے جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ سلمہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ سامنے وہ سویٹر پڑا تھا۔ جسے وہ ان دنوں بُن رہی تھی۔ اُس نے سویٹر بننا مجھ سے سیکھا تھا۔ پہلے تو میں سمجھی وہ تھک کر آرام کر رہی ہے لیکن غور سے دیکھا تو معلوم ہوا سو رہی ہے۔ سویٹر بنتے بنتے سو گئی ہو گی۔ اس وقت ایک بجا تھا۔ ابھی جاوید گھر نہیں آئے تھے۔ بیچاری اُن کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُس وقت مجھے سلمہ پر ترس آنے لگا۔ نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ وہ جاوید کو دل سے چاہتی ہے۔ اس سے پہلے مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا۔ لیکن اُس رات میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ "جی آئی۔" "اوہ تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔" وہ بولے۔ جی سلمہ نے سر جھکا کر کہا۔ "کھانا کھا لیا"؟ انہوں نے پوچھا۔ "جی نہیں"۔ "کیوں" وہ چونکے۔ "آپ کھا لیتے تو ——" "پھر وہی بات" جاوید غصے میں بھر کر بولے۔ ہزار بار کہا۔ کہ وقت پہ کھانا کھا لیا کرو۔ چاہے میں آؤں یا نہ آؤں۔ اُف یہ پُرانی رسمیں! تم سمجھتی ہو یہ سگھڑ بی بی کا وصف ہوتا ہے۔ کہ وہ میاں کو کھلائے بغیر آپ نہیں کھاتی۔ مجھے سگھڑ بی بی نہیں چاہیئے۔ نہیں چاہیئے۔ تمہاری یہ پتی بھگتی مجھے بُری لگتی ہے۔ سُنا تم نے مجھے ایک رفیقہ حیات چاہیئے۔ رفیقہ حیات! پتی بھگت نہیں۔ میں انسان ہوں انسان دیوتا نہیں۔ خدا کے لئے مجھے انسان رہنے دو —— جانور کہیں کی۔"

اُس روز مجھے جاوید کی باتیں بہت بُری لگیں۔ اگر وہ انہیں کھلانے سے پہلے آپ کھانا پسند نہ کرتی تھی تو اس میں اُن کا کیا نقصان تھا۔ یا اگر وہ بیٹھی اُن کا انتظار کرتی رہتی تو اُن کا حرج ہی کیا تھا۔ انہیں دیر سے آنے سے ٹوکتی تو نہ تھی انہیں جلد کھا لینے پر مجبور تو نہ کرتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ سلمہ کا مُنہ چڑا دوں۔ بڑی محبت کرنے والی تو دیکھو۔ دیکھ لیا محبت کرنے کا نتیجہ۔ جب تک خاوند کو انگلیوں پر نچایا نہ جائے قابو ہی نہیں آتے۔ وہ تو خود چاہتے ہیں کہ ایسی بیوی ملے جس کی ادائیں ختم ہی نہ ہوں۔ میاں کی ذرا پروا نہ کرے۔ اعلانیہ طور پر بے نیاز رہے

باوجود ان باتوں کے سلمہ نے اپنے طور طریقے نہ بدلے۔ وہی آدھی آدھی رات تک اُن کے انتظار میں بیٹھی رہتی اور انہیں کھانا کھلا کر آپ یوں چھپ چھپ کر کھاتی جیسے امانت میں خیانت کر رہی ہو۔ جوں جوں جاوید کے سبھاؤ میں تلخی بڑھتی جاتی۔ سلمہ کی نمازیں اور لمبی ہوتی جاتیں۔ اور مجھے یوں لگتا جیسے اُس کی ہر نماز خدا کے نام ایک طعنہ ہو۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لے رہا ہو۔ اور جوں جوں اس کی نمازیں لمبی ہوتی جاتیں اُس کی شکل و صورت اور چال ڈھال اور بھی عام اور سادہ ہوتی جاتی۔ اس پر جاوید اور بھی چڑتے۔ وہ سلمہ کو اپنی بدقسمتی سمجھتے تھے۔ اور اکثر دوستوں میں بیٹھ کر اپنے نصیبے کی شکایت کیا کرتے۔ "ارے یار ہمیں تو ماں باپ نے جیتے جی مار دیا۔ گنوار بیوی جیسی لعنت کوئی نہیں۔ ایمان سے۔ کمبخت کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ بُت ہے بُت۔ میری تو تمام آرزوئیں مٹی میں مل گئیں۔ گھر آتا ہوں تو اُسے دیکھ کر جی جل جاتا ہے۔ بس نمازیں ہیں یا تلاوت۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی حجرے میں رہتا ہوں اُف!!"

ایک دن وہ دیوانخانے میں بیٹھے اپنی بدقسمتی کا رونا رو رہے تھے۔ کہ نہ جانے کون کہنے لگا۔ "بھئی واہ ایسی بیوی تو اور بھی اچھی ہوتی ہے۔ بس شرافت ہونی چاہیئے اور طور طریقے کا کیا ہے۔ جس رنگ میں چاہو ڈھال لو۔" ایک اور صاحب بولے "بھئی ہاں بیوی میں تو ایسے گن ہی ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں تو محبوبہ چاہیئے محبوبہ!" اس پر جاوید بولے۔ اسے کچھ سکھانا قطعی ناممکن ہے۔ سیکھنے کے لئے بھی تو سمجھ ہونی چاہیئے۔ ہماری نیک بخت تو سکھائے سے نہیں سیکھ سکتی چاہے ساری عمر سکھانے میں لگے رہو۔" اُس وقت اُن کی آواز میں نفرت کھول رہی تھی۔

باہر سلمہ جائے نماز پہ بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ میرا خیال ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اندر دیوانخانے میں اس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ دوپٹے سے بار بار سر ڈھانپتی۔ شاید اسلئے کہ باہر کی آواز کان میں نہ پڑے۔ دوپٹے میں لپٹی ہوئی وہ اور بھی بے جان دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کئی بار سلمہ سے کہا تھا۔ آپا تم دوپٹے کو "چنٹ" کیوں نہیں ڈالتی۔ "چنٹ" ڈالنے سے دوپٹہ کیسا خوبصورت ہو جاتا ہے۔ میری بات سُن کر وہ ہنس دیا کرتی۔ اور پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔ اس کا دوپٹے میں لپٹے لپٹائے چلنا——

ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی بھوت ہو بھوت۔ میری بے اختیار ہنسی نکل جاتی۔ لیکن سلمہ نے کبھی ان باتوں کی پروا نہ کی تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے زیادہ بڑی نہ تھی۔ مگر دیکھو تو یوں نظر آتا جیسے تیس سال کی ہو۔ بالپن تو تھا ہی نہیں۔ جوانی جوبن پر تھی لیکن انداز بڈھوں کا سا تھا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ پیار محبت کی بات کو وہ گناہ سمجھتی تھی گناہ۔ ایک دن نہ جانے کیا ہوا۔ کوئی بڑی دلچسپ بات ہوئی تھی۔ میں بھاگی بھاگی آئی۔ جی چاہتا تھا سلمہ سے لپٹ جاؤں۔ لیکن وہ جھینپ گئی۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ سے مجھے تھپکنے لگی۔ میرا خیال ہے وہ کسی سے بھی محبت کے اظہار کو جائز نہ سمجھتی تھی۔ سلمہ کے خیالات بھی عجیب تھے۔ کسی وقت تو مجھے خیال آتا کہ واقعی جاوید صاحب سچے ہیں۔ اتنی سادگی بھی کیا ہوئی ــــ فضول ــ

سلمہ ہمارے پڑوس میں چار مہینے ہی رہنے پائی تھی کہ ابا کو دورے کا حکم ملا۔ اور اماں کو بہانہ مل گیا۔ کیونکہ وہ کب سے وطن جانا چاہتی تھی۔ دو ایک بحثوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم سب سیالکوٹ جا رہیں۔ ابا چاہتے تو اپنی پرانی نوکری پر قائم رہتے لیکن دورے کی نوکری میں ترقی مل رہی تھی۔ انہوں نے سوچا دو ایک سال دورہ کرنے کے بعد کوئی بہتر جگہ مل جائے گی۔ چنانچہ دو سال کے لئے ہم سب سیالکوٹ جا رہے۔

دو سال کے بعد جب ہم لوٹے تو میں سیدھی سلمہ کے ہاں گئی۔ الگنی پر ہلکے رنگین چنے ہوئے دوپٹے لٹک رہے تھے۔ سامان بڑی ترتیب سے رکھا تھا۔ میزوں پر میز پوشس پڑے تھے۔ کھڑکیوں میں پردے لٹک رہے تھے۔ یہاں وہاں کرسیاں پڑی تھیں۔ باورچی خانے میں ماما چائے بنا رہی تھی۔ میں تو یہ سب دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ سمجھی شاید کوئی اور کرایہ دار آ بسے ہیں۔ سلمہ کا گھر تو دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ وہ عین اس وقت میری نظر اندر کمرے میں پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ سلمہ کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ چھیماں اور پیڈ پر لکھے اور پھر کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر۔ وہ تو کھڑکیاں کھولا ہی نہ کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی۔ توبہ کھڑکیاں کھلی ہوں تو وہ کیا کہیں گے لوگ کیا سمجھیں گے؟ اللہ نہ کرے میں کبھی کھڑکیاں کھول کر بیٹھوں۔ ہائے مجھے تو شرم آتی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اوہ تم ــــ اُس نے جلدی سے پیڈ بکس میں رکھا اور اُسے بند کر کے دوڑی دوڑی میری طرف آئی "اب تو ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہو"۔ اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور اتنا دابا کہ میرا دم رکنے لگا۔ اس پر مجھے اور بھی تعجب ہوا۔ کیونکہ پہلے تو وہ ایسی باتیں کہتے ہوئے شرمایا کرتی تھی۔ ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں۔ اس کا لہجہ تو ویسا ہی تھا۔ البتہ بات کرنے کا انداز۔ چال ڈھال بالکل بدل چکی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی جگہ اب وہ ایسی قمیص پہنے ہوئے تھی جو اس کے بدن پر خوب فٹ تھی۔ دوپٹہ تو سر پر ٹکتا ہی نہ تھا۔ اور بال بالکل نئے فیشن سے بنا رکھے تھے۔ بات بات پر مسکراتی اور چلتے پھرتے گنگناتی بھی۔ میں نے کہا "سلمہ وہ تمہاری نمازیں کیا ہوئیں۔" یہ سن کر وہ ہنس پڑی "شاید تمہاری آرزو بر آئی۔ اس لئے اب دعاؤں کی کیا ضرورت؟"۔ "شاید" اُس نے مسکرا کر ایک انداز سے کہا۔ میں نے اُسے جتانے کے لئے جاوید صاحب کے کمرے کی طرف اشارہ کیا؟ جواب میں اُس نے دانت نکال دیئے۔ اُف کس قدر نفرت اور زہر خند تھا اس کے خاموش اشارے میں۔ اتنے میں جاوید صاحب نے آواز دی "سلمہ۔ سلمے ــــ" "سلمے؟" اُن کا لہجہ پیار بھرا تھا۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر سلمہ بھی مسکرا دی لیکن اُس نے جاوید کو جواب نہ دیا۔ بھئی ہمیں بھی چائے مل جائے وہ چیخنے لگے "ابھی مل جاتی ہے"۔ سلمہ نے بے اعتنائی سے کہا اور پھر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے کہا "سلمہ وہ باہر جانے کے لئے چلا رہے ہیں۔" ہنس کر بولی "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے"۔ معاً مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی وہ یہی الفاظ کہا کرتی تھی۔ لیکن اُس کہنے اور اِس کہنے میں کس قدر فرق تھا۔ اُن دنوں یہی الفاظ اُس کے مُنہ سے سُن کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ ہار کر کہہ رہی ہو۔ نا امید ہو چکی ہو۔ اب اس کے انداز میں بے نیازی کی جھلک تھی۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی اور یوں معلوم ہوتا جیسے دور کسی افق میں کھو گئی ہو حتیٰ کہ میری موجودگی کا احساس تک نہ رہتا! اُسے یوں کھوئے ہوئے دیکھ کر میں اُٹھ بیٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ ملحقہ کمرے میں جاوید اور اُن کے دوست باتیں کر رہے تھے۔ سجاد صاحب نے ایک قہقہہ لگایا "بھئی ہاں۔ دیکھ تو" کسی صاحب نے کہا۔ "تمہارے ہاں چائے پینے میں جو مزا آتا ہے وہ کہیں اور نہیں

(باقی صفحہ ۹۶)

ہم ایک اصلاحی پروگرام لیکر میدان میں آئے تھے اور ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اپنے مقاصد سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ اگرچہ وہ وقت ابھی بہت دور ہے۔ جب ہمیں اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے لیکن کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ اب مُلک کا اہلِ نظر طبقہ ہماری کوششوں کو تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ذیل میں مکتبہ اُردو کی مطبوعات کی فہرست دی جاتی ہے۔ اس فہرست سے مکتبہ اُردو کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ لگا کر آپ محسوس کریں گے کہ ہماری ادبی خدمات کا سلسلہ نہایت دراز ہے اور مُلک کا شاید ہی کوئی نامور مصنّف ہوگا۔ جس کا تعاون ہمیں حاصل نہ ہو۔

مکتبہ اُردو ہندوستان کے نامور لکھنے والوں کی طرف دستِ تعاون بڑھاتا ہے۔

نظم

سیف و سبو:۔ شاعرِ انقلاب تعریف و تعارف سے بالا ہیں۔ اُن کے کلام میں وہ سچائی ہے جو اُن کے فلسفے کو اجاگر کر دیتی ہے۔ وہ ترجمہ ہے جس پر شعف نہیں ہوتا۔ جوش کی رندی کفر و الحاد کی حد تک ہے۔ لیکن اس کفر و الحاد میں نیک نفسی شامل ہے۔ وہ زندگی ہی کا سُر الاپتے ہیں اور حیات کی ہم آہنگی مجبوری میں سے باور کر کے متاثر ہوتے اور بیان کر دیتے ہیں۔ قیمت للعہ

حرف و حکایت:۔ حضرت جوش کی رندی، کفر و الحاد کی حد تک ہے لیکن اس کفر و الحاد میں نیکی و پاک نفسی شامل ہے۔ اُن کے مذہب کی روح ایک وفادار محبت اور احترام انسانیت کی آئینہ دار ہے۔ شاعرِ انقلاب اس کتاب میں اپنے رندانہ عروج پر کھڑا قہقہے لگا رہا ہے۔ قیمت للعہ

نقش و نگار:۔ شاعرِ انقلاب آپ کو اس میں ایک بسیط شاعرانہ انفرادیت کے ساتھ دکھائی دیں گے۔ انہوں نے حیاتِ انسانی کا پُر الم نغمہ ایسی دردناک آواز میں سُنایا ہے جس میں ایک مضطرب دل کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے۔ ساڑھے تین روپے

فکر و نشاط:۔ افضل سے افضل تر پیدا کرنا جوش کے نظریۂ ارتقا کا اہم مسلک ہے۔ فکر و نشاط میں اُن کی شاعری افضل ترین عروج پر پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جوش کا کلام غزلیہ و نشاطیہ ہو یا طنزیہ و المیہ، رندانہ و شاعرانہ ہو یا مصلحانہ و حکیمانہ، شروع سے آخر تک حرکت و حیات سے مملو دکھائی دیتا ہے۔ فکر و نشاط میں شاعرِ انقلاب کی یہ سب خصوصیات جمع ہوگئی ہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

آیات و نغمات:۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکارِ نو کا تازہ مجموعہ ہے اردو شاعری کے دو بڑا نقار کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آیات و نغمات میں شاعرِ انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اس کی روح کا عکس ہے۔ اس کے نغمات میں اپنے دل کی دھڑکنیں سُنیں۔ آپکے دل کے تار مدتوں مرتعش رہیں گے۔ مزین گرد پوش۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔

جنون و حکمت:۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی انقلابی، رومانی اور فلسفیانہ رباعیوں کا مجموعہ —— زندگی کے نازک ترین حقائق اور معارف کی ترجمانی۔ یہ مجموعہ جوش کی رندانہ سرمستیوں، باغیانہ سرتابیوں اور عارفانہ باریکیوں کا ایک لافانی اور دلچسپ امتزاج ہے۔ قیمت للعہ

نقشِ فریادی:۔ فیض احمد فیض اردو شاعری کے جدید اسکول کے بہت بڑے نقاد اور شارح ہیں۔ آپ الفاظ کے بیجان پیکر میں ایک بے چین

روح پیدا کر دیتے ہیں۔ نقش فریادی، سوز اور خلوص، تغزل اور سیاسی تفکر کا کامیاب امتزاج ہے۔ تیسرا اڈیشن مجلد بکلام کا حامل ہے قیمت عہ

ماورا :- (ن۔ م۔ راشد) اس مجموعے میں راشد کی مقفے نظمیں اور سانیٹ ہی شامل نہیں۔ بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو ایک لازوال شہرت بخش دی ہے۔ جدید اڈیشن میں راشد کی تازہ ترین نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ قیمت عہ

شعلۂ ساز :- فراق کی شاعری آفاقی تمدن اور عالمگیر انسانی فکر و تامل کا لہراتا ہوا آئینہ ہے۔ فراق کے اشعار میں وہ نازک، بلیغ اور پُرگداز آہنگ ہوتا ہے جس نے اُردو شاعری کو دنیا کے بہترین اور بلند ترین ادبی کارناموں کا ہم سطح اور ہمنوا کر دیا ہے۔ یہ لطافت و طہارت یہ چمک اور روشنی، یہ نرمیاں اور یہ رمزیت، یہ تفکر و وجدان اُردو شاعری کا ایک بیش بہا اور اہم سرمایہ ہے کتابی صورت میں فراق کے رشحات فکر کا یہ پہلا مجموعہ ہے قیمت عہ

آبگینے :- عبدالحمید عدم کے قطعات دنیا کی حسین ترین رومانی شاعری میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ عدم کی یہ دل افروز جذباتی شاعری اپنی جدت طرازی اچھوتے پن البیلے انداز اور مغربی اسلوب کے اعتبار سے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ نزاکتِ تخئیل، شدتِ احساس، صداقتِ جذبات، حسنِ بیان اثرانگیزی اور وجد آفرینی ان قطعات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ قیمت عہ

نغمۂ حرم :- (اختر شیرانی) جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر جگہ روشنی پھیل گئی۔ اسی طرح حضرت شیرانی کی دلآویز رومانی نظموں کے مجموعے کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ اختر شیرانی کا مجموعۂ کلام ہے اور رومانی نظموں کا یہ مجموعہ اپنی دلآویزیوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ قیمت عہ

جلوہ گاہ :- (مخمور جالندھری) پنجاب کے مشہور نوجوان ترقی پسند شعرا میں مخمور جالندھری ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پُرسوز کلام زندگی کی صحیح تفسیر ہے ہر شعر ظالم سماج کی ستم رانیوں پر ایک کاری ضرب ہے۔ مخمور ایک نئی راہ پر گامزن ہے جس میں کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی۔ قیمت عہ مجلد

میرا جی کے گیت :- جب زندگی کے شور و شغب سے آپ کی طبیعت گھبراتی ہے۔ جب آپ کے دل کی دھڑکن میں غیر معمولی لرزش پیدا ہوتی ہے جب آپ دکھ درد کے احساس کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ جب آپ کے کیف کو بڑھانا چاہتے ہیں تو خلوت کی تنہائیوں میں آپ بے اختیار گنگنانے لگتے ہیں۔ یہی کیفیتیں میرا جی پر بھی گزری ہیں۔ انہی لمحات کا اظہار ان گیتوں میں ہے۔ میرا جی کے پچاس گیتوں کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲ر

۴۱، ۴۲، ۴۳، ۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں :- آج کی شاعری کا مطالعہ ہر اعتبار سے اہم ہے۔ جس کے پیش نظر ہم نے اُردو کے ان بہترین اور جدید شعراء کے کلام کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ جن کے ہاتھوں میں آج کی شاعری کے ہر لحظہ بدلنے والے رجحانات کی باگ ڈور ہے۔ قیمت علی الترتیب۔ ۱۲ر۔ ۱۲ر۔ عہ۔ عہ

آہنگِ رزم :- ہندوستانی زبان میں رزمیہ نظموں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں خالص وطنی اور قومی نکتۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ وقار انبالوی کی ان نظموں سے جو ولولہ، جوش اور شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہندوستانی ادب میں ایک غیر فانی اور یادگار حیثیت سے قائم رہیگی۔ قیمت ۱۲ر

خوناب :- اختر انصاری کی جدید الاسلوب غزلوں کا مجموعہ، ہلکے ہلکے نرم نرم الفاظ و بیان کی حسین پھول مالا۔ تغزل جو روح شاعری کی جان ہے اختر انصاری کی ان غزلوں میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ قیمت عہ

وسعتیں :- جدید نوجوان شاعر سلام مچھلی شہری کا مجموعۂ کلام۔ سلام کی طبیعت میں ایک سوز و گداز ہے۔ وہ ایک حساس دل کے مالک ہیں۔ اُنکی شاعری میں ہلکے ہلکے تغزل کے ہمراہ ایک فنکارانہ جامعیت بھی ہے۔ تنوع اور انفرادیت اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ "وسعتیں" میں سلام کی بہترین اور منتخب نظمیں شامل کی گئی ہیں: قیمت عہ

فروزاں :- معین احسن جذبی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ دورِ حاضر کے شعرا میں جذبی منفرد رنگ کا مالک ہے۔ اس کے یہاں واقعہ کم اور واقعیت زیادہ ہے۔ واقعیت جس میں ضبط و توازن کے ساتھ ساتھ فنکارانہ رنگ آمیزی بھی ہے۔ اُس کی افسردگی میں ایک لوچ، اُس کے درد میں ایک سرشاری، اُس کے خاموش الم میں ایک نغمہ ہے جو محض غم پیدا کرنے کے بجائے غم کے تنقیہ کا کام کرتا ہے۔ قیمت عہ

زہرِ خندہ :- "یوسف ظفر" ---- اس عصر کے نوجوان شاعروں میں ہیں جس خاص انداز اور تعمیری صلاحیت کا ثبوت اُنہوں نے دیا ہے۔ اس سے بجا طور پر اُن کا مرتبہ بلند ہو چکا ہے۔ عشقیہ شاعری یوسف ظفر کے ہاں ضمنی طور پر ہے اور رومانیت عام زندگی کے غیر رومانی مگر پُرجذبات کا ایک دائمی عنصر ہے۔ قیمت عہ

بادۂ مشرق :- ساغر نظامی اپنی انقلابی، رومانی اور مترنم نظموں کے اعتبار سے جدید شاعری میں ایک امتیازی مرتبہ رکھتا ہے مشرقی طرزِ حیات کی عکاسی کرنے میں وہ ایک کامیاب فنکار ہے۔ رمز و تفکر، حسن و رومان، انقلاب و جدت کا رنگا رنگ امتزاج دیکھنا ہو تو ساغر نظامی کی لافانی تصنیف "بادۂ مشرق" پڑھیے داخلی خوبیوں کے ساتھ اس کے خارجی محاسن کے لئے مکتبہ اردو کا نام ہی ضمانت ہے۔ قیمت صہ

تلخیاں :- ساحر لدھیانوی کا مجموعہ کلام ---- "ساحر" نوجوان شعراء کے اُس گروہ کا ساتھی ہے۔ جس کی پشت پر ایک جامع اور آزمودہ نظریۂ حیات ہے ---- اُس کی بیشتر نظموں میں ایک ہلچل، ایک تحرک مگر مستقبل کا طے شدہ سکون کارفرما نظر آتا ہے ---- آرٹ اور انقلاب کا مکمل امتزاج جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی ---- (دوسرا ایڈیشن بہ ترمیم و اضافہ) قیمت عہ

پرتو :- جاں نثار اختر کی رومانی اور انقلابی شاعری کا مجموعہ ---- اختر کی شاعری جس شگفتگی اور شادابی کی مظہر ہے۔ اُس کی جستجو جوانی کے رنگین اور پُرآشوب لیکن صحت مند تصور ہی میں کی جا سکتی ہے حُسن و عشق کے اس صنم کدے میں جاندار مورتیاں ہیں کامیاب بھی اور ناکام بھی (زیرِ طبع)

جلال و جمال :- احمد ندیم قاسمی کی دو سو منتخب نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ---- "جلال و جمال" اُس نوجوان شاعر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کے نغموں میں رومان بھی ہے اور حقیقت بھی۔ انسان کی بے بسی کے نوحے بھی ہیں اور مشیت کی بے نیازیوں کے شکوے بھی۔ آہنگ بھی ہے اور اُمنگ بھی (زیرِ طبع)

زیرِ طبع

ساغر (ساغر نظامی) **رنگ محل** (ساغر نظامی) **سلسلہ** (مختلف شعرا) **آتشکدہ** (عبد الحمید عدم) **تاریک سیارہ** (اختر الایمان)
سارنگ (گیتوں کا مجموعہ) **تنگناء** (ذکر تونسوی)

افسانے

نئے زاویے :- جدید اسکول کے فسانہ نگاروں، شاعروں اور مقالہ نویسوں کے خیالات کا البم، اس مجموعے کی تیاری میں جدید مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والے مختلف اہلِ قلم حضرات نے حصہ لیا ہے۔ یہ کتاب اُردو کے بہترین اذہان کی پیداوار ہے۔ قیمت جلد اول (زیرِ طبع) جلد دوم چھ روپے

خونی :- یہ اختر انصاری کی تازہ ترین جدید الاسلوب کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کہانی زندگی اور سماج کا ایک حقائق افروز مطالعہ ہے جو تنقیدی نشتروں سے مملو ہوتے ہوئے بھی آرٹ کی لذت آفرینیوں سے بیگانہ نہیں۔ جذبات کی ترجمانی اور جزئیات کی مصوری، نفسیاتی تحلیل، زبان و بیان کی رعونت اور دوسری فنکارانہ خصوصیات ان کہانیوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مجلد مع دیدہ زیب ڈسٹ کور۔ قیمت عہ

ایک لڑکی :- خواجہ احمد عباس دُنیا کو اصلی رنگ میں دیکھنا اور دکھانا پسند کرتے ہیں۔ ایسی دُنیا جس میں انسان بستے ہیں۔ انسان جو اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ انسان جو باوجود "گنہگار" ہونے کے انسانیت سے بے بہرہ نہیں ہو جاتے۔ انسان جو صرف عشق و محبت ہی کے لئے زندہ نہیں رہتے بلکہ کھاتے اور کماتے، گاتے اور روتے بھی ہیں جو گر کر سنبھلتے ہیں اور گرتے ہوؤں کو تھام بھی لیتے ہیں۔ قیمت مجلد عہ

الاؤ :- قدرت کی تقسیمِ دولت غیر منصفانہ ہے۔ انسانی سماج دو قطبوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک قطب پر انسانی زندگی کی رنگینیاں اور سہولتیں جمع ہو جاتی ہیں اور دوسرے قطب میں زندگانی کی کُل پریشانیاں، غریبوں اور امیروں میں جو بُعد الطبیعتین ہے۔ اس کی واضح مثال آپ کو بہار کی سماجی زندگی میں ملے گی یا سُہیل کے اُن افسانوں میں جو اس زندگی سے متعلق ہیں (کرشن چندر) قیمت عہ

طلوع و غروب :- احمد ندیم قاسمی کی تازہ منتخب کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ نوجوان گڈریوں اور دہقانی دوشیزاؤں کی غم گزیدہ مسکراہٹوں، کھلے سانولے

سینوں میں جذبات کی حدت سے تپے ہوئے دلوں اور وسیع کھیتوں کی ہریاول کے پیچھے بھی آگ اور لہو کے سمندر دیکھنے والی دھندلی آنکھوں کے حسرتناک تجزیے دیکھئے ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۔ عہ

منٹو کے افسانے :- سعادت حسن منٹو کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے ۔ منٹو کی تحریر میں ایک زبردست چلبلا پھرت تڑپ پھڑک ہوتی ہے ۔ نگاہ گہری اور خیالات وسیع ہوتے ہیں ۔ قیمت چار روپے

منظر و پس منظر :- پروفیسر اختر اورینوی کے افسانوں کا یہ مجموعہ اُردو افسانہ نگاری کے اس عبوری دور میں ایک ادبی کارنامہ ہے جس کی قدر و قیمت ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے ۔ قیمت عہ

کلیاں اور کانٹے :- اختر اورینوی کے افسانوں کا یہ مجموعہ حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی لغزش اور استقامت، سفر اور قیام کی سچی فلمیں فنکارانہ قلمکاری کے ساتھ پیش کی گئی ہیں ۔ قیمت عہ

بگولے :- احمد ندیم قاسمی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں آپ کے اشعار اور مختصر افسانے اردو ادب کے اس دورِ جدید میں ایک معزز مقام حاصل کر چکے ہیں ۔ جو اُردو دان ان کے نام سے واقف نہیں ۔ اُن کی معلومات ناقص ہیں ۔ جو ادیب ان کی عظمت کا منکر ہے ۔ اس کا ادبی ذوق محلِ نظر ہے (ڈاکٹر تاثیر) بگولے میں افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ قیمت مجلد تین روپے ۔

ان کہی :- ممتاز مفتی کی سترہ کہانیوں کا مجموعہ، ان کہانیوں میں انسان کی اُن خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے جنہیں کوئی بھی زبان پر نہیں لاتا ۔ طبع انسانی کے ایسے بھنور آشکار کئے گئے ہیں جن کا پتہ سطح کے سکون پر نہیں ملتا ۔ قیمت عہ

زندگی کے موڑ پر :- کرشن چندر کے طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ، اردو ادب میں اپنی طرز کی پہلی تصنیف، طویل مختصر افسانہ، اگرچہ مغرب میں رواج پا چکا ہے ۔ لیکن اُردو میں تقریباً ایک بالکل نئی چیز ہے ۔ قیمت عہ

چٹان :- اوپندر ناتھ اشک کے گیارہ ترقی پسند افسانوں کا مجموعہ جس میں اشک نے بھوک اور نفس کا تجزیہ کرتے ہوئے نہایت بیدردی سے جماعتی تفاوت اور جنسی ناہمواری کا خاکہ کھینچا ہے ۔ قیمت عہ

طلسم خیال :- کرشن چندر فطرتاً رومانی واقع ہوئے ہیں ۔ ان کی محبت رومانیت کی خوشبو سے لبریز ہے ۔ لیکن انہوں نے واقعیت سے کہیں بھی گریز نہیں کیا حیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ موجودہ معاشرت پر طنز کے تیز تیز نشتر بھی، بیساختہ اور بے تکلف ظرافت بھی ہے ۔ قیمت ایک روپیہ ۱۲ ار

ٹوٹے ہوئے تارے :- کرشن چندر اُردو کے مقبول ترین، ہر دلعزیز افسانہ نگار ہیں ۔ ٹوٹے ہوئے تارے آپ کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے افسانہ نگاری کا معراج دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کریں ۔ قیمت عہ

باسی پھول :- شگفتہ پھول کسی نہ کسی وقت مرجھا جاتا ہے مگر علی عباس حسینی کے باسی پھول گلشن ادب کے وہ گلہائے خندہ ہیں جو کبھی بھی مرجھا نہیں سکتے اُردو کے تمام نقادوں نے ان افسانوں کو جدید افسانہ نگاری کا معراج قرار دیا ہے ۔ دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

رفیق تنہائی :- طبعزاد افسانہ لکھنے والوں میں علی عباس حسینی ایک خاص انداز کے مالک ہیں ۔ اسمیں آپکی بہترین کہانیاں شامل ہیں ۔ قیمت مجلد سے ر

گرہن :- راجندر سنگھ بیدی فن اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل ادیب ہے ۔ گرہن آپکے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے ۔ قیمت عہ

دانہ و دام :- بیدی حیات انسانی کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھتے ہیں جو کچھ محسوس کرتے ہیں ۔ اُس کو اس کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مصنف ہی کی شدتِ احساس کے ساتھ حقائق کا جائزہ لینے لگتا ہے ۔ دوسرا اڈیشن ۔ قیمت عہ

تین پیسے کی چھوکری :- قاضی عبدالغفار کے افسانوں میں مصنف کی مخصوص انشا کی رنگینیاں تیر رہی ہیں ۔ ہر فقرہ دل پر اثر کرتا ہے ۔ کہیں آنسو ہیں تو کہیں تبسم، کہیں طنز ہے تو کہیں درد، آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ الفاظ تیر و نشتر کی طرح دل میں اتر رہے ہیں ۔ قیمت عہ

رنگ و بُو:- پروفیسر ضیا انز محمود اُردو افسانہ نگاری کو حد کمال تک پہنچانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ یہ کچے افسانے صحیح ہندوستانی معاشرت کے تمام خدوخال کو بڑی وضاحت سے پیش کرتے ہیں (دوسرا ایڈیشن۔ زیر طبع)

کونپل (اوپندر ناتھ اشک) کونپل آپ کی بہترین منتخبہ معاشرتی اور سماجی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کا ہر ایک افسانہ فنی لحاظ سے مکمل اور موثر ہے عہ ۱۲ر

چاندی کے تار:- مہندر ناتھ کی کہانیاں، متوسط طبقہ کی خواہشوں، فریب کاریوں اور دشواریوں کو جھلا جھلا کر عریاں کرتی ہیں۔ اس کے افسانوں میں ساری کشمکش زندہ اور متحرک دکھائی دیتی ہے۔ وہ مشکلوں کو حل کرنا اور گتھیوں کو سلجھانا جانتے ہیں۔ عہ ۱۲

صحرانورد کے خطوط: میرزا ادیب، صحرانورد کے خطوط اردو کے غیر فانی شاہکار ہیں۔ اس کے اثرات صحرا کی طرح بسیط ہیں۔ ہر دمان الف لیلیٰ کی دلچسپیاں رکھتا ہے (تیسرا ایڈیشن، قیمت چار روپے

شبستانِ الم:- زبیدہ سلطانہ کے افسانوں نے دنیائے اُردو میں جو شہرت حاصل کی ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شبستانِ الم آپ کے جدید غیر مطبوعہ اور کامیاب افسانوں کا مجموعہ ہے (دوسرا ایڈیشن۔ زیر طبع)

عورتوں کے افسانے:- (کوثر چاندپوری) ہندوستان کی بے زبان عورتوں کے دکھ درد کو سمجھنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ ہر افسانہ خود ایک طویل داستان ہے۔ ان مظالم و مصائب کی جو سنگدل سماج کے ہاتھوں آئے دن عورتوں پر ہوا کرتے ہیں۔ قیمت عہ

چاند کا گناہ:- مترجمہ راجہ مہدی علی خاں ــــ دنیا کی اعلیٰ پایہ کی زبانوں کے تیس بہترین افسانوں کے تراجم ــــ اس میں کائنات کے ہر حصے کی انسانی زندگی کی فنکارانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ نہیں جام جمشید ہے۔ جس میں آپ کو اقوام عالم کے حساس کلیجے دھڑکتے ہوئے دکھائی دیںگے راجہ مہدی علی خاں نے اپنی تمام تر فنی خوبیوں کے ساتھ ان دھڑکنوں کی عکس ریزی کی ہے۔ قیمت تین روپے

دنیا کی حور:- (کوثر چاندپوری) یہ مفید اخلاقی کتاب جو خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بالکل ہمارے تمدن اور معاشرت کے مطابق ہے۔ طبیعت خودبخود الفاظ کا اثر قبول کر لیتی ہے۔ اگر گھروں میں اُجالا کرنا ہے تو آج ہی یہ مشعلِ ہدایت منگوالیجیے۔ عہ ۱۲ر

کرنیں:- شفیق الرحمن کی کہانیاں مکمل آپ بیتیاں ہیں جنہیں پڑھنے والے اُن کے کردار کے ساتھ سانس لیتے ہیں اور بعض اوقات اپنے آپ کو ان کہانیوں کے چلتے پھرتے کردار محسوس کرنے لگتے ہیں۔ قیمت مجلد عار

سرکش روحیں:- مصر کے مشہور مصنف جبران خلیل جبران نے ان افسانوں میں باغی دیوانہ سرکش روحوں کی سرکشی کا آتشیں انداز میں نقشہ کھینچا ہے جو سرکشی پر آجائیں تو طوفان کی طرح ہر چیز کو بہالے جاتی ہیں۔ ترجمہ جناب ابوالعلا چشتی (حاجی لق لق) نے کیا ہے۔ قیمت عہ

لق لق کے افسانے:- کیا آپ نے ابھی تک حاجی لق لق کے افسانے نہیں پڑھے؟ آج کل ہر شخص حاجی لق لق کے افسانوں کا دیوانہ ہے۔ کیونکہ حاجی لق لق اپنی مخصوص مزاح نگاری کا واحد مالک ہے اور اگر آپ ہنسنا چاہتے ہیں تو لق لق کے افسانے پڑھیے۔ قیمت عہ

پروازِ لق لق:- حاجی لق لق مزاح نویسی کی ایک خاص طرز کے موجد اور ہندوستان بھر میں اپنی قسم کے ایک ہی ظرافت نگار ہیں۔ پروازِ لق لق دل کو لبھانے اور روتوں کو ہنسانے والی بلند مزاح نویسی کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت عہ

ادبِ کثیف:- حاجی لق لق کا ادبِ کثیف اُس بے ربط اور غیر موزوں ادب لطیف کی دلچسپ اور رُوح پرور پیروڈی ہے۔ جو کہ آج کل کے نوجوان لکھتے ہیں۔ قیمت عہ

زندہ چین:- دنیائے ادب میں چینی ادب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جناب تمنائی نے جدید چین کے بہترین لکھنے والوں کی کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ عار

پھول اور کانٹے:- (گوپال متل) انسانی زندگی کے باغ میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ جب ہم کسی پھول کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو کیا ہم کانٹوں کے خوف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں؟ حالانکہ یہی کانٹے ہمیں زندگی کی اصل صورت دکھاتے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۸ر

پردہ سیمیں:- ڈاکٹر نصیر الدین کے افسانوں میں ایک بسیط انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے ادوار کی نبض پر ایک حکیم کی طرح اُنگلی رکھتے ہیں۔ ۳ے

جگا:- بلونت سنگھ کے افسانے اور ڈرامے نہ فقط آواز ہیں اور نہ فقط رنگ نہ ان میں خارجیت نمایاں ہے اور نہ مثنویت۔ ان کے افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ "جگا" آواز اور رنگ کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ مشرق و مغرب کے تصادم کا لطیف ماحصل ہے۔ ان آئینوں میں ہمیں اپنا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ قیمت ۱۲ عہ

جھمیلے:- بر ظاہری اطمینان کی تہ میں ایک جھمیلا چھپا بیٹھا ہے۔ "ان کہی" کے مصنف ممتاز مفتی کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ (زیر طبع)

بھنور:- شیر محمد اختر نے تجزیہ نفس کو اپنا محبوب موضوع بنا لیا ہے۔ بھنور کی سرگزشت اُس کے موضوع کی ایک اور تفسیر ہے۔ عہ

بھرے بازار میں:- حیات اللہ انصاری جدید افسانوی راہ پر سنگ میل کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے فن میں طنز کے ساتھ ساتھ ایک کائنات گیر محبت اور خلوص کارفرما رہتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کا نہایت تیز نگاہی سے جائزہ لیتے ہیں۔ "بھرے بازار میں" اُن کے ڈراموں، افسانوں، طنزیہ افسانوں، بچوں کے افسانوں اور طویل مختصر افسانوں پر مشتمل ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ ایسا گوناگوں مجموعہ اردو ادب میں آج تک پیش نہیں کیا گیا۔ قیمت تین روپے۔

درپن:- شکیلہ اختر کا بھی ایک درپن ہے۔ وہ اس میں سوسائٹی کے گھناؤنے خدا بوں کو نہایت چابکدستی سے اتار لیتی ہیں۔ درپن انکے شاہکار افسانوں کا مجموعہ ہے

ناگن کالی رات:- وقار انبالوی، دیہات کی عکاسی کرتے ہوئے ہمیں ایک نئی دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ کڑوے ماحول میں رومانس کے چشمے دیکھنے ہوں تو وقار انبالوی کے افسانوں کا یہ مجموعہ پڑھئے (زیر طبع)

پتھر کا دل:- مترجمہ سراج الدین احمد نظامی۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے سولہ بہترین اور لافانی افسانوں کا مجموعہ۔ دُنیا کے ہر خطے میں حسن و عشق کی لاتعداد داستانیں پوشیدہ ہیں۔ سولہ مختلف فنکاروں نے ان نہاں خانوں میں جا کر یہ اسرار و رموز کھولے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کے ہر طبقہ کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ شہنشاہ اور فقیر، حسن اور رومان کی صف میں ایک ساتھ کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ترجمہ شستہ، فنکارانہ اور جامع۔ قیمت دو روپے ۱۲ ار

اَن داتا:- کرشن چندر کے غیر مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ —— یہ چکا چوند کی روداد نہیں۔ گھُپ اندھیرے کی داستانیں ہیں۔ یہ رفعت و عروج کے قصے نہیں۔ ادبار و تیرگی کی کہانیاں ہیں۔ اس مجموعے میں اُس قوم کے افسانے ہیں جو اَن داتا کہلانے کے باوجود اپنے گرد و پیش فلنے اور بھوک کے سوا اور کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ نہیں جانتی کہ اُس کی گو دیاں گندم اور دھان سے اٹی پڑی ہیں۔ اس آغوش کو ایک نظر دیکھ لینے سے اُس کی زندگی بھی اوروں کی طرح سرسبز ہو سکتی ہے۔ اَن داتا میں گندم اور دھان کے مرقعے نہیں۔ اس کے نیچے دبی ہوئی بھوک کے تجزئے ہیں اور انہیں پیش کرنے والا کرشن چندر ہے جس کی نگاہ ہمہ گیر ہے۔ قیمت عہ

میلہ گھومنی:- علی عباس حسینی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ —— علی عباس حسینی، جدید اور قدیم افسانوی شاہراہوں کا نقطۂ اتصال ہیں۔ وہ رومانوی ادوار کی معاشی، سیاسی زندگی کو اپنے ترقی پذیر فن کے سانچے میں ڈھال کر نمائندہ حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ میلہ گھومنی اُن کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں وہ اپنے افسانوی معراج پر دکھائی دیتے ہیں۔ (زیر طبع)

ہائے اللہ:- سات پردوں میں ڈھکی چھپی ہندوستانی عورت کی طرف جب ہمدردی کا ہاتھ بڑھا تو وہ چیخ اُٹھی ...... ہائے اللہ! مجھے مت چھونا۔ میری رگ رگ پھوڑے کی طرح دکھتی ہے" —— ہاجرہ مسرور نے اسی بنیادی حقیقت پر اپنے افسانوں کی بے جھجک تعمیر کی ہے۔ اس کے افسانوں میں کھوکھلے رومان کی پناہ گاہیں نہیں۔ جہاں فراری ذہنیتیں اپنا مُنہ چھپا سکیں۔ بلکہ اس کے ہاں حقیقتیں اپنے بھیانک روپ میں نمودار ہو کر پڑھنے والوں کو چونکا دیتی ہیں —— "ہاجرہ مسرور ہمارے فن ادب پر شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئی ہیں ......" (ادبی دنیا) زیر طبع

ایک بات :- عصمت چغتائی کے جدید افسانوں کا مجموعہ۔ عصمت نے بیباک اسلوب اور اچھوتی فنکاری سے ادب میں ہنگامہ خیزیاں پیدا کر دی ہیں۔ ایسے ہنگامے جو ایک جاندار ادب کا سنگ بنیاد ہیں ـــــ زندگی کے لطیف حصوں کی فصد کھولنے میں عصمت کی نگاہ تیکھے نشتر کا سا کام کرتی ہے۔ "ایک بات" میں لاکھوں تیکھی تیکھی باتیں کہی گئی ہیں۔ (زیر طبع)

زیر طبع

پت جھڑ (احمد ندیم قاسمی) **بدتمیز** (سعادت حسن منٹو) **زندگی کا میلہ** (اختر حسین رائے پوری) **جدید، جدید تر** (دھرم پرکاش آنند)

ناول

ٹیڑھی لکیر :- اردو افسانہ کے عروج میں عصمت چغتائی کی حقیقت نگاری اور بیباک نگاہی کا بہت بڑا حصہ ہے اور اب وہ اپنی تمام فنکارانہ قوتوں کو پوری شدت اور نفاست سے کام میں لاتے ہوئے اردو ناول کے پرانے اور گہرے خلا کو پُر کرے گی۔ اس ناول کا نام "ٹیڑھی لکیر" ہے یہ ناول سارے ہندوستان کا سرمایہ ہے۔ ہندوستان کی ادبی برتری کا ثبوت ہے۔ ہندوستانی زندگی کے ہر رُخ ہر پہلو اور ہر رنگ کا نہایت پُرخلوص صاف اور روشن جائزہ ہے۔ اردو ناول کے لق و دق صحرا میں "ٹیڑھی لکیر" ایک نخلستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ تعلیم نسواں، تہذیب فرنگ، قحط، جنگ اور ادبی زرگری، جنسی الجھنوں، غرض موجودہ دور کے ہر ضروری موضوع پر ایک مبسوط تبصرہ ہے اور عصمت کی زبان اور بیان کا ایک معجزہ۔ (چھپ رہی ہے)

لندن کی ایک رات :- سجاد ظہیر۔ اس میں لندن کی مخصوص معاشرت و تمدن کا نقشہ اس خوبصورتی کے ساتھ کھینچا گیا ہے کہ آپ کتاب پڑھتے ہی محسوس کریں گے کہ گویا لندن میں بیٹھے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا اڈیشن۔ قیمت عہ

جزیرہ سخنوراں :- (ایک ناولٹ) حسن و عشق کی رنگین کیفیتیں۔ رشک و رقابت کے بوقلموں جذبات۔ اردو شعر و ادب میں ایک طرفہ کتاب۔ قیمت عہ

پریم کا جادو :- چار طویل داستانوں کا مجموعہ۔ مترجمہ سر اجدین احمد نظامی۔ آپ ان داستانوں کو پڑھتے جائیں۔ آپکی نگاہوں کے سامنے ہندوستان کا عہد ماضی اپنے تمام حیرت انگیز مناظر کے ساتھ پھرنے لگے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ عشق کے آہنی چنگل میں بے تقدیر اور جیں موت کے غار میں اتر رہی ہیں۔ (دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

غزالہ :- شہرۂ آفاق روسی ناول نگار آئی وان ٹرجینو کے ایک مختصر افسانوی شاہکار کا ترجمہ از محمد جمیل احمد ایم۔ اے۔ قیمت ۱۲

جنت و جہنم :- کرشن چندر کا مشہور ناول جس کے کئی ایک باب مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اس میں جنت کم ہے اور جہنم زیادہ (زیر طبع)

کارواں :- اختر اورینوی کا جدید طرز کا ناول (زیر طبع)

زیر طبع

بغیر عنوان کے (سعادت حسن منٹو) **اندھیرا** (اختر حسین رائے پوری) **گرتی دیواریں** (اوپندر ناتھ اشک) **پرچم** (خواجہ احمد عباس) **گدھا** (کرشن چندر) **مریض** (راجندر سنگھ بیدی)

ڈرامے

منٹو کے ڈرامے :- سعادت حسن منٹو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں لاثانی ہے۔ منٹو کے افسانے کے بعد منٹو کے ڈرامے پندرہ طویل ڈراموں کا مجموعہ۔ ؎

پاپی :- اوپندر ناتھ اشک کے ڈرامے زندگی کا مرقع ہوتے ہیں اور پھر ہماری معاشرتی کمزوریوں کو اس طرح بے نقاب کرتے ہیں کہ انہیں پڑھکر ہم اپنے گرد و پیش کی حالت دیکھنے اور اس پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس مجموعے میں اشک کے بہترین حزنیہ، المیہ، طربیہ اور مزاحیہ ڈرامے شامل ہیں۔ (زیر طبع)

آؤ :- ننھے نے ریڈیو سیٹ کا بٹن گھمایا اور کہا "آؤ" بوڑھے باپ نے بھی لمبی داڑھی ہلائی اور مسکرا دیا۔ آپ بھی تو ..... منٹو کے ڈرامے سن کر مسکرا دیتے ہیں۔ آؤ! ـــــ سعادت حسن منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے جس کا نفسِ مضمون ہماری گھریلو زندگی پر ایک لطیف طنز ہے۔ قیمت ۸

تین عورتیں :- صرف ایک عورت دُنیا ایسے بڑے فتنے کا موجب ہوئی۔ لیکن سعادت حسن منٹو کی یہ تین عورتیں ——؟ ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ تین موٹی، خاموش اور بیمار پرس عورتوں کے دلچسپ حالات پانچ ڈراموں کی شکل ہیں۔ قیمت عہ

انسان کی زندگی :- انسان جب زندگی کے تند دھارے میں بہتا ہے تو . . . تو ——تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ڈرامہ انہی حجابوں کو تار تار کرتا ہے۔ عہ

چرواہے :- صحراؤں اور سبزہ زاروں کے ماحول نے گوالوں اور چرواہوں کو ایسی باتیں سجھائیں۔ جن کے اظہار سے وہ پیغمبر بن گئے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اپنے ڈراموں کے تازہ مجموعے "چرواہے" میں انسانی ذہن کے صحراؤں اور سبزہ زاروں کے ماحول سے ان باتوں کو اجاگر کیا ہے جو تحت الشعور کے پاتال میں جنم لیتی ہیں اور جن کی صورت گری وہی جادوگر کر سکتا ہے۔ جسے تحت الشعور کی بھول بھلیاں کے منتر یاد ہوں۔ جن پڑھنے والوں نے اشک کے ڈراموں کا پہلا نمونہ "پاپی" دیکھا ہے۔ انہیں یہ کتاب مصنف کی ذہانت کے ایک نئے پہلو سے روشناس کرائے گی۔ قیمت عمر

شیطان :- اقبال کے ابلیس نے خدا کے جبریل سے سوال کیا۔ "قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟" —— جبریل خاموش رہا۔ عصمت شاہد لطیف کا "شیطان" خدا کے بنائے ہوئے انسانوں سے چند سوال کرتا ہے —— کیا وہ بھی جبریل کی طرح خاموش رہیں گے —— عصمت شاہد لطیف کے تازہ ترین ڈراموں کا مجموعہ جو شیطان کے نام سے انسانوں کے مطالعے کیلئے پیش کیا جاتا ہے۔ (زیر طبع)

زیر طبع

پیکار (اگالز وردی) **اچھا اور بُرا** (مہندر ناتھ) **شکست کے بعد** (کرشن چندر) **رخشندہ** (راجندر سنگھ بیدی)

سیاسیات و اجتماعیات

کمپنی کی حکومت :- از باری۔ یہ کتاب انگریزوں کی پُر فریب سیاست خداعی، ان کے وحشیانہ مظالم، حرص و طمع اور شرافت انسانی سے عاری اخلاق کی بے نقاب تصویر ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے میں انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے اُس کی مثال چنگیز و ہلاکو کی تاریخ میں بھی مشکل سے ملتی ہے (معارف) جدید ایڈیشن میں سو صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت چار روپے

سیرت امام ابن تیمیہ :- تقی الدین ابو العباس احمد ابن تیمیہ کی داستانِ حیات، آپکی ساری زندگی جیلوں اور تکلیفوں میں کیوں گذری۔ آپکے کارہائے نمایاں کو سال ہا سال کی محنت کے بعد ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے مرتب کیا ہے۔ ملک کے بہترین نقادوں نے کتاب کو بیحد سراہا ہے۔ قیمت عہ

آزادی کی راہیں :- (برٹرینڈ رسل) تحریکِ آزادی کی داستان بہت پُرانی داستان ہے۔ اس کتاب میں مغربی مفکر برٹرینڈ رسل نے ان تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی گود میں آزادی پلی ہے۔ ترجمہ نہایت شستہ۔ قیمت عہ

پاکستان اور اچھوت :- (انگریزی) چودھری افضل حق صاحب کی یہ کتاب ہندو مسلم تعلقات کو ایک اچھوتے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ یہ تحریر ہندوستان سے دُور بیٹھے کسی مبصر کا بیان نہیں بلکہ اس شخص کے خیالات ہیں جس کی تمام عمر ملکِ عزیز کی خاطر تکلیفوں میں گزری۔ جدید ایڈیشن عہ، ایڈیشن اردو عہ

مقالات ابو الکلام :- (انگریزی) آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے مولانا ابو الکلام آزاد پر بڑے بڑے لیڈروں اور ادیبوں سے مضامین لکھوا کر جمع کئے ہیں۔ ان مضامین کے پڑھنے سے مولانا کی شخصیت کی عظمت نمایاں طور پر اُبھر آتی ہے۔ اس حصہ کے مضمون نگاروں میں جواہر لعل نہرو، راجگوپال اچاریہ، مسز اسینے، جان گنتھر، جادیوڈ یسائی، یوسف مہر علی، مسٹر آصف علی اور سلیمان ندوی شامل ہیں۔ قیمت عہ

تاریخ عالم :- باری بربریت تک کے طوفانی سفر کی داستان کو تاریخ عالم میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ انسان نے جنگ و جدل اور ستورِ حکومت، فلسفہ، سائنس اور لٹریچر میں جو کچھ کیا۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ماضی اور مستقبل کا انسان، پہلی جلد ہوم ابی سے اسکندری فتوحات تک۔ (زیر طبع)